page missing book only

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222933

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—67—11-1-68—5,000.

**OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY**

Call No. ۸۹۱۵ ع ۳۰۵ Accession No. U 964

Author ھمایوں

Title ھمایوں سالگرہ نمبر جلد ۲۵ ۱۹۳۴ء

This book should be returned on or before the date last marked below.

سالگرہ نمبر ۱۹۳۶ء

بیادگارِ علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

# ہمایوں

Checked 1978

ایڈیٹر بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن)
بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر حامد علی خاں

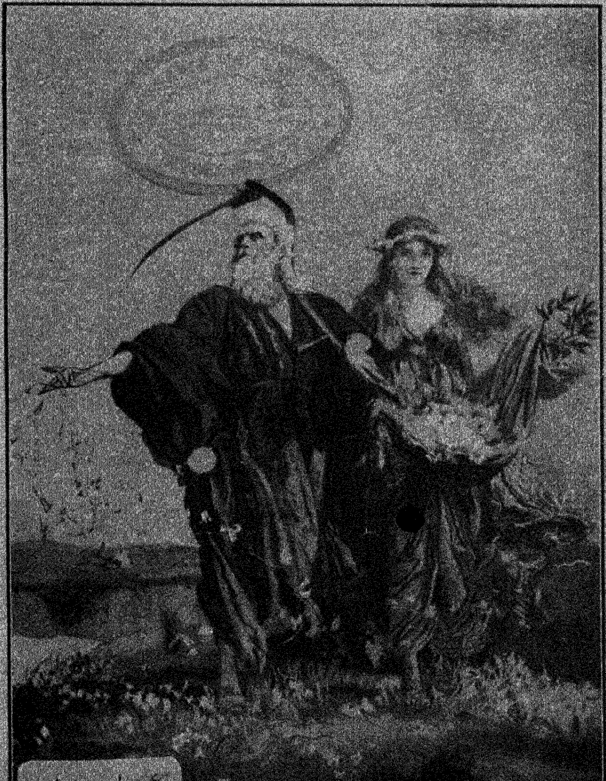

علم اور زمانہ

جلد ۲۵

نمبر ۱

# فہرست مضامین "ہمایوں" بابت ماہ جنوری ۱۹۳۴ء

## تصاویر

- تھیوڈور ڈریزر
- خزاں کے پیچھے بہار
- برٹرینڈ رسل
- آئن شٹائن
- مالابکا خواب حسن
- ہمنوائی
- اجنبی
- سنہری مسجد دہلی بازار لاہور
- تصویر کا فرار
- قلعہ لاہور
- شالامار باغ لاہور
- فنکاری
- پرواز
- نپولین میدان جنگ میں
- مس ایمی جانسن

| شمار | مضمون | صاحب مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | جذبات ہمایوں (نظم) | آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم | ۳ |
| ۲ | جہاں نما | بشیر احمد | ۴ |
| ۳ | بزم "ہمایوں" | | ۹ |
| ۴ | بہار (نظم) | حامد علی خاں | ۱۰ |
| ۵ | زندہ فلسفے | بشیر احمد | ۱۲ |
| ۶ | نازکی نیاز مندی (نظم) | حضرت جوش ملیح آبادی | ۳۴ |
| ۷ | بلبلہ ہے پانی کا | خان بہادر جناب میاں عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے کمشنر انبالہ | ۳۶ |
| ۸ | یاد (نظم) | حامد علی خاں | ۳۸ |
| ۹ | رباعیات | "ندیم" | ۴۰ |
| ۱۰ | قلوپطرہ | حضرت منصور احمد مدیر "ادبی دنیا" | ۴۱ |
| ۱۱ | حدیث محبت (نظم) | حضرت مولانا حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری | ۴۵ |
| ۱۲ | ادبی تنقید | جناب پروفیسر ظفر الاحسن صاحب ایم۔ اے پی۔ ای۔ ایس | ۴۷ |
| ۱۳ | ہولے ہولے (نظم) | جناب سید مقبول حسین صاحب مقبول بی۔ اے | ۵۶ |
| ۱۴ | محبت اور زمانہ (ڈراما) | جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب گیلانی ایم اے | ۵۸ |
| ۱۵ | دل می رود ز دستم (غزل) | حضرت جوش ملیح آبادی | ۷۰ |
| ۱۶ | بتانِ پشاور | جناب مرزا فہیم بیگ صاحب فہیم چغتائی گوالیاری | ۷۲ |
| ۱۷ | روح جذبات (غزل) | حضرت اصغر گونڈوی مدیر "ہندوستانی" | ۷۹ |

چندہ سالانہ ۵ر ششماہی ۳ر (مع محصول)

قیمت سالگرہ نمبر ایک روپیہ

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۹ | کیا اب بھی نہ آؤ گے (نظم) | جنابِ وقار انبالوی | ۸۰ |
| ۱۹ | پھول | نواب سر راس مسعود بہادر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ | ۸۲ |
| ۲۰ | غمخوارِ شیمن (افسانہ) | جناب میجر عطاء الرحمٰن صاحب بی اے پرائیویٹ سیکرٹری نواب صاحب رامپور | ۸۳ |
| ۲۱ | مایا (نظمیں) | جناب سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی | ۱۰۶ |
| ۲۲ | میرے بچے | محترمہ بشیر احمد بیگم صاحبہ | ۱۰۸ |
| ۲۳ | ہیچ میرزی (نظم) | محترمہ ح ب صاحبہ | ۱۰۹ |
| ۲۴ | ہٹلر | جناب ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم۔ اے | ۱۱۰ |
| ۲۵ | عیشِ شبانہ (نظم) | جناب سید عبدالحمید صاحب عدمؔ | ۱۱۶ |
| ۲۶ | کسان (افسانہ) | جناب مہدی علی خاں صاحب | ۱۱۷ |
| ۲۷ | شہریارِ صحرا (نظم) | جناب سید علی منظور صاحب حیدرآبادی | ۱۲۳ |
| ۲۸ | دکن میں آریاؤں کا داخلہ | جناب مولوی محمد حسین صاحب ادیب ایم۔ اے۔ بی۔ ای ڈی | ۱۲۵ |
| ۲۹ | راحت کدہ (نظم) | جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم۔ اے | ۱۳۲ |
| ۳۰ | حسنِ نسوانی کا ایک ادبی مصوّر | حامد علی خاں | ۱۳۳ |
| ۳۱ | لاہور (نظم) | حضرت روش صدیقی مدیر "لالۂ صحرا" | ۱۳۶ |
| ۳۲ | سودھا (افسانہ) | حضرت محشر عابدی بی۔ اے | ۱۳۷ |
| ۳۳ | شیطان اور شراب (افسانہ) | جناب سعادت حسن صاحب | ۱۴۰ |
| ۳۴ | رباعیات | بشیر احمد | ۱۴۳ |
| ۳۵ | تیر و نشتر (غزل) | حضرتِ نشتر جالندھری | ۱۴۴ |
| ۳۶ | ترکِ وفا کی قسمیں (غزل) | حضرتِ صدق جائسی | ۱۴۵ |
| ۳۷ | غزل | "ندیم" | ۱۴۶ |
| ۳۸ | غزل | حامد علی خاں | ۱۴۷ |
| ۳۹ | محفلِ ادب | | ۱۴۸ |
| ۴۰ | مطبوعات | | ۱۵۱ |
| ۴۱ | تصاویر | | ۱۵۲ |

HYDERABAD-1

# خریدارانِ "ہمایوں" کو مژدہ

## طلسمِ زندگی کی قیمت میں ایک مہینے کیلئے عظیم الشان رعایت

"ہمایوں" کی بارھویں سالگرہ کی مسرت انگیز تقریب پر ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ "ہمایوں" کے موجودہ قدیم و جدید خریداروں کو میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" کی مشہور کتاب "طلسمِ زندگی" کی کچھ جلدیں

### پانچ روپے کے بجائے تین روپے (علاوہ محصول)

میں دی جائیں۔ یہ عایت صرف اُن خریداروں سے ملحوظ رکھی جائے گی جو ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء تک اپنی فرمائشیں بھیج دیں گے۔ خریدارِ "ہمایوں" ہونے کی تصدیق کے لئے فرمائش کے ساتھ "ہمایوں" کا خریداری نمبر لکھنا ضروری ہے کیونکہ جو اصحاب "ہمایوں" کے خریدار نہیں اُن سے قیمت حسبِ معمول پانچ روپے علاوہ محصول ہی لی جائے گی۔ اگر آپ خریدار نہیں تو اس عایت سے فائدہ اٹھانے کے لئے

### آج ہی "ہمایوں" کے خریدار بن جائیے۔

سالانہ چندے میں سالگرہ نمبر بھی ملے گا جس کی الگ قیمت عہ ہے۔ چونکہ رعایتی قیمت کے لئے "طلسمِ زندگی" کی جلدوں کی محدود تعداد ہی منظور ہوئی ہے اس لئے اگر مقررہ تعداد ۳۱ جنوری سنہ ۱۹۳۴ء سے پہلے ہی فروخت ہوگئی تو ہم بعد کی فرمائشوں کی تعمیل سے قاصر رہیں گے۔ دیر کرنے سے ممکن ہے موقع ہاتھ سے نکل جائے اس لئے آپ

### آج ہی فرمائش بھیج دیجئے

"طلسمِ زندگی" اپنے ظاہری و معنوی محاسن کے اعتبار سے عہدِ حاضر کی ایک یادگار تصنیف ہے بعض اخبارات، ادبا اور اکابر کی آرا کے مختصر اقتباس دوسرے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔ مفصل آرا اور کتاب کے کاغذ و طباعت اور تصاویر کے نمونے کا پمفلٹ ایک آنے کے ٹکٹ بھیجنے پر مل سکتا ہے۔

**سید عبد اللطیف مینیجر "ہمایوں" ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور**

# طلسمِ زندگی کے متعلق اخبارات و اکابر کی آرا

**"زمیندار" لاہور**۔ اردو زبان میں اس اہتمام سے شاید ہی کوئی ادبی کتاب شائع ہوئی ہو۔

**"مدینہ" بجنور**۔ اس کتاب کو یورپ کی حسین ترین کتاب کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

**"سیاست" لاہور**۔ "طلسم زندگی" صوری و معنوی لحاظ سے عدیم النظیر ہے

**"بندے ماترم" لاہور**۔ اس سے قبل ہماری نظر سے ایسی خوبصورت کتاب نہیں گزری۔

**"نگار" بھوپال**۔ اس کی قیمت پانچ روپیہ مسلمانوں کی اقتصادی پستی کے لحاظ سے ممکن ہے زیادہ ہو لیکن دلِ پُر شوق "رونمائی" میں اس سے زیادہ قربانیاں کر سکتا ہے

**عصمت دہلی**۔ طلسم زندگی ادبی مضامین کا ایسا مجموعہ ہے جسے لڑکیاں بھی پڑھ سکتی ہیں۔

**ایسٹرن ٹائمز لاہور**۔ طلسم زندگی بلاشبہ اُن کتابوں میں سے ہے جو انسان کی دلی رفیق سمجھی جا سکتی ہیں۔

**آنریبل جسٹس سر عبدالقادر جج ہائی کورٹ لاہور**۔ "طلسم زندگی" ظاہری اہتمام کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، اور بہ لحاظ مضامین نہایت دلاویز ہے۔

**علامہ عبداللہ یوسف علی او۔ بی۔ ای۔ آئی۔ سی۔ ایس (ریٹائرڈ)**۔ اردو کا کوئی ایسا زندہ انشا پرداز میرے علم میں نہیں جس کا قلم ادب کے اس قدر بوقلموں راستوں پر اس روانی، صفائی اور نزاکت سے چلتا ہو۔

**مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری حیدر آباد (دکن)**۔ ایسی کتاب صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کو اردو ادب کے علاوہ انگریزی ادب پر بھی کامل عبور ہو۔

**مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل چیف کورٹ مارواڑ**۔ عمر میں پہلی مرتبہ میں نے اردو میں ادب لطیف دیکھا۔ آج میں نے اردو میں کامیاب ترین چیز دیکھی ہے۔

**سر تیج بہادر سپرو۔ بیرسٹر ایٹ لاء الہ آباد**۔ طلسم زندگی کے مطالعہ سے نہایت لطف حاصل ہوا۔ واقعی خدا نے آپ کے تخیل کو وسعت عطا کی ہے اور زبان پر قدرت۔ آپ کے مضامین قابل قدر ہیں۔

**خان بہادر مولانا سید رضا علی وحشت (کلکتہ)**۔ اس کتاب نے مجھے ایسا محو بنایا جیسا کہ اس سے پہلے کسی اور کتاب نے نہیں بنایا تھا۔

**سید سجاد حیدر صاحب یلدرم ڈپٹی کلکٹر**۔ کتاب کی طباعت و آرائش جس قدر دیدہ زیب ہے، اُس سے زیادہ اُس کے مضامین دلفریب ہیں۔

**سید مقبول حسین صاحب مقبول بی۔ اے احمد پوری**۔ اس کتاب کی وہ قوت جو اس کے لئے بقائے دوام کا باعث ہوگی دراصل اس کا پیام ہے جو نا امیدی سے اُمید اور اُمید سے جذبۂ عمل کو اکساتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

**مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سیکرٹری انجمن ترقی اردو و پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن**۔ آپ کی کتاب "طلسم زندگی" وصول ہوئی اس کا حسن و خوبی دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔

**خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب کمشنر انبالہ**۔ کتابوں کتابوں میں اگر عشق ہوتا ہو تو میری الماری کی تمام کتابیں اس کتاب کی پیاری سی صورت پر جان دے دیتیں۔

**مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ)**۔ بلاشبہ یہ کتاب ظاہری اور معنوی خوبیوں کا بے نظیر مجموعہ ہے اور ہر لحاظ سے اردو ادبیات کے لئے باعث افتخار ہے۔

**جناب شوکت تھانوی ایڈیٹر سرپنچ لکھنؤ**۔ یہ کتاب یقیناً ہندوستان کی ایک یادگار تصنیف ہے اور اردو لٹریچر کی ایک تاریخی کڑی۔

**میر سعادت حسین صاحب نجیب ہمکنڈہ حیدر آباد (دکن)**۔ کتاب کو دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی اور جی باغ باغ ہو گیا۔

# جذباتِ ہمایوں

ظالم ہی سنگدل ہی یہ تہذیب جس کو آج　　تم سمجھے خاص رحمتِ پروردگار ہو
چاندی کا اس کا جسم ہی سونے کا اس کا دل!　　اس تاک میں نگہ کہ گھر کا شکار ہو
کانوں پر اس کی آنکھ۔ فلزّات پر نظر　　دھن ہی یہی کہ بھاپ ہو۔ بجلی ہو۔ تار ہو
لیکن کہیں جو قسمتِ بد سے ہی سہی　　اگلے زمانے کی کوئی اک یادگار ہو
ہوتی نہیں ہی بھول کے بھی اُس طرف نگاہ　　پھر جائے گر مفاد کا کچھ اعتبار ہو

* * *

بے تاب کیوں ہی سُن کے ہمایوں یہ داستاں　　جنت میں آکے کیوں کوئی یوں اشکبار ہو؟
منظر نہیں۔ یہ شانِ خدا کا ظہور ہے
پانی کو چوم۔ کوہ سے لے۔! ہمکنار ہو

# جہاں نُما

۱۹۳۲ء معاشی و سیاسی لحاظ سے ایک مایوس کن سال تھا، اسی لئے ۱۹۳۳ء سے دنیا کو بڑی اُمیدیں تھیں۔

عالمگیر معاشی کانفرنس مدعو کی گئی تھی، ایک مُدت سے دُنیا کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی، سوائے رُوس کے سب قومیں اور سب لوگ اپنی عُسرت پر نالاں تھے، جنگ عالمگیر کے دس سال بعد دُنیا کی حالت دَورانِ جنگ یا بعد از جنگ کی حالت سے زیادہ خوفناک تھی اور سال بسال زیادہ خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ اب خیال تھا کہ معاشی کانفرنس کا معالج آ کر اس خوفناک مرض کے ازالے کے لئے ایک خاطر خواہ نسخہ تجویز کریگا اور دُنیا بھر میں پھر خُوش حالی کا دَور دورہ ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ ایک عالمگیر سیاسی کانفرنس نہ صرف تخفیفِ اسلحہ کے لئے بلکہ اس غرض کے لئے مدعُو کی گئی تھی کہ دُنیا اور بالخصُوص یورپ کے حربی و سیاسی معموں کو حل کرے اور امن کے ایک ایسے زمانے کی ابتدا کرے جس میں دِن رات جنگی رقابتوں کی بجائے تمدّنی ترقّیوں کا چرچا ہو۔

لیکن بدقسمتی سے یہ دونوں اُمیدیں مہذّب قوموں کی کوتاہ اندیشی اور خود غرضی کے باعث خاک میں مِل کر رہ گئیں۔ نہ دُنیا نے معاشی دَلدل سے رہائی پائی نہ وہ سیاسی تاریکی سے باہر نکلی۔

سال کے ابتدائی حِصّے میں عام معاشی حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دُنیا کی مجموعی تجارت کم ہوتے ہوتے پیشتر کی نسبت صرف ایک تہائی رہ گئی، بہت سے مُلک طلائی معیار کو پہلے ہی ترک کر چُکے تھے، شرحِ مُبادلہ پر پابندیاں عائد ہو چُکی تھیں، مُلک مُلک میں بیرونی مال کے خلاف محاصل کی رُکاوٹیں پیدا کی جا چکی تھیں، سونے کے ذخیرے کا بیشتر حصّہ صرف دو مُلکوں ممالک متحدہ اور فرانس کے قبضے میں تھا اور کُل دُنیا میں بے روزگاروں کی تعداد کم از کم تین کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ اس حالت میں معاشی کانفرنس کو جن دقیق مسائل کی گتھّی کو سُلجھانا تھا اُن میں سب سے اہم بین الاقوامی معاشی اور مالی نظامات کی اصلاح اور قرضہ ہائے جنگ کے قضیے کا طے کرنا تھا۔ معاشی نظام کی باقاعدہ تنظیم کا رستہ روس نے دِکھا دیا تھا۔ مالی نظام کے تحت میں محاصل، معیارِ طلا، شرحِ مبادلہ، بین الاقوامی بنک و جنسی قیمتوں کے مسائل درپیش تھے۔ اور جنگی قرضوں کی بے باقی کی ایک ہی سیدھی سادی شکل تھی کہ اُنہیں بلا تامل قطعاً منسوخ کر دیا جائے۔ سال کے وسط میں برطانوی وزیرِ اعظم ریمزے میکڈانلڈ اور نئے امریکی جمہوری صدر رُوزولٹ نے ایک مشترک بیان معاشی اصلاحات کے متعلق شائع کیا۔ جولائی میں لندن میں عالمگیر معاشی کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا اور شروع ہوتے ہی اُس میں مشکلات کے ساتھ مناقشات کا اضافہ ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ عالمگیر کانفرنس ایک ماہ کے اندر اندر بغیر کچھ سر انجام دیئے ملتوی ہو کر رہ گئی۔

حربی کانفرنس میں اس سے پہلے ہی مصالحت کا جنازہ نکل چُکا تھا۔ اپریل میں باہمی اختلافات شروع ہوئے، اگست میں سُنا کہ اکتوبر تک التوا ہو گیا۔

اکتوبر میں جرمنی باقاعدہ طور پر اجلاس سے دست کش ہو گیا جس کے باعث پھر ایک لمبے التوا کا اعلان کرنا پڑا۔ یہ تھی اس مشہور بین الاقوامی کانفرنس کی ابتدا اور یوں اس کی انتہا ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ شرکا نے منتشر ہونے سے پہلے اپنی لمبی چوڑی تقریروں تحریروں سے دُنیا کو یقین دلایا کہ ہم نے بین الاقوامی روش کو اپنی جاروب کشی کے ذریعے سے بہت سے تنکوں کانٹوں سے پاک و صاف کر دیا ہے اور اب حالت خاصی تسلی بخش ہے اور انگلستان کے وزرا نے بھی واضح کر دیا کہ انگلستان کسی طرح مایوس نہیں ہؤا بلکہ ہر حال میں یورپی قوموں کی صلح صفائی کے کام میں بیش از پیش مصروف رہے گا اور فرانس اور جرمنی کے درمیان ثالث بالخیر بن کر کھڑا ہو جائیگا لیکن اُدھر معاشی اور اِدھر حربی کانفرنس کے التوا نے خاص و عام حلقوں میں ایک سخت بے چینی کم از کم ایک دل شکن مایوسی صریح طور پر پیدا کر دی اور جا بجا عالمگیر جنگ اور عالمگیر سیاسی و معاشی مصائب کی پیشین گوئیاں ہونے لگیں۔

پس بین الاقوامی مصالحت اور خوش حالی کے نقطۂ نظر سے اگر دُنیا کی حالت ۱۹۳۳ء کے شروع میں خوفناک تھی تو اُس کے اخیر میں کم از کم عارضی طور پر مایوس کُن بھی ہو گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ موجودہ معاشی سرد بازاری کی دو بڑی وجوہ ہیں ایک یہ کہ سرمایہ داری کا نظام جس میں نامداخلت اور "جو ہے سو رہے" کے اصولوں پر عمل ہوتا ہے جس میں حکومت غریبوں امیروں کے افلاس و امارت کو محض اُن کی قسمت یا نام نہاد ہمت پر چھوڑ دیتی ہے اپنی موجودہ حالت میں کسی طرح دُنیا کی خوشحالی کا کفیل نہیں ہو سکتا اور یہ اس نظام کے قیام کا لازمی نتیجہ ہو گا کہ گاہے گاہے اس میں سرد بازاریاں اپنی بھیانک صورت دکھاتی رہیں۔ قدیم ماہرینِ معاشیات کا یہ خیال کہ معاشی حالت ایک ایسا پنگورا ہے جو خود بخود اپنا توازن قائم رکھتا ہے کم از کم حال کی دُنیا میں غلط ثابت ہو رہا ہے، دُنیا کی معاشی حالت اس قدر پیچیدہ ہے کہ بغیر خاص تراکیب و تجاویز کے اس کا سُدھرنا ناممکن نظر آتا ہے بلکہ رُوسی اور دُوسرے اشتراکی بڑے مزے لے لے کر سرمایہ داروں کو بتا رہے ہیں کہ عقلمندو جس نظام کی بنا ہی غصب پر ہو وہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ معاشی سرد بازاری کی دوسری بڑی وجہ قوموں کی خود غرضی ہے، ہر قوم اپنا بھلا چاہتی ہے اپنے نفع کے پیچھے پڑی ہے اور اِس خود پرستی کی دُھن میں اُسے یہ خیال نہیں آتا کہ میری نفع جوئی اَوروں کو نقصان پہنچانے کے ساتھ شاید بالآخر مجھے بھی میرے حاصل کردہ نفع سے محروم کر دے۔ مُہذب دُنیا نے جلبِ منفعت کے ہزاروں دِل خوش کُن طریقے اختراع کر لئے ہیں اور وہ سمجھے ہوئے ہے کہ زندگی کا آرام و آسائش اُس کے قبضے میں ہے لیکن فطرت کہ اصلیت سے زیادہ آگاہ ہے اُس کے اِس جہل پر مسکرا رہی ہے کیونکہ خود غرضی و خود پسندی کی انتہا ہمیشہ بُغض، ناخوشی و تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ یورپ و امریکہ کے کئی رہبر اب "معاشی قومیت" کو دُنیا کی موجودہ ابتری کا مُوجب قرار دے رہے ہیں ہر قوم خود مختار و خود مست رہنا چاہتی ہے اور بین الاقوامی و انسانی بہتری کا خُون ہو رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی سیاسی حالت بھی ۱۹۳۳ء کے بارہ مہینوں میں بد سے بدتر ہو گئی۔ مشرق میں جاپان نے مغرب میں جرمنی نے جبر کی تلوار میان سے نکالی اور اپنے "حقوق" بزور طلب کئے، فرانس نے انگلستان نے مجلس اقوام نے بلکہ ساری مہذب دُنیا نے اُن کی اِس

جبر نمائی پر انہیں شرمندہ کیا اور کہا کہ مہذّب ہو کر مغلوب الغضب ہوتے ہو! جاپان مسکرایا جرمنی طیش میں آیا، متمدّن اتحادی غم و غصّہ سے بیتاب ہو کر یہ بھول گئے تھے کہ اپنے وقت میں اُنہوں نے بھی بہت سے قطعاتِ ارض پر ہاتھ صاف کئے تھے، کبھی چپکے چپکے کبھی علانیہ کبھی سیم و زر کے زور سے کبھی حکمتِ عملی کے فریب سے وہ بھی مختلف ملکوں میں اپنے ملکی اقتدار کو بڑھا چکے تھے اور اب دُنیا کے بیشتر حصّے اور کثیر مال و متاع پر قابض ہو کر وہ دوسروں کو وعظ کر رہے تھے کہ قابضوں کو دِق نہ کرو، جس کا ہے وہ اُسی کا رہے، انصاف کا یہی تقاضا ہے۔ حق یہ ہے کہ سیاسی دُنیا غاصبوں کی ایک بستی ہے، جس کا جب بس چلا، اُس نے جو کچھ ہو سکا سمیٹ لیا۔ بے شک جاپان کا مانچوریا پر قبضہ کر لینا اور وہاں سے چینیوں کو باہر نکال دینا زبردستی کا ایک کارنامہ ہے لیکن اور مہذّب فاتحین کی طرح جاپان کو بھی دعوے ہے کہ ہمارے معاشی مفاد کا تحفّظ اسی طرح ممکن ہے اور ہم محض اپنے ملک کے قرب و جوار میں امن و امان قایم کر رہے ہیں اور "مانچوکواو" کو لٹیروں کے فساد سے رہائی دلا رہے ہیں یعنی تمدّن کی تاریخ کے ہزاروں واقعات میں دخل در معقولات کا ایک واقعہ یہ بھی ہے! مجلسِ اقوام نے جنوری میں جاپان کو متنبّہ کیا کہ تم مانچوریا سے دست بردار ہو جاؤ، فروری میں جاپان اجلاس کو چھوڑ کر باہر چل دیا اور مارچ میں اُس نے مجلسِ اقوام سے علاحدگی کا اعلان کر دیا۔ جون میں بیچارے چین نے مجلس کو بے دست و پا دیکھ کر خود جاپان سے صُلح کر لی۔

مارچ میں علاوہ اس کے اور بھی دو اہم واقعات پیش آئے۔ ممالکِ متحدہ (امریکہ) میں ایک نئی حکومت کا آغاز ہُوا، جمہوری رہنما رُوزولٹ صدرِ جمہوریہ بن گیا اور اُس نے اپنی زبردست شخصیت کے زور سے امریکہ کی معاشی حالت کو سُدھارنا اور ایک نئے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ اندرونِ مُلک میں اجناس کی قیمتیں بڑھیں، طلائی معیار ترک کیا گیا، صنعت و حرفت کی تنظیم میں حکومت نے جا بجا دخل اندازی کی تاکہ پیدائش و صرفِ دولت میں مناسب تطابق قایم کر کے بے روزگاری میں کمی اور عام قومی خوشحالی میں اضافہ کیا جائے یعنی بے دخلی کا طریقہ چھوڑ کر حکومتِ مُلک کے ذریعے سے مُلکی زندگی کے ہر شعبے کی تنظیم عمل میں آئے۔ دیکھنا ہے کہ اس لائحۂ عمل کو کہاں تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

مارچ کا تیسرا بڑا واقعہ جرمنی میں ہٹلر کی کامیابی تھا۔ جنگ کے بعد کئی سالوں سے جرمنی اتحادی احکام و ہدایات کی جولاں گاہ بنا ہُوا تھا، جرمنی نے جنگ میں جبر و استبداد کے جوہر دکھائے تھے اُسے سزا ملنی ضروری تھی، فاتحین اپنا بدلہ لے رہے تھے لیکن چودہ سال مختلف بندشیں اور تکلیفیں سہ سہ کر جرمنی تنگ آ گیا تھا اُس کی نئی پود اپنے باپ دادوں کے گناہوں کے کفارے میں اپنی زندگیاں بھینٹ چڑھانے پر تیار نہ تھی، ہٹلر اور اُس کے نازیوں نے ببانگِ دُہل اعلان کر دیا کہ اب وہ اتّحادیوں کے ناز برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے پُوچھا کہ وہ جو برسوں ہوئے صلح پسند اتحادیوں نے دُنیا بھر پر واضح کر دیا تھا کہ جرمنی کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی تخفیفِ اسلحہ کے اصُولوں پر عمل کرنے پر مجبور کیا جائے گا اُس تجویز و ارادہ کا کیا حشر ہُوا اور کب تک جرمنی ایک مسلّح دُنیا میں ایک غیر مسلّح و غیر محفوظ قوم ہو کر رہے؟ جرمنی کی نئی حکومت ایک طرف اشتراکیت کی دُشمن ہے اور دوسری طرف فرانس اور اُس کے دوستوں سے نالاں ہے۔ وہ جرمن قوم کو مضبوط و مربوط دیکھنا چاہتی ہے۔ ہٹلر ایک زبردست خود پسند قوم پرست ناظم ہے جسے جرمن قوم نے ہر شعبۂ زندگی میں اپنا خود مختار حاکم بنا لیا ہے اور وہ اپنی تجاویز

کو بے دھڑک ہو کر عملی جامہ پہنا رہا ہے۔ یہودیوں کی طاقت کو پاؤں کے نیچے کچل دیا گیا ہے۔ جرمنی نے باقاعدہ طور پر حربی کانفرنس اور مجلسِ اقوام سے علیحدگی کا اعلان کر دیا ہے۔ اُدھر پولستان گھبرا رہا ہے کہ ڈینزگ کے آزاد شہر پر جرمنی کی نظریں ہیں اُدھر فرانس غصے میں آ رہا ہے کہ میرا شکست خوردہ دشمن اپنی فوج کا کیل کانٹا درست کر رہا ہے۔ جرمنی مساوات کا دعوے دار ہے، فرانس امن و تحفّظ کا طلب گار۔ اس نازک صورتِ حالات میں انگلستان اور اطالیہ سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہیں۔ انگلستان کا مُدعا صرف یہ ہے کہ کسی طرح میرا اقتدار کم نہ ہو اطالیہ کا مقصد یہ کہ کسی طرح میرا اقتدار بڑھے۔ انگلستان فرانس کی طاقت کو بڑھتے دیکھنے کا خواہشمند نہیں گو وہ علانیہ جرمنی کو اُکسانا بھی نہیں چاہتا۔ اطالیہ کا رہنما مسولینی جرمنی اور فرانس کی اس رقابت سے فائدہ اُٹھا کر اپنا داؤں چل رہا ہے۔ اِن بڑے پہلوانوں کے بیچ بیچ آسٹریا کا نوجوان دبک کر بیٹھا ہے جرمنی اُسے بزور اپنا چھوٹا بھائی بنانے پر مُصر ہے پُرانے اتحادی ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بار بار اُسے ورسائی کا عہدنامہ دکھاتے ہیں کہ اِس شرارت سے باز آؤ اور ہمارے فضل و کرم کو یاد کرو!

اِدھر سرمایہ داروں میں یُوں مسابقت کا شور ہے اُدھر اشتراکی رُوس الگ بیٹھا بڑے زور سے اپنے نئے کام میں مصروف ہے۔ کہتے ہیں رُوس کی حالت خراب ہے اور سردیوں کا یہ زمانہ اس کے لئے بڑی سختی کا زمانہ ہوگا۔ اشیائے خوردنی کی کمی ہے۔ کسان مشینوں کے ہل وغیرہ چلانے میں کودن ثابت ہو رہے ہیں، نئی چیزوں کیلئے جوش کب تک قائم رہیگا! لیکن یہ کہانی ہم برسوں سے سُن رہے ہیں اور برسوں سے رُوس اور اُس کے نئے تجربات برابر جاری ہیں۔ نوجوان روز بروز دیہات سے شہروں کی طرف جوق در جوق آ رہے ہیں۔ عورتیں قدیمی طاقتور آزاد رُوسی عورتوں کی طرح مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں اور اُن کے بچوں کے لئے اب نئی چیزیں نئی نہیں ہیں۔ شہروں میں اشتراکیت کی بُنیاد اس قدر مضبوط ہو گئی ہے کہ کم از کم فی الحال اُس کی بیخ کنی بہت غیر اغلب نظر آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ جیسا مشہور ماہرِ نفسیات فرؤیڈ نے حال میں لکھا ہے کہ انسانی فطرت کو بدل دینا اس قدر آسان نہیں جتنا بالشویک سمجھ رہے ہیں اور نہ اُن کے طرزِ عمل اور طریقوں میں دوسروں کو وہ آزادی دی جاتی ہے جس کے وہ اپنے آپ کو علم بردار ظاہر کرتے ہیں اور شاید نتائج سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اُنھوں نے اپنا نیا اشتراکی تجربہ کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ بالشویک بڑی تن دہی اور جوش سے کام کر رہے ہیں اور اُن کا تجربہ مستقبل کے لئے بالکل خالی از اُمید نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یورپ میں اشتراکی انقلاب کا جلد پھیل جانا بہت مشکل نظر آتا ہے، متوسط طبقہ طاقتور ہے، زراعتی مزدور انقلاب پسند نہیں، موجودہ تمدّن اور مذہب دونوں اشتراکیّت کے خلاف ہیں اور خود طبقۂ اسفل میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے، علاوہ بریں انقلاب اور بالخصوص کامیاب انقلاب کوئی آسان چیز نہیں لیکن یہ بھی ضرور ماننا پڑے گا کہ باوجود اِن سب رُکاوٹوں کے رُوسیوں کی نئی زندگی کے دھماکے ساری دُنیا میں گاہے گاہے زلزلے بپا کر رہے ہیں کچھ عرصہ ہوا ایک عظیم الشان "ورزشی اجتماع" کے موقع پر وہ نظارہ قابلِ دید تھا جب پچاس ہزار رُوسی مل کر زور سے یہ گیت گا رہے تھے کہ "ہم دُنیا کو بدل رہے ہیں ہم دُنیا کو بدل رہے ہیں"! اغلب یہ ہے کہ رُوس

کا نیا تجربہ ایک حد تک کامیاب ہو جائے گا، کچھ دُنیا رُوس کو روک لے گی کچھ رُوس دُنیا کو اپنی راہ پر گھسیٹ لے جائے گا اور اشتراکیت اور سرمایہ داری کی اِس کھینچا تانی سے ایک نیا نظام ظہور میں آئے گا اور تمدن کی کل کے پُرانے پُرزے ایک نئے انداز سے کام کرنے لگیں گے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گذشتہ سال میں اطالیہ اور امریکہ نے رُوس سے رابطہ بڑھایا ہے۔ امریکہ اور رُوس دونوں جاپان سے ڈر کر ایک دُوسرے کی دوستی کے خواہاں ہیں۔ رُوس اب متمدن دُنیا میں اچھوت نہیں رہا اور وہ وقت دُور نہیں کہ سرمایہ دار دُنیا اُس سے پھر بدستور تعلقات قائم کر لے گی۔ اُدھر جاپان اور جرمنی میں بعض مشترک باتیں پیدا ہونے کے باعث اُلفت بڑھ رہی ہے دونوں کا ہاتھ اپنی تلوار کے قبضے پر ہے، دونوں رُوس سے رُوگرداں ہیں، دونوں مزید علاقہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں دونوں حربی کانفرنس سے بیزار اور مجلسِ اقوام کو الوداع کہہ چکے ہیں۔ مشرق و مغرب کے اکھاڑے میں نئی جماعتیں مرتّب ہو کر ایک دُوسرے کا مدِ مقابل بننے والی ہیں۔

علاوہ رُوس کی جدت طرازیوں کے دُنیائے حاضر میں چند اور نئی قوتیں اور چند اور نئے امُور بھی رُونما ہو رہے ہیں ملک ملک میں مطلق العنان رہنما رُوس میں سٹیلن، اطالیہ میں مسولینی، ترکی میں مصطفٰے کمال برسرِ اقتدار ہیں۔ رُوس کے معاشی نظام اور دُنیا کی کساد بازاری کی حالت سے ثابت ہو رہا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی معاشیات میں خاص تنظیم و ہدایت کے بغیر ترتیب و ترقّی ناممکن ہے۔ اُدھر علوم کی افزائش اور ایثار و رفاہِ عام کی کمی سے انسانی علم و عمل میں وہ تطابق قائم نہیں رہا جس پر صحیح تمدن کا دارومدار ہے یعنی دماغ آسمان پر ہے لیکن نفس ہنوز تحت الثریٰ میں ہے۔ مظلوم جماعتوں میں بالخصوص عورتوں میں روز بروز زندگی کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں چنانچہ چین اور ہندوستان سے ملکوں میں بھی عورتیں اپنے حقوق کے لئے ساعی نظر آتی ہیں بہ ہیئتِ مجموعی دُنیا میں ہر جگہ ایک قسم کی بے چینی اور بیداری رُونما ہے۔ کیا اس کے معنی ترقّی ہیں؛ ترقی کا سوال بہت پیچیدہ ہے اگر کہیں جمہوریت کا بول بالا ہو رہا ہے تو کہیں مطلق العنانی زوروں پر ہے اور اُس کے اور اِس کے نتیجے کہیں پسندیدہ کہیں ناپسندیدہ کبھی اچھے ہیں کبھی بُرے یا کچھ اچھے ہیں کچھ بُرے جو کچھ پا لیتا ہے وہ حق بحقدار رسید کا نعرہ بلند کرتا ہے، جو کھو دیتا ہے وہ کہتا ہے بے شک دُنیا میں نیکی ہمیشہ گھاٹے میں ہے مثلاً آئرستان خود مختاری کے اعلانات کر رہا ہے لیکن ہندوستان مجبُوری کی جیب میں گُم ہے۔ اِس شور و غُل کے معنی کچھ بھی ہوں یہ ظاہر ہے کہ ہماری زندگیاں ایک نہایت دلچسپ زمانے میں سے گزر رہی ہیں۔

**بشیر احمد**

# بزمِ ہمایوں

یہ "ہمایوں" کی بارھویں سال گرہ ہے۔

گزشتہ سال میں بہ دستورِ سابق ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ ہمایوں اعتدال و یکسانیت اور تدریجی ترقی کی اُس روش پر قائم رہے جو شروع سے اس کا مطمحِ نظر بنی رہی ہے۔ اگر آج سے بارہ سال پہلے کے پرچے اُٹھا کر دیکھیے تو ہمایوں کی شکل و شباہت ترتیبِ مضامین اور خیالات کی میانہ روی میں بہت زیادہ فرق دکھائی نہیں دیتا۔ تاہم غور کیا جائے تو صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ علاوہ بعض ظاہری جزوی تبدیلیوں کے انواعِ مضامین میں بھی بعض اہم تغیرات واقع ہوئے ہیں۔ ابتدا میں ہمارے ہاں افسانے ضرور ہوا کرتے تھے لیکن کم، علمی و اصطلاحی مضامین کی زیادتی تھی، معلومات زیادہ ہیجان خیز تھیں۔ اب افسانوں کی زیادتی ہے علمی مضامین کی اصطلاحیں زیادہ عام فہم اور سُبک ہیں معلومات میں متانت کا عنصر غالب ہے۔ اور یہ کوئی ہمایوں کی ایجادات یا امتیازات نہیں ہیں، علمی و ادبی دنیا کی روش اور اُردو ادب کے فطری ارتقا نے یہ صورت خود بخود پیدا کر دی ہے۔ افسانوں کی طغیانی مغرب سے چل کر مشرق میں در آئی ہے۔ اور یہ افسانے اب محض امیر حمزہ یا الف لیلہ کی داستانیں نہیں رہے بلکہ روزمرہ کی زندگی کے جیتے جاگتے نقشے ہیں۔ اصطلاحات سے اُردو کا دامن لبریز ہوتا جا رہا ہے اور جہاں ایک طرف انہیں آسان بنانے کی طرف توجہ ہے دوسری طرف اُن کا اشکال بھی کثرتِ استعمال سے اتنا گراں نہیں رہا جتنا پہلے تھا۔ اور بیرونی دنیا کا اب ہم محض بچوں کی طرح تماشا نہیں کرتے۔ بلکہ اُس کے مظاہر میں کوئی نہ کوئی معنی سمجھنے کے خوگر ہو گئے ہیں۔

اِن تبدیلیوں اور ترقیوں میں گزشتہ سال میں جن اصحاب نے خصوصیت سے حصہ لیا اُن میں سے بعض کے اسمائے گرامی شکریہ کے ساتھ درجِ ذیل کیے جاتے ہیں۔

نثر میں حضراتِ ادیب، فلک پیما، فیاض محمود، فہیم بیگ، عبدالغنی، نشتر، عزیز الرحمٰن ہاشمی، انیس احمد رشدی، منصور احمد، ابو محمد امام الدین، زبیر احمد، یوسف سلیم، فرحت اللہ بیگ، برج موہن کیفی، عظیم بیگ، ظفر قریشی، محمد علی، پریم چند، دیوانہ، عاصی، مہدی، مسعود حسن، منظور سروش، حمید احمد خاں، ناظم میرٹھی، جواد حسن عزیز جاوید، عطاء اللہ، محشر عابدی۔ عطاء الرحمٰن، نور الٰہی، ثاقب،

نظم میں، جوش، آزاد انصاری، عدم، مقبول حسین، امجد، اثر صہبائی، ماہر القادری، رگھوپتی سہائے فراق، راشد، اکبر، کلیم، اختر شیرانی، وحشت، اختر حیدرآبادی، ح ب صاحبہ، روش، نجیب، عابد حسن ماہروی، عباسی، علی منظور، شاد عارفی، اندرجیت شرما، راز، نگش، مجاز، جمیل واسطی، سجاد، دانش وغیرہ

بشیر احمد

# بہار

خوشی کے زمزمے گاتی ہوئی فصلِ بہار آئی
گلستاں سے صدائے خندۂ گل بار بار آئی

چمن کے پتّے پتّے پر ہوئی انوار کی بارش
گھٹا بن کر نویدِ رحمتِ پروردگار آئی

صدا بُلبُل کی گونجی دم بدم صحنِ گلستاں میں
بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی، بہار آئی

لڑھکتی، لڑکھڑاتی، کھڑکھڑاتی پتّیاں بھاگیں
سپاہِ گل قطار اندر قطار اندر قطار آئی

خزاں رخصت ہوئی، ڈرتی، سمٹتی، کانپتی، دبتی
چمن سر پر اٹھاتی، ناچتی، گاتی بہار آئی

خزانہ رات بھر گلشن نے لُوٹا حسنِ فطرت کا
گجر دم ورنہ کیوں پھر شبنمِ گوہر شمار آئی

ہوئی اِس خاکداں پر حُسنِ فطرت کی وہ ارزانی
کہ جنّت کی نگاہِ رشک ہو کر شرمسار آئی

اُفق تک سُو بہ سُو لہرا رہے ہیں زمردیں افعی
زمیں خوش ہو کے میلی کچلی اپنی اتار آئی

گلستاں گرمیٔ انفاسِ گُل سے تمتما اُٹھا
کہ روحِ عشق لے کر زندگانی کا شرار آئی

گھر آیا، جھومتا، دھومیں مچاتا ابرِ آزاری
اور اُس کی پیشوائی کو یہ چشمِ اشکبار آئی

صبا کے مست سحر انگیز جھونکے پے بہ پے آئے
بھلانے پر بھی یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی

سمجھ کر گُل کو ہمسر اُس کے عارض کا سحر بُلبُل
گئی اک گُل کی پتّی لے کے لیکن شرمسار آئی

صبا مستی سے اٹھلاتی ہوئی پھرتی تھی گلشن میں،
ہنسی پھولوں کو اِس پر آئی اور بے اختیار آئی

نگہ نرگس کی حیراں زلف سنبل کی پریشاں ہے
بہار اُس انجمن سے آئی لیکن بے قرار آئی

وہ حُسنِ جاوداں فارغ ہے قیدِ اردی و دَے سے
خزاں ہے سادگی اُس کی، بہار اُس کی خود آرائی

بحمد اللہ وہی اب سرمۂ چشمِ جہاں بیں ہے
کبھی رکھی تھی، کام آج اُس کی خاکِ رہگذار آئی

دیارِ عشق میں چرچے ہیں اپنی بے نوائی کے
جہانِ حُسن پر جیسے مسلّم اُس کی دارائی

انا الحُسن اپنی خاکستر کے ہر ذرّے سے پیدا ہے
دعائے عشق دیکھا کس طرح بر رُوئے کار آئی؟

حامد علی خاں

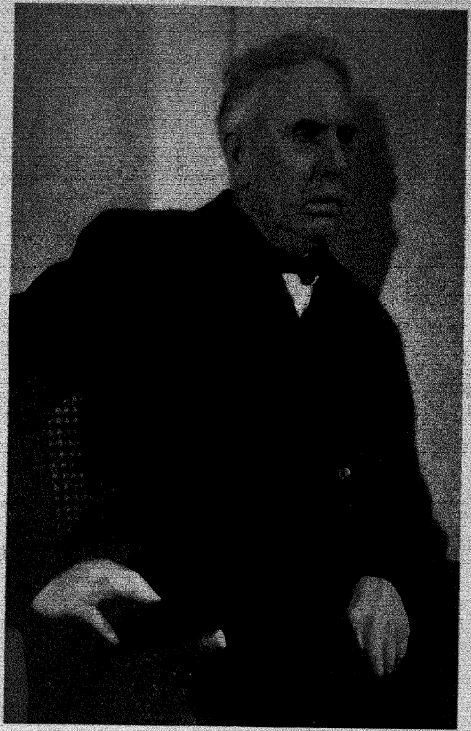

تھیوڈور ڈرائزر

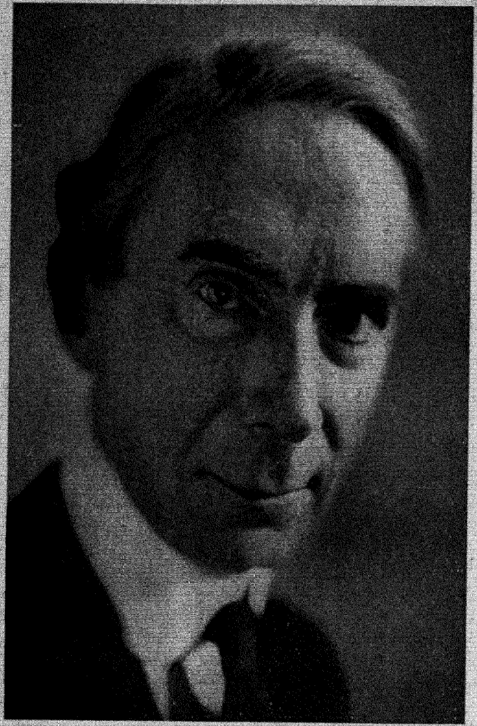

برٹرینڈ رسل

# زندہ فلسفے

## دُنیا کے عقلمند کیا کہتے ہیں؟

دُنیا کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ خدا ہے یا نہیں؟ زندگی کا کیا مقصد ہے؟ ہماری معاشرت کی حالت اچھی ہے یا بُری؟ سیاست کس رنگ میں ہے؟ مذہب کا مستقبل کیا ہے؟ بڑے بڑے مفکر کیا سوچتے ہیں، کیا کرتے ہیں؟ اُن کے نزدیک دُنیا میں کیا کچھ ہونے والا ہے اور ہر خاص و عام کو تبدیل شدہ حالات میں کیا کرنا (اور کیا نہ کرنا) چاہیئے؟ یہ ہیں وہ چند دلچسپ سوالات جن کا جواب آج ہم دنیا کے بعض عقلمندوں کے قلم سے سننے والے ہیں۔

ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ کیا ہمیں بدستور اپنے پرانے خیالات کا معتقد بنے رہنا چاہیئے یا کیا ہمیں فی الفور ان نئے خیالات کی پیروی کرنی چاہیئے؟ ہر شخص اگر ٹھنڈے دل سے غور کرے تو وہ اپنے حالات کے مطابق اِس سوال کا مناسب جواب دے سکتا ہے۔ لیکن بالعموم یہ اصُولِ کار اکثر تعلیم یافتہ لوگوں پر صادق آئے گا کہ اعتقادات کو راسخ و پاکیزہ بنانے کا بہترین طریق یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً اُن پر نئے خیالات کی روشنی ڈالی جائے۔ جو عقیدہ مضبوط اور عقل و تجربہ پر مبنی ہوگا وہ ہر آزمائش پر بہتر و مضبوط تر ہو کر نکلے گا جو خیال فرسودہ ہو چکا ہوگا وہ نئے علوم کی ٹکر سے جلد ملیا میٹ ہو جائیگا۔ آج کل دنیا میں انقلابات کا دور دورہ ہے۔ سیاست میں، معاشرت میں، مذہب میں انقلاب۔ ایسے وقت میں جہاں اپنے محبوب معتقدات کو محفوظ رکھنا مشکل کام ہے وہاں ان کی اصلاح و تنظیم بھی کافی سہل ہے۔ ایسے زمانے میں فروعات اپنا کام کر چکنے کے باعث فنا ہو جاتی ہیں لیکن آزمودہ اصول پھر ایک نئی زندگی حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ حق پرست آدمیوں کو نئے خیالات سے ڈرنا نہ چاہیئے، اچھی شئے کو لے لو بُری شئے کو چھوڑ دو، ہر شعبۂ زندگی میں یہ ایک کار آمد اصول ہے۔ ایک ہوشمند شخص کو اپنے مخالف و مطابق ہر قسم کے خیالات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیئے۔ راستی وہی ہے جو نئے خیالات اور نئے حالات کے متواتر تصادم کے بعد بھی زندہ و تابندہ رہے +

حال میں ایک نہایت دلچسپ کتاب "زندہ فلسفے" شائع ہوئی ہے جس میں دُنیا کے بعض زندہ مشاہیر نے جن میں ہر قسم کے مفکر، فلسفی، طبیعیات دان، خدا پرست، دہریئے، لا ادریئے سب شامل ہیں اپنے دلی معتقدات کا صاف صاف اظہار کیا ہے۔ اُن میں سے چند مشاہیر کے خیالات کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

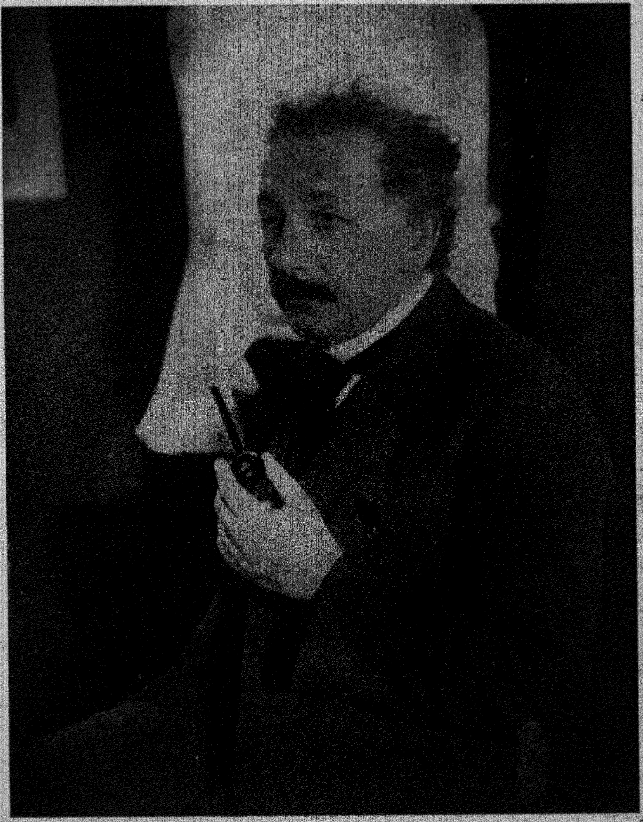

آئن شٹائن

# ایلبرٹ آئن شٹائن

(یہ اضافیت کے انقلاب انگیز نظریے کا واضع اور دنیا کا سب سے ممتاز سائنس دان ہے اسے مشہور "نوبل" انعام مل چکا ہے)

اِس دنیا میں ہماری عجیب حالت ہے۔ ہم سب یہاں تھوڑی دیر کے لئے آتے ہیں ہم نہیں جانتے کیوں۔ گو بعض اوقات ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم دل ہی دل میں اِس حقیقت سے واقف ہیں ۔

البتہ روزانہ زندگی کے نقطۂ نظر سے ایک بات ہے جسے ہم خوب جانتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان اِس دُنیا میں دوسرے انسانوں کے لئے پیدا ہؤا ہے۔ بالخصوص اُن کے لئے جن کی خوشی اور سلامتی پر ہماری اپنی خوشی کا انحصار ہے۔ اور اُن بیشمار رُوحوں کے لئے بھی جن کی قسمت کے ساتھ ہم ایک رشتۂ ہمدردی سے وابستہ ہیں۔ دن میں کئی بار میرے دل میں خیال اُٹھتا ہے کہ میری بیرونی اور اندرونی زندگی کس حد تک میرے مُردہ و زندہ ہم جنسوں کی محنت پر تعمیر ہوئی ہے۔ اور مجھے کس قدر تن دہی سے محنت کرنی چاہیئے کہ مَیں نے جتنا کچھ پایا ہے اُتنا ہی اُس کے عوض میں دے بھی سکوں میرے دل کا اطمینان بیسیوں دفعہ اِس دل شکن احساس سے پریشان ہو جاتا ہے کہ میرا کام فی الواقع بہت کچھ اَوروں کی کارگذاری کا شرمندۂ احسان ہے ۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے آزادی ہمارے نصیب میں نہیں اِس لئے کہ ہم نہ صرف بیرونی اثرات سے مجبور ہوتے ہیں بلکہ ہم اپنی اندرونی ضرورت کی وجہ سے بھی بے اختیار ہیں۔ **شوپن ہار** کے اس مقولے کا کہ "بلاشُبہ انسان اُس کام کو کر سکتا ہے جس کا وہ ارادہ کرلے۔ لیکن خود اُس کا ارادہ اُس کے اختیار سے باہر ہے"۔ جوانی کے دنوں میں ہی مجھ پر بے حد اثر ہؤا اور جب کبھی اَوروں پر یا مجھ پر زندگی کی مصیبتیں آ پڑی ہیں مَیں نے ہمیشہ اِسی خیال سے تسلّی پائی ہے۔ اِس بات کا یقین ہمیشہ رواداری پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے ہم اپنے آپ کو یا اَوروں کو نہایت متین و سنجیدہ بن کر نہیں دیکھتے بلکہ اِس سے دل میں ظرافت کی ایک موج اُٹھتی ہے ۔

میری رائے میں اپنے وجود یا زندگی کے مقصد پر دن رات غور کرتے رہنا کم از کم معروضی نقطۂ نظر سے سخت نادانی ہے۔ تاہم ہر شخص کے چند خاص نصب العین ہوتے ہیں۔ جس سے اُس کی اُمنگیں اور آرزوئیں ایک خاص رستے پر چلتی ہیں۔ وہ نصب العین جو ہمیشہ سے میری آنکھوں کے سامنے روشن و تاباں رہے اور جن کے باعث میرے لئے زندگی پُر لطف ہو گئی نیکی، خوبصورتی اور سچائی ہیں۔ آسائش یا خوشی ہی کو اپنا نصب العین بنا لینے پر مَیں کبھی مائل نہیں ہؤا، اخلاق کا نظام جو ایسی بنیاد پر قائم ہو صرف ڈھوروں کے ایک گلّے کے لئے ٹھیک ہوگا ۔

میری زندگی محض خالی اور بے معنی ہوتی اگر آرٹ اور سائنس کے ناممکن الحصُول حقائق کی تفتیش و تفحص میں اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا احساس میرے دل میں پیدا نہ ہوتا۔ بچپن کے زمانے سے مَیں اُن حدود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہوں جو عوام کے نزدیک انسانی ترقی پر عائد ہیں۔ مال متاع، ظاہری کامیابی، تشہیر اور عیش و عشرت سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ایک سادہ اور بے تصنع طریقِ زندگی ہر شخص کے لئے بہترین ہے اور جسم و نفس دونوں کے لئے مفید ترین ◆

یہ عجیب بات ہے کہ اِدھر مجھ میں معاشری عدل اور معاشری ذمہ داری کا شدید جذبہ ہے اور اُدھر مرد و زن سے عام میل جول کی مجھے مطلق خواہش نہیں۔ مَیں وہ اکیلا جُتنے والا گھوڑا ہوں۔ جو جوڑی میں کام نہ دے سکے۔ مَیں کبھی اپنے ملک یا حکومت یا دائرۂ احباب بلکہ اپنے کنبے سے بھی دل و جان کے ساتھ وابستہ نہیں رہا۔ میرے اِن تعلقات میں ہمیشہ ایک قسم کی مبہم سی علیحدگی پائی گئی ہے۔ اور جوں جوں میری عمر بڑھتی جاتی ہے اپنے آپ میں کنارہ کشی کی یہ خواہش بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

اس قسم کی علیحدگی بعض اوقات سخت ناگوار ہوتی ہے۔ مگر اس پر بھی مجھے رنج نہیں کہ مَیں دوسرے آدمیوں کی مفاہمت اور ہمدردی سے دُور پڑا ہوں۔ بلاشُبہ اِس سے مجھے کچھ نہ کچھ گھاٹا پڑتا ہے مگر اُدھر فائدہ یہ ہے کہ مَیں دوسروں کے رسُوم آرا، اور تعصبات سے آزاد رہتا ہوں اور مجھے یہ ترغیب نہیں ہوتی کہ اپنے دل کے امن و امان کو ایسی بودی بنیاد پر قائم رکھوں ◆

میرا سیاسی نصبُ العین جمہوریت ہے۔ بطور ایک فرد کے ہر شخص کی عزت لازم ہے لیکن کسی کی پرستش نہ ہونی چاہئے۔ یہ قسمت کا ایک مذاق ہے کہ مجھ پر اس قدر غیر ضروری اور غیر مستحق تعریف و حرمت کی بوچھاڑ ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام اُن چند خیالات کو جو مَیں نے اپنی کمزور طاقت کے ساتھ پیش کئے ہیں سمجھنا چاہتے ہیں لیکن سمجھ نہیں سکتے ◆

مَیں خوب جانتا ہوں کہ کسی مخصوص منتہا تک پہنچنے کے لئے لازم ہے کہ کسی کارنامے میں غور و فکر اور دوسروں کی قیادت و رہنمائی محض ایک شخص سے متعلق ہو اور وہی زیادہ تر ذمہ وار بھی ہو۔ لیکن یہ بھی ہونا چاہئے کہ رہنما اپنے پیرووں کو محض ہانکنے نہ جائیں بلکہ عوام کو اختیار ہونا چاہئے کہ وہ آپ اپنا رہنما انتخاب کر سکیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرت کے طبقوں کو جدا رکھنے والے امتیازات غلط ہیں۔ تجربہ کرنے پر ظاہر ہوگا کہ اُن کی بنیاد جبر و اکراہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تشدد کے مطلق العنان نظام کا نتیجہ تذلیل ہوتا ہے کیونکہ تشدد سے لازم طور پر بودے اور بُزدل لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ زمانہ کئی بار ثابت کر چکا ہے کہ ممتاز ظالموں کے بعد فاسق شخص زور پکڑتے ہیں ◆

اِس وجہ سے مَیں ہمیشہ ایسے نظاماتِ حکومت کا سخت مخالف رہا ہوں جیسے آج کل روس اور اطالیہ میں قائم ہیں۔ وہ شے جس نے یورپی طرزِ جمہوریت کو بے اعتبار بنا دیا ہے خود جمہوریت نہیں جسے بعض ناقص خیال کرتے ہیں۔ بلکہ

وہ ہماری سیاسی لیڈری کا تلوّن اور پارٹیوں کے حدود کا غیر ذاتی نظام ہے +

میں سمجھتا ہوں کہ دولِ متحدہ (امریکہ) نے صحیح خیال کو پالیا ہے۔ ایک صدر مناسب مدت کے لئے منتخب ہوتا ہے اور اُسے خاص اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو کافی طور پر نبھا سکے۔ اس کے برعکس جرمن حکومت میں مجھے یہ بات پسند ہے کہ حکومت کسی فرد کی علالت یا بے روزگاری کے وقت اُس کی کما حقہٗ نگہداشت کرتی ہے۔ ہماری زندگی کی جدوجہد میں جو شے فی الحقیقت بیش بہا ہے وہ میری رائے میں قوم نہیں بلکہ وہ ہے تخلیقی اور اثر پذیر انفرادیت یا شخصیت یعنی وہ جو ممتاز و اعلیٰ کی تخلیق کرتی ہے اس حال میں کہ عوام الناس خیال و احساس میں محض کُند اور بے خبر پڑے رہتے ہیں +

اِس ضمن میں مجھے عوام کے حیوانی نفس کے اُس لغو ترین فعل یعنی جبری قومی فوج کا خیال آتا ہے جو یقیناً قابلِ صد نفرین ہے۔ وہ شخص جو فوجی قطاروں میں فوجی باجے کے ساتھ ساتھ کوچ کرتا ہے اور اس حرکت میں لطف اُٹھاتا ہے میری انتہائی نفرت کا مرجع بن جاتا ہے۔ اُسے قدرت نے غلطی سے دماغ عطا کر دیا اُس کے لئے محض ریڑھ کی ہڈی کافی ہوتی۔ یہ حکم ملنے پر بہادری دکھانا، یہ بیہودہ تشدد، یہ حب الوطنی کی ملعون ڈینگ ــــ اِن سب کو مَیں کتنی حقارت سے دیکھتا ہوں۔ جنگ ایک ادنیٰ اور قابلِ نفرت شے ہے! اور بجائے اِس کے کہ میں ایسے کاموں میں حصہ لوں میں پسند کرونگا کہ میرے جسم کے ہزار ٹکڑے کر دیئے جائیں +

نوعِ انسان پر اس قسم کے دھبے کو بغیر تامل کے مٹا دینا چاہیئے۔ مجھے انسانی فطرت کی راستبازی سے پوری امید ہے کہ یہ داغ مدت ہوئی مٹ چکا ہوتا اگر کاروباری اور سیاسی اسباب کے ماتحت درسگاہوں اور اخبارات نے اپنے باقاعدہ اثر سے قوموں کی عام سمجھداری کا ستیاناس نہ کر دیا ہوتا۔

سب سے حسین چیز جو ہمارے تجربے میں آسکتی ہے وہ مخفی اور بعید الفہم حقیقت ہے۔ وہ ہے سرچشمہ تمام صحیح آرٹ اور سائنس کا۔ وہ شخص جو اس جذبے سے عاری ہے جو مظاہر کو دیکھ کر حیران و ششدر نہیں ہو جاتا وہ زندہ نہیں بلکہ محض مُردہ ہے۔ اُس کی آنکھیں بند ہیں۔ زندگی کے پنہاں راز کی یہ پہچان گو اِس میں خوف کی آمیزش بھی ہے۔ اِسی سے مذہب کی بِنا پڑی ہے۔ یہ جان لینا کہ وہ جو نا قابلِ ادراک ہی ہے ضرور اور اُس کا ظہور اعلیٰ ترین فراست اور روشن ترین حُسن میں ہوتا ہے جنہیں ہمارے کند قوا محض اُن کی نہایت ابتدائی شکلوں میں سمجھ سکتے ہیں، یہ جان لینا یہ محسوس کر سکنا یہی سچی مذہبیت کی جان ہے۔ اِس معنی میں اور صرف اِس معنی میں مَیں بھی سچے مذہبی آدمیوں کی جماعت میں شریک ہوں +

ایسا خدا میرے ذہن میں نہیں آسکتا جو اپنی مخلوق کو انعامات تقسیم کرتا ہے اور سزائیں دیتا ہے جس کے مقاصد ہماری

طرح کے ہیں یعنی ایسا خدا جو محض انسانی کمزوریوں کا ایک عکس ہو۔ نہ مجھے اِس کا یقین ہے کہ فردِ بشر موت کے بعد زندہ رہتا ہے اگرچہ کمزور رُوحیں بوجہ خوف یا فضول انانیت کے اِن خیالات میں پناہ لیتی ہیں۔ میرے لئے تو یہ کافی ہے کہ حیاتِ شاعرہ کے معمے کو سوچوں کہ وہ کس طرح ازل سے ابد تک اپنے آپ کو قائم رکھتی ہے۔ کائنات کی حیرت انگیز ساخت پر جسے ہم محض ذرا سا دیکھ سکتے ہیں۔ غور کروں اور انکسار کے ساتھ اُس دانشمندی کے چھوٹے سے چھوٹے حصے کو سمجھنے کی کوشش کروں جو فطرت میں ہویدا ہے!

# برٹرنڈ رسل

(یہ غالباً انگلستان کا سب سے بڑا زندہ فلسفی ہے۔ بطور ریاضی دان ماہرِ تعلیم اور فلسفی ہونے کے یہ امریکہ اور یورپ دونوں میں انتہائی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی بعض تصنیفات یہ ہیں۔ تعلیم (بالخصوص بچپن میں) "شادی اور اخلاق"۔ "خوشی کی تسخیر"۔ "طبیعاتی ردیہ"۔ مبادیاتِ فلسفہ وغیرہ)

دنیا کے متعلق میرے خیال اَور لوگوں کی طرح کچھ میرے حالات کا اور کچھ میری طبیعت کا نتیجہ ہیں ٭

مذہبی اعتقادات کے ضمن میں وہ لوگ جنہوں نے مجھے تعلیم دی اُنہوں نے مجھے راسخ الاعتقاد بنانے کے بہترین طریقے اختیار نہ کئے۔ چودہ برس کی عمر تک تو میں پکا وحدت پسند رہا لیکن اس کے چار سال بعد میرا اعتقاد بتدریج متزلزل ہونے لگا ٭ سب سے پہلے انسانی اختیار میں میرا اعتقاد جاتا رہا پھر بقا میں پھر خدا میں یہاں تک کہ میں نے مسیحیت کو قطعاً ترک کر دیا ٭

اس حالت میں میں کیمبرج کی یونیورسٹی میں تعلیم پانے گیا جہاں پہلی بار میں ایسے لوگوں سے ملا جن سے میں اُن اُمور کے متعلق گفتگو کر سکتا تھا جن میں مجھے دلچسپی تھی۔ یہاں میں نے فلسفہ سیکھا، دو سردیوں کے موسم میں نے برلن میں گزارے۔ جہاں میں نے معاشیات کا مطالعہ کیا، پھر ایک زمانہ ایک یونیورسٹی کا لکچرر بننے کے بعد کچھ عرصہ میں نے فلارنس کے ماہرینِ آرٹ کی صحبت میں گزارا۔ اخیر میں میں اپنے دیہاتی گھر میں جا کر متمکن ہو گیا۔ اِس خیال سے کہ گیارہ برس کی عمر سے جو خواہش مجھے ریاضی کے اصولوں پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کی تھی اُسے پورا کروں ٭

اوائل عمر کے اُس زمانے میں مجھے ایک بڑا عجیب اور اہم تجربہ ہُوا۔ میرا بھائی جو مجھ سے سات سال بڑا تھا مجھے اقلیدس سکھانے پر آمادہ ہو گیا۔ مجھے اِس سے بہت خوشی ہوئی کیونکہ مجھے بتایا گیا تھا کہ اقلیدس چیزیں ثابت کرتا ہے اب مجھے امید بندھی کہ آخر مجھے کچھ ٹھوس علم حاصل ہو گا۔ مجھے اپنی وہ مایوسی ہمیشہ یاد رہے گی جب میں نے دیکھا کہ اقلیدس اپنے علم کی ابتدا

مفروضات سے کرتا ہے۔ جب میرے بھائی نے اقلیدس کا پہلا مفروضہ پڑھا تو میں نے کہا کہ کوئی وجہ نہیں کہ میں اسے مان لوں۔ اِس پر اُس نے مجھے صاف جواب دیا کہ اس صورت میں اس کی تحصیل بیکار ہے۔ اِس طرح اڑتیس سال کی عمر تک مجھے برابر یقینی علم کی تلاش رہی۔ اِسی لئے میری توجہ سب سے پہلے ریاضی کی طرف مبذول ہوئی۔ میرے کام کا سارا نتیجہ صرف علم حساب میں چند شکوک پیدا کرنا تھا جو پہلے پیدا نہ کئے گئے تھے۔ مجھے یقین ہوگیا اور ابھی تک یقین ہے کہ میرا طریقہ درست ہے۔ لیکن جو علم اس سے حاصل ہوتا ہے وہ محض اغلب ہے اور اس قدر صحیح و معین نہیں جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے +

اب میری زندگی کی راہ بدل گئی۔ میں نہ چاہتا تھا کہ میں محض مجردات میں منہمک رہوں۔ اِسی زمانے میں جنگِ عالمگیر چھڑ گئی اور اب میں نے بغیر ذرا سے شک و شبہ کے جان لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں عمر بھر کبھی کسی کام میں اتنا منہمک نہیں رہا جتنا اُس "صلح پسندانہ" کام کی نشر و اشاعت میں جو میں نے جنگِ عظیم کے دوران میں کیا۔ شک و شبہ مجھے تنگ نہ کرتا تھا۔ عمر میں پہلی بار مجھے ایک ایسا کام ملا جس میں میری ساری فطرت مصروفِ کار ہوگئی +

عقلی دیانت داری کی وجہ سے یہ ناممکن ہوگیا کہ میں کسی شریکِ جنگ قوم کی اُن گپّوں پہ یقین کر لوں جو جنگ کے جواز سے متعلق ہیں۔ علماء کا معاشرہ میں اگر کوئی کام ہے تو وہ فقط یہ ہے کہ وہ جوش و خروش کے اوقات میں سرد مزاجی اور بے تعصبی سے اپنی رائے قائم کریں۔ لیکن میں نے یہ پایا کہ اکثر علما کو صرف امن و امان کے وقت میں عقل کا کوئی مصرف نظر آتا ہے۔ میں نے یہ دیکھا کہ وہ لوگ جو شروع شروع میں جنگ کے محاذ سے دُور گھر پہ مقیم رہے وہ جنگ سے خوب لطف اُٹھاتے رہے جس سے ظاہر ہوگیا کہ انسانی فطرت میں کتنی زیادہ نفرت اور کتنی تھوڑی انسانی الفت موجود ہے اور یہ بلاشبہ ہماری موجودہ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کفایت شعاری، محنت، افادۂ عام کے لئے جوش کیونکر اِن عام نیکیوں سے باہمی قتل و غارت کے کام میں زیادہ توانائی پیدا ہو کر جنگ کی بلائے عظیم میں معتدبہ اضافہ ہوتا گیا مجھے ڈر تھا کہ شاید یورپی تہذیب فنا ہو جائے اور اغلب ہے کہ یہی نتیجہ ہوتا اگر جنگ ایک سال تک اور بڑھ جاتی۔ لوگوں میں وہ پہلا سا امن کا احساس جاتا رہا لیکن جو نصب العین ہمیشہ سے میرے سامنے تھے وہ میں نے نظر انداز نہ کئے۔ نوجوانوں میں سے اکثر نے مایوس ہو کر کلبیت واستہزا اختیار کر لیا ہے لیکن میں کبھی قطعاً مایوس نہیں ہوا اور اس لئے مجھے ہمیشہ یقین رہا ہے کہ بہتری کا رستہ ہنوز نوعِ انسان کے لئے کھلا پڑا ہے!

گذشتہ پندرہ سالوں میں جو کچھ بھی میں نے سیاسی معاشرتی اور اخلاقی مسائل پر لکھا ہے وہ سب اُس ہیجان کا نتیجہ ہے جو جنگ کے پہلے دنوں میں میرے دل میں اُٹھا اِس خیال سے کہ سیاسی ریشہ دوانیاں یا معاشی اسباب ہی جنگ کے ذمہ دار تھے میں متفق نہیں ہوں۔ میرے نزدیک جنگ کی زیادہ تر یہ وجہ ہوتی ہے کہ لوگ جنگ کرنا چاہتے ہیں اور پھر اپنے

آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جنگ اُن کے لئے مفید ہے۔ پس اہم ترین سوال یہ ہے کہ لوگ جنگ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ اِس کا جواب دینے کے لئے پہلے بہت سے اور مسائل کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے مثلاً ظلم وستم کا عام جذبہ اور اِس کی تاریخی ابتدا اور پھر نفسیات کا مطالعہ اور تعلیم کے نظریے کی جانچ پڑتال +

اِن مسائل پر غور و خوض کرنے سے مَیں نے اپنا ایک خاص فلسفۂ زندگی وضع کیا ہے اور اِس کام میں محض یہ خواہش میری رہنمائی کرتی رہی ہے کہ قدرت نے انسان کی فطرت میں جو خواص رکھے ہیں اُن کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی ایسا طریقہ تلاش کیا جائے جس سے لوگ آپس میں مل جل کر خوشی سے زندگی بسر کریں اور ایک دوسرے کی بربادی اور ذلّت کے درپے نہ رہیں۔ میرے معاشری فلسفے کا اصل الاصول نفسیات کی اہمیّت ہے اور یہ طرزِ خیال کہ معاشری ادارات کی اچھائی بُرائی کا اندازہ محض انسانی فطرت پر اُن کے اثرات کو دیکھ کر کرنا چاہئے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں تمام مشہور نیکیوں سے وہ کام لئے گئے جو میرے نزدیک لغو تھے۔ لوگ شراب صرف اِس لئے نہ پیتے تھے تاکہ وہ گولے بنا سکیں۔ وہ دن رات کام میں مصروف رہتے تھے تاکہ مہذّب سوسائٹی کو تباہ کر سکیں۔ حالانکہ فقط اِس سوسائٹی کے ہوتے ہوئے کام کا کوئی مصرف یا مُدعا ہو سکتا ہے۔ پوشیدہ امراض پہلے سے زیادہ بُری خیال کی جاتی تھیں محض اِس لئے کہ صحت پر اُن کے بُرے اثرات کی وجہ سے دشمنوں کو زیادہ تعداد میں قتل نہ کیا جا سکتا تھا۔ اِن سب باتوں کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اخلاق کے قواعد خواہ وہ کیسے اعلیٰ اور کتنے ہی کیوں نہ ہوں کبھی اعلےٰ نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک لوگوں کے آگے کوئی اعلےٰ نصب العین بھی موجود نہ ہو +

یوں "صلح پسند" ہونے کے باعث مجھے قوم کے مقاصد اور اخلاق کی طوعاً و کرہاً مخالفت کرنی پڑی حالانکہ مَیں اخلاق کا مخالف نہیں ہوں۔ میرا رویہ فقط یہ ہے کہ کسی قسم کے اخلاقی اصُول محبت کی جگہ کام نہیں دے سکتے اور جہاں محبت پُرخلوص ہو اگر وہ عقل کے دوش بدوش چلے تو وہ خود بخود ایسے اخلاقی اصول وضع کرے گی جو معاشرہ کے لئے ضروری ہیں۔ "محبت" کا لفظ کثرتِ استعمال سے فرسُودہ ہو گیا ہے پس ضرورت ہے کہ اس کا صحیح مفہوم قائم کیا جائے۔ غور کرو کہ جانوروں میں بھی دو قسم کے جذبے موجود ہیں کشش کا جذبہ اور خوف کا جذبہ۔ دونوں بقائے نسل کے لئے ضروری ہیں لیکن اِس قدر طویل ارتقا کے بعد ضرورت نہیں رہی کہ انسان اب خوف کے جذبے کو اُسی حد تک اپنی زندگی میں جگہ دے۔ اب اُسے بات بات میں وحشی جانوروں یا قدرت کی دوسری طاقتوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ سب سے خونخوار اور خطرناک جانور جس سے آجکل انسان کا پالا پڑتا ہے خود انسان ہی ہے۔ انسان انسان سے خوف کھاتا ہے اور اس کی وجہ محض خیالی خوف کا جذبہ ہے۔ مشہور ہے کہ بچاؤ کی بہترین صورت حملہ کرنا ہے پس لوگ اکثر دُوسروں پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں محض اِس لئے کہ انہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں دُوسرے اُن پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ اِسی خوف سے بے اعتباری اور نفرت اور حسد اور بُغض اور تمام اس قسم

کی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اُس طاقت و اختیار سے جو ہم نے اپنے علم کے ذریعے سے قدرت پر حاصل کیا ہے۔ ہم پُورا فائدہ اُٹھائیں تو لازم ہے کہ ہم اپنے خیالات و جذبات پر قابو حاصل کریں، بجائے غلام کے عاجزانہ اور غصہ آمیز خوف کے ہمیں اپنے نفس میں ایک آقا کی سی مطمئن خودداری پیدا کرنی چاہیئے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں کشمکش کے جذبہ کو بڑھانا اور مراجعت کے جذبے کو کم کرنا چاہیئے۔ طبیعیات کی ترقی سے اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اگر سمجھدار آدمی تعاون و تعامل سے کام لیں تو وہ تمام نوعِ انسان میں معاشی بہتری کی صورت پیدا کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی حکومت، کاروباری تنظیم اور ضبطِ تولید سے دُنیا ہر کہ و مہ کے لئے ایک آرام گاہ بن سکتی ہے۔ مَیں نہیں کہتا کہ ہر شخص قارون بن سکتا ہے لیکن ہاں ہر شخص کو دنیا کی اِتنی متاع مل سکتی ہے کہ اگر وہ سمجھدار ہو تو خوش رہ سکے۔ پھر جب غُربت و بیکسی کا مسئلہ حل ہو جائے تو انسان بآسانی تمدّن کے تخلیقی فنون میں منہمک ہو سکے، سائنس کی ترقی ہو، بیماریوں میں کمی ہو، موت کا التوا ہو اور اُن تمام ہیجانات کی نشوونما جن سے سچی خوشی پیدا ہوتی ہے۔ ایسے خیالات کیوں محض خیالی اور فضول معلوم ہوتے ہیں؟ اِس کی وجہ انسان کی اصلی فطرت کے اندر موجود نہیں۔ بلکہ اس کی وجہ ہماری روایات ہماری تعلیم اور ہمارے ماحول میں مضمر ہے۔ مثال کے طور پر بین الاقوامی حکومت کو لو۔ ہر شخص اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے لیکن قومی جذبات سدِّ راہ ہیں۔ ہر قوم اپنی آزادی پر فخر کرتی ہے اُس کے لئے مرنے مارنے کو تیار ہے۔ اجنبی قوموں کی طرف ہمارا رویہ نفرت و کنارہ کشی کا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اجنبی اپنے گھر میں اچھا آدمی ہوگا مگر وہ ہمارے گھر میں کیوں دخل دے۔ ثالثی کے عہد نامے، کیلگی صلحنامے وغیرہ یہ سب ٹھیک ہیں مگر ہر شخص جانتا ہے کہ آڑے وقت میں یہ کام آنے والے نہیں +

دنیا میں امن و سلامتی کا دور دورہ نہ ہوگا جب تک قوموں کے مابین بھی وہ قواعد نافذ نہ کئے جائینگے جو اب تک ایک ملک یا قوم کے اندر رائج ہیں یعنی کسی تنازعہ میں زور و قوت کا استعمال طرفین کی طرف سے نہ ہو بلکہ محض ایک ایسے غیر جانبدار کی طرف سے جو کافی تفتیش کے بعد مسلمہ قوانین کے مطابق اپنا فیصلہ صادر کرے۔ جب تک دنیا کی ساری فوجیں ایک عالمگیر حکومت کے تحت میں کام نہ کرنے لگیں دُنیا کی حالت نہ سُدھرے گی +

معاشی تنازعات کی وجہ بھی خوف ہے، طاقت حاصل کرنے کی خواہش فی الحقیقت خوف ہی کی ایک شکل ہے۔ مرد عورت کے تعلقات میں بھی مروجہ اخلاق خوف پر مبنی ہیں۔ مرد کو عورت پر، عورت کو مرد پر حقوق صرف اِس لئے دیئے جاتے ہیں۔ کہ بصورت دیگر اُن کے مال و جائداد کے کھوئے جانے کا کھٹکا رہے گا۔ اِس کا سبب رشک و حسد کا منفی جذبہ ہے نہ کہ محبت کا مُثبت جذبہ۔ یہی حال تعلیم کا ہے وہ مثبت جذبہ جسے تعلیم کا محرّک ہونا چاہیئے تجسّس ہے لیکن نوجوانوں کے تجسّس کی بات بات میں مثلاً مرد و عورت کے مسئلے میں، دینیات کے بارے میں، سیاسی خیالات میں بلا تامل سرکوبی کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ

امن و سلامتی کی مسلسل تلاش کا نتیجہ ہے اور یہ تلاش فضول خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ خوف فضول اس لئے ہیں کہ دُنیائے حاضر میں اگر ہم اپنی معاشرہ میں بے باکی اور عقل کو بیش از پیش داخل ہونے دیں تو وہ خود بخود امن و سلامتی پیدا کر دیں گی +

ایک بہتر و بلند تر دُنیا کا رستہ ہمارے سامنے کھُلا ہے۔ یہ کچھ تو اجتماعی سیاسیات میں سے اور کچھ انفرادی مساعی میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ سیاسیات میں سب سے اہم شے ایک بین الاقوامی حکومت کا قیام ہے اور یہ میرے خیال میں دولِ متحدہ کی حکومت کے عالمگیر ہونے سے عمل میں آسکتا ہے۔ فرد کے متعلق سوال یہ درپیش ہے کہ اُسے خوف و نفرت سے پاک و صاف کیا جائے اور یہ بات کچھ جسمانی اور کچھ نفسی امور پر مبنی ہے۔ دنیا میں بہت سی نفرت سوءِ ہضم اور غدود کے ناقص عمل سے ظہور میں آتی ہے۔ اور یہ جوانی میں جذبات کے دباؤ اور غلط ضبط کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی دُنیا میں جہاں نوجوانوں کی صحت کی کماحقہٗ نگہداشت ہو اور اُن کے زندہ ہیجانات کو اُن کی اور دوسروں کی صحت کا دھیان رکھ کر پھُولنے پھلنے دیا جائے۔ وہاں مرد اور عورتیں بہ نسبت حال کے زیادہ دلیر اور کم کینہ ور ہونگے +

ایسے انسانوں سے ایک بین الاقوامی حکومت کے ہوتے ہوئے دنیا اچھی مضبوط اور متمدن ہو سکتی ہے۔ اِس کے برعکس ہماری موجودہ نفسی حالت اور سیاسی تنظیم کے ساتھ طبیعی علوم کے ہر اضافے پر تمدن کی تباہی و بربادی قریب تر آتی جاتی ہے +

# تھیوڈور ڈرائیزر

(امریکہ کا ایک مشہور ناول نویس ہے)

مجھ سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ دُنیا اور انسان کے متعلق اپنا ایمان بیان کرو۔ یعنی بجائے مادّی کے (مَیں نہیں جانتا مادّی کیا ہے؟) ایک رُوحانی (کاش کہ مَیں یا کوئی اور بھی جانتا کہ اِس لفظ کے کیا معنی ہیں؟) آخری وصیّت کر دو!

اور چونکہ عمر بھر مَیں نے اِس امر پر اپنی عقل دوڑائی ہے کہ مَیں اِس دُنیا میں کیوں ہوں۔ نیز اپنی تمام سنجیدگی و متانت، جذبات، مساعی، اعتقادات اور اور الم غلّم جن میں مَیں وقتاً فوقتاً منہمک رہا۔ اِن سب کے (کم از کم میرے نزدیک) درد انگیز انجام پر غور کیا اِس لئے مَیں یہ کٹھن کام اپنے ذمے لینے میں تامل نہیں کرتا گو اس کا انجام محض لغویت ہے کیونکہ اے حاضرین و حاضرات! صاف صاف بات یہ ہے کہ مَیں متواتر انہیں باتوں پر غور کرتا رہا ہوں۔ زندگی کا معمّا، اس کا زائل ہونا، زندگی کا حُسن، ظلم و ستم، نزاکت، جہالت وغیرہ وغیرہ میرے خیالات زیادہ تر انہیں چیزوں سے متعلق رہے اور ادب سے یا غصے یا استہزا سے جیسا جیسا وقت یا حالت تھی مَیں نے غور کیا اور عالمگیر قوت سے بزور سوال بھی کیا کہ "کیوں"؟ لیکن اب مجھے

طبیعیات دان اور حیوانیات دان بتاتے ہیں کہ "یہ کیوں" ہو ہی نہیں سکتا بلکہ صرف ایک "کیسے"؟ کیونکہ جب ہم جان لیں گے "کیسے"؟ تو پھر یہ "کیوں" خود بخود حل ہو جائے گا +

لیکن باوجود اس سب کچھ کے اس وقت مَیں یہاں بیٹھا ہوں قلم میرے ہاتھ میں ہے اور مَیں ایسے موضوع پر جلد جلد کچھ لکھ رہا ہوں جس کے متعلق دراصل مَیں کچھ بھی نہیں جانتا اور لُطف یہ ہے کہ کوئی اور بھی اس کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتا سکتا اور پھر بھی جاننا چاہتا ہے کہ "کیوں"؟ یہ آسان ہے کہ مَیں کسی مذہب کی طرف مُنہ موڑوں اور سُن لُوں کہ خدا زندہ ہے اور مُسلّط ہے اور عقل وخیر کا مالک و منتہا ہے اور اگر ہم کافی منکسر المزاج اور متقی ہونگے تو وہ ہمیں ایک زیادہ شاندار دنیا میں پہنچا کر نجات دیگا۔ گو مَیں یہ سمجھنے سے بالکل عاری ہوں کہ اُس نے ہم جیسی غصّیلی اور لغو مخلوق کیوں بنائی یا وہ بے شمار کیمیائی اور طبیعی عمل جن سے ہم مرکب ہیں کیوں گھڑے اور پھر اس مخلوق کو نجات دینے کی ٹھانی۔ کیا بہتر نہ ہوتا کہ وہ کبھی پیدا کرنے کی تکلیف ہی نہ اُٹھاتا۔ تاکہ اِس طرح اُسے بھی ہمیں نجات دینے دلانے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑتی!

لیکن صرف یہی نہیں۔ مَیں صرف حیران نہیں ہوں بلکہ اُس خالق کی مخلوقات کی تعداد، اختلاف اور کثرت نے مجھے مبہوت اور گم صُم سا بنا دیا ہے یا اگر کوئی ایسا خالق نہیں ہے تو پھر طبیعیات دان اور کیمیا دان کی "بے ارادہ میکانیت" نے جو فقط موجود ہے اور مصروفِ عمل ہے لیکن بغیر عقل کے کسی ارادے کے، ایک نابینا لیکن بایں ہمہ غیر فانی توانائی جس کی قوتیں اور صفات انتہا درجہ حیرت انگیز ہیں لیکن جو قابلِ فہم ارادے سے قطعاً عاری ہے۔ ایک متمدن مکان یا موٹر کار میں بیٹھے ہوئے ایک متمدن بازار یا عمارت میں سیر ٹہلتے ہوئے، وہ کچھ دیکھتے ہوئے جو بظاہر ارادہ، سمت نمائی، تربیّتِ عقل ہے اور اَور کیا کیا صورتیں اور آلات جن سے حفاظت اور صیانت کی جاتی ہے اور تفریح اور تعلیم بھی دی جاتی ہے، مَیں نہیں کہتا کہ اِس خالق یا اس نابینا میکانیت کی تمام ایجادات بلکہ صرف ایک ——— انسان، اِسے دیکھ کر ہی کوئی کیوں نہ چیخ اُٹھے، بلکہ اصرار بھی کرے کہ یہ دیکھو ترتیب اور عقل یہاں مصروفِ عمل۔ بلکہ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ دیکھو یہ ہے ایک انتہا درجہ دانش مند عقل کا صریح کارنامہ، دانش مند لیکن کچھ نامہربان کہ کیا انسان کی اپنے اور اپنے ساتھیوں سے متعلق بعض مہمیں اور رزم نمائیاں (ساتھی اُس کی اپنی جنس کے یا دُوسرے) صاف ظاہر نہیں کرتیں کہ مہربانی یا ملاطفت گو ممکن ہے وہ ایک جنس کے فرد کی فطرت کا یا کم از کم دوسری جنس سے اُس کے تعلق کا ایک ذرا سا جزو ہو لیکن کُل ہرگز نہیں +

کیونکہ تم جلد دیکھ لوگے کہ یہاں انسانوں کے درمیان یہ چیزیں زور شور سے اور عجیب ترین بات ہے کہ عملاً جاری ہیں۔ کیا؟ ظلم وستم، حرص، خود پسندی، شہوات، پیٹو پن، جھوٹی شہادت، رشک اور نفرت اور اُن کی اُکسائی ہوئی لڑائیاں، قتل، نقصانات اور اموات اور اور صفات بھی جو ممکن ہے زیادہ قابلِ تعریف ہوں یعنی دوستی، اُلفت، تعریف و توصیف، خیرات،

فیاضی وغیرہ —— اگر واقعی یہ صفات عموماً انسانی نفس کی من گھڑت یا فریب دہ کارستانیاں نہیں یا عالمگیر "زندہ قوت" کی یا خون کی رَو کی یا جو کچھ بھی وہ ہے جو ہمیں اِن عجیب وغریب اور شاید ہمارے اپنے لئے قابلِ تعریف صورتوں اور شکلوں میں جن میں ہم اپنے آپ کو پاتے ہیں مصروفِ کار رکھتی ہے ۔ کیونکہ دوستو! (اور حق بات یہ ہے کہ مَیں خود حیران ہوں کہ مجھے لازماً اِس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ) مَیں زندگی کو نہ محض ایک بدلتے رہنے والا اور اس لئے کسی بات میں سمجھ میں نہ آسکنے والا مکمل فریب یا سراب سمجھتا ہوں بلکہ وہ قطعاً عارضی اور ہمیشہ بدلنے اور ہمیشہ اُڑن چھو ہونے والے اور زیادہ تر مضحکہ خیز اور لغو مفاد ایسے لغو جیسے مَیں نے کبھی نہ دیکھے نہ سُنے غرض زندگی ایسے ہی مفاد کی ایک انتہا درجہ حیرت انگیز بگل بازی —— اور یہ مفاد زیادہ سے زیادہ یہ کام دیتے ہیں کہ اُن سے یہاں بے شمار خود غرض، خودمست اور ظالم عضوی اجسام برقرار ہیں۔ جن کا تنہا اور مخصوص کاروبار ایک دوسرے کو مارپیٹ کر جینا ہے —— بس یہی اور صرف یہی ہے اُن کی زندگی اَور کچھ بھی نہیں۔ خواہ یہی ہو کہ ایک دُوسرے کے بال ہی نوچ ڈالیں بس فقط یہی!

کیونکہ انسان کا بجز اِس کے اَور مقصد ہی کیا ہے کہ دوسروں کو مارپیٹ کر کھائے اور پہنے اور مزے اُڑائے تھوڑا سا یا زیادہ؟ اور جب تم حیوانات اور نباتات کے دائرے میں جانکلو جس دائرے کا انسان اپنے حملہ و اندفاع کے وضع کردہ طریقے سے سمجھا جاتا ہے کہ مالک و مولیٰ ہے تو وہاں بھی کس قسم کا مقصد یا مقاصد نظر آتے ہیں؟ محبت؟ نسل کی افزائش یا فرد کی تولید کے لئے —— ہاں ضرور۔ لیکن اگر سوال فردِ جنس کی تولید کے سوا تمام دوسری جنسوں کے افراد اور تولید کا ہے تو —— ہرگز نہیں! اور یہ سمجھنا کہ کیسے یا کیوں —— تو اِس سے حاصل؟ بھلا کیا کسی کو علم ہے کہ انسان کے علاوہ کوئی اَور مخلوق بھی سمجھتی یا کچھ غور کرتی ہے؟

جو کچھ ہمیں صاف نظر آتا ہے وہ ہے صرف پیدائش اور موت —— کیمیائی اور برق طبیعیاتی عملوں کا ایک نتیجہ جس کا لے دے کر ہمیں خاک بھی علم نہیں۔ اور اِس کے علاوہ —— قتل و غارت، زندگی کو لقمہ بنائے ہوئے، فرد ہر دوسرے کو مارپیٹ کر زندہ و تابندہ اور نہ مرنے کا تمنائی ۔ اور پھر حُسن حُسن حُسن جو بجائے کسی اَور شے کے اِس باہمی اِس قطعاً سفاکانہ جنگ و جدال سے زیادہ نشو و نما پاتا ہے ۔ اور بااین ہمہ حُسن، حُسن، حُسن —— کم از کم انسانی نگاہوں میں یہ سارا عمل جمالیاتی نتائج ضرور پیدا کرتا ہے خواہ دورانِ عمل میں اِس حُسن کا اِتنا ظہور نہ بھی ہوتا ہو +

اِس کے برعکس اگر مَیں اِن باتوں سے مُنہ پھیر کر طبیعیات دانوں اور حیوانیات دانوں یا سارے سائنس کی طرف بھی رُخ کر لوُں تو مَیں فی الفور تقریباً اُتنا ہی حیران و مبہوت و ششدر ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ یہاں گو مَیں ایک ایسی دُنیا کو ضرور دیکھتا ہوں جس کے خیال نہ سہی دعوے جہاں تک ممکن ہے طبیعیاتی یا کیمیائی دُنیاؤں میں یا اُس تیسری دُنیا میں جو اِن دو کے ملاپ

سے بنی ہے یعنی حیاتیاتی دائرہ اِن میں جہاں تک ممکن ہے ثابت شدہ تجربوں پر قائم ہیں۔ تاہم مَیں دل ہی دل میں عین اُسی طرح جہالت میں ڈوبا رہتا ہوں۔ کیونکہ جیسا کہ مَیں کہہ چکا ہوں یہاں "کیوں" کوئی ہے ہی نہیں صرف ایک "کیسے" ہے اور اِس "کیسے" کی اوّلین بنیاد بھی معلوم نہیں۔ بلکہ اِس کی بجائے صرف ایک کیمیائی طبیعیاتی عمل ہے جس میں انتہائی مشاہدے اور تطابق کی ضرورت ہے لیکن جس میں یقین خاک نہیں کہ اِس کا نتیجہ سوائے "کیسے" کے ایک نہایت محدود علم کے اَور کچھ بھی نکلے گا ——— جس سے اگر کبھی کافی معلوم ہو بھی جائے تو بس یہی کہ "وہ کیوں" بالکل ملیامیٹ ہو جائے!

لیکن اب مجھے ذرا یہ کہنے کی اجازت دو کہ میرا مُدعا ضرورت سے زیادہ "اصطلاحی" ہو جانا نہیں ہے اور یقین جانو کہ مَیں اِس کی کوشش بھی نہیں کرتا رہا۔ بلکہ میرا ارادہ تو محض یہ ہے کہ مَیں ایک ایسی دُنیا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں جو میرے لئے فہم سے بالاتر ہے خواہ کوئی طبیعیات دان ہو یا نہ ہو خواہ کوئی حیاتیات دان ہو یا نہ ہو۔ اور جہاں تک ہیئت، تاریخ، جمادات، علم المعاشرت اِن کا تعلق ہے میری رائے یہ ہے کہ ہم تکتے ہیں یا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر چند قوانین اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بس۔ کیونکہ ہمارے پاس تو فقط ہمارے پانچ کمزور چھوٹے سے حواس ہیں اور ان کی مدد سے ہم گذشتہ پانچ ہزار سال سے برابر تفتیش کر رہے ہیں اور ڈینگیں مارتے ہیں۔ اور اِس سب کچھ کا معمّا اور جمالیاتی حُسن ہمیں سراب کی طرح اپنے پیچھے لئے چلا جاتا ہے۔ لیکن مجھے تو حیرت اِس بات پر ہے کہ انسان اپنی زندگی کی ہر گھڑی میں اَور بھی زیادہ حیرت زدہ اور ششدر کیوں نہیں ہو جاتا اور اپنی روزانہ ضروریات سے زیادہ کنارہ کش بھی کیوں نہیں ہو جاتا کہ بُدھ کی طرح ایک درخت کے نیچے آسن جما کر حیرت اور تحیّر سے ٹکٹکی باندھے ہوئے اپنے اردگرد کی قطعاً دُور از فہم دُنیا کو دیکھے اور دیکھتا رہے!

کیونکہ یہاں ہوں مَیں جیسا کہ مَیں تم کو بتا رہا ہوں نیویارک میں براڈوے اور "ستاونویں بازار" کے کونے پر۔ اور دُنیا یا کم از کم ہماری امریکی دُنیا کا ایک نمونہ میرے سامنے چلا جا رہا ہے ——— "بس گاڑیاں"، موٹر کاریں، آدمی، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں، اشرف المخلوق انسان جو قدرت کے مسرفانہ اور شاید عقل آمیز عملوں کے اندر کامیاب یا ناکامران ہوئے ہیں یا آدھے کامیاب یا آدھے ناکام رہے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو یہاں ہیں یہ! اور اب جو بات میں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ منظر بہ ہیئتِ مجموعی تاباں، پُر عجلت، دلچسپ اور پُر زور ہے۔ لیکن با ایں ہمہ پھر میں اپنے آپ سے پُوچھتا ہوں۔ "کس لئے؟" سوائے اِس کے کہ اِن میں سے ہر ایک فرد جو کام کی طرف، لطف اندوزی کی طرف یا فرائض یا نیکی یا گناہ یا کسی اَور شئے کی طرف اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ میں مصروف ہے۔ وہ اُس میں سے جسے وہ لطف و مسرّت سمجھتا ہے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتا ہے یہاں نہ کہ کہیں اَور، اور اِس خیال میں کبھی کبھی واقعی حاصل بھی کر لیتا ہے۔ لیکن یہاں ——— کے سوا یہ سب کچھ ہے

کس لئے ؟ اور کس بات سے اِسے کچھ تعلق ہو سکتا ہے ؟ ایک ممکن الوجود آیندہ حالت سے جو اِس سے قطعاً مختلف ہے ؟ ناممکن ! یہ مخلوق جو مَیں یہاں دیکھتا ہوں کسی ایسی قطعاً مختلف حالت کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ اِن کے تعلّقات اُسی سے وابستہ ہیں جو وہ یہاں دیکھتے سُنتے محسوس کرتے چکھتے اور سُونگھتے ہیں، یہیں نہ کہ کہیں اور ؟ ہاں مذہبی یا دوسرے نظریہ بازوں کے شور و غل سے ڈر کانپ کر وہ اُنہیں کچھ کھلاتے پلاتے رہتے ہیں مبادا اِس عجیب و غریب معما خانے میں جیساکہ یہ لوگ کہتے ہیں خدا یا شیطان یا کوئی مہتمم انسان کے اُوپر بیٹھا ہؤا یا گھومتا ہؤا شاید موجود ہی ہو ؟ اِس سب کچھ میں سب سے بڑی شے فنا کا ڈر ہے۔ کیونکہ یہاں ابھی ابھی ایک شخص تمہارے ساتھ چل پھر رہا ہے۔ وہ تنا ہؤا، ہوشیار، مضبوط، دلکش، زندہ ہے۔ اور ابھی ممکن ہے ذرا سی دیر میں ہی وہ تمہارے پاس سے ہمیشہ کے لئے کہیں چل دے اور پھر فوراً وہ خوفناک لفظ "مر گیا"۔ "وہ مر گیا" وہ زندہ تھا ابھی اور بس اب مر گیا یا مر گئی۔ وہ نگاہ، وہ مس، وہ آواز، وہ طبیعت، وہ فکر و خیال، وہ تجویزیں —— سب کا قطعی خاتمہ۔ ایک لفظ تک نہیں۔ ایک آواز تک نہیں —— اِن کا نام و نشان تک نہیں۔ وہ مضبوط اور بیش بہا وہ ہمیشہ حیرت میں ڈالنے والا جسم جسے تم جانتے تھے —— سب قطعاً ملیامیٹ۔ تم کھڑے ہو جاتے ہو —— مبہوت —— لیکن کوئی جواب نہیں۔ اِس کے متعلق سائنس اور مذہب کوئی کام کی بات نہیں بتاتے، سائنس ازلی تحلیل کی رٹ لگاتی ہے اور مذہب مستقبل کے کیف و کم کی کہانی سناتا ہے لیکن قطعی صداقت نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ اور پس ماندگان کے لئے نہ صرف تنازعہ اور مقابلہ اور خوف ایک ذرا سی مسرّت کے ساتھ حل کیا ہؤا +

### ایک خشک اعتقاد ؟

بس میرے پاس تو ایک یہی ہے جو مَیں پیش کر سکتا ہوں۔ یہی ہے جو مَیں نے از روئے عقل کبھی مانا ہو۔ آؤ اب ذرا اُن کیمیائی اور طبیعیاتی مرکبات اور عملوں کو دیکھیں جن سے اِس تاباں نظارے کے افراد اور حصص بنتے ہیں۔ اور کیا ہی معما ہے یہ، کہ یہاں ہم دیکھتے ہیں —— کیا ؟ اینٹیں، پتھر، شیشے، لکڑی، پلستر، رنگ روغن اور ارد گرد کی عمارات لیکن کن اشیا سے مرکب ہیں یہ ؟ بالآخر انہیں توانائی کے برقئوں (Protons and quantums) "مُثبتوں"۔ "کموں" سے جو "سالموں" اور "ذرّوں" کی تحیّر خیز اور پیہم متبدّل ترتیب میں شکل اختیار کئے رہتے ہیں اور جب پوچھو کہ انسان کیا ہے تو یہی جواب ملتا ہے کہ وہ بھی ایک مُبدّل ترتیب ہے اِنہیں سالموں، ذرّوں، برقئوں "مثبتوں" اور کموں کی۔ اور یہ سب کے سب بالآخر برقی النسل ہیں —— کسی نے خوب کہا ہے کہ خدا بھی برق ہی ہے۔ لیکن پھر کوئی پُوچھے کہ بھئی یہ برق کیا ہے ؟ "سالمے"۔

اور یہ "سالمے" کیا ہیں؟ برق
سبحان اللہ!

لیکن پھر میں یہاں براڈوے اور "ستادویں بازار" کے کونے پر ہنوز اس بھیڑ بھاڑ کو تکتا ہؤا کھڑا ہونگا اور پوچھونگا کہ یہ برق یا یہ اوّلین توانائی یا جو کچھ بھی اسے کہیئے کیوں اور کس لئے برقیوں اور مثبتوں اور کمّوں کے رستے سے سالمے اور ذرّے اور دانے بن کر اس عجیب و غریب مضطرب منظر میں تبدیل ہوئی؟ —— پتلیوں کا یا متحرک تصویروں کا ایک تماشہ؟ جس کے کیا معنی؟ زندگی میں چند لمحے اعتقاد؟ یا خوشی میں؟ خدایا! بچائیو! یہ ہیں اور بس یہی میرے سامنے اِس روشن دن میں اِس منظر کے معنی اور مجھے یہ بھلا لگتا ہے اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اب چلو ذرا افریقہ میں کانگو کے علاقے پر جا نگاہ ڈالیں جہاں انہیں برقیوں، سالموں، کمّوں کا ایک پھیلا ہؤا نظارہ ہے۔ وہاں بھی سب کام یا خوشی میں مشغول ہیں طوعاً و کرہاً —— زہریلے سانپ، موذی مکھی، مکڑا، خونخوار شیر اور شیر ببر ایسے زہریلے اور خونخوار کہ کسی مہربان طاقت کا خیال تک بھی پاس نہ پھٹکے۔ سب اُسی طرح، دوسروں کو مار پیٹ کر اور کھا نگل کر جینے والے۔ کتنی دیر تک؟ چند لمحے یا چند سال۔ اور اُس "کیوں" سے بالکل بے خبر سوائے شاید جنسیّت اور تعاقب اور بھوک اور سیری کی "کیوں" کے۔ یا یوں کہیئے کہ ایک "برقیئی" یا "ذرّئی" جہنم لیکن ترکیبی لحاظ سے بعینہٖ مطابق اُسی نیویارک کے نظارے کے یا حضرتِ پاپا کے جسم کے یا مہاتما گاندھی کے جس کے متعلق خیال ہے کہ اُس کے وجود سے سب کے لئے صرف ملاطفت و معاونت کے خیال جاری و ساری ہوتے ہیں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ زندگی ایک نہایت سخت اور خوفناک جنگ ہے جس میں کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے خوشی کی ایک سچی یا جھوٹی جھلک نظر آکر اِس مصیبت کو ذرا کم کر دیتی ہے اور یہی اِس باہمی جنگ و جدال میں سب کے لئے ایک لالچ ہے جو اُن کو ہمیشہ آگے کو لئے جاتا ہے۔ تو کیا یہ ہے وہ جس کے لئے کائنات قائم ہے؟ نہیں ہرگز نہیں لیکن ہماری اِس ذرا سی دُنیا میں تو یہی ہو رہا ہے۔ ایک اِسی فقرے پر غور کرو "خدا بادشاہ کو بچائے" اور پھر غور کرو دُنیا کے تمام گئے گزرے بادشاہوں پر۔ شہوات، خورونوش، تصنّع، تماشے، اوروں کی واہ وا —— میرے خیال میں تو یہی وہ اہم چیزیں ہیں جن سے دُنیا کو سروکار ہے +

مجھے انکار نہیں کہ یہاں دلکش خوبیاں بھی ہیں، رنگ رنگ کے پھول سایہ دار ٹہنیوں کے ساتھ، ایک سبز پہاڑی کی ایک بادامی رستہ جس پر غروبِ آفتاب کی کرنیں پڑ رہی ہیں، ایک دوشیزہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے نور کے تڑکے آسمان کو تکتی ہوئی، ایک سمندر سورج کی کرنوں سے سونے کی طرح چمکتا ہؤا، ایک خستہ چہرہ غم میں جھکا ہؤا ——

بس میں خوشی میں غرق ہو جاتا ہوں ——— آسمانی جنّتی خواب، اِن کے ہوتے ہوئے کیا میں ایسی کائنات کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس میں اگر لطف و رحم و دانشمندی نہیں ہے تو نہ سہی۔ اِس جمالیاتی اصول سے مجھے اطمینان ہے گو میں ساتھ ہی ساتھ زندگی کے بظاہر بے معنی مصائب سے پس بھی رہا ہوں ٭

میرا ہمسایہ کیا کرتا ہے؟ اُس کا نام کیا ہے؟ کام کیا ہے؟ شہرت کیسی ہے؟ وہ کہاں ہے؟ وہ کیا چاہتا ہے کہ میں کیسے کیا کچھ کروں؟ وہ مجھ سے زیادہ کامیاب ہے یا کم؟ وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے یا میں اُس سے؟ تعریف اُس کی زیادہ ہوتی ہے یا میری؟ یہ ہیں منظّم انسانی سالموں کی عقل کی کارنمائیاں۔ زبردست غیر فانی سالمے ہیں اور یہ ہیں اِن کے کردار و افعال کے نتائج!

لیکن باوجود اِس سب کچھ کے میں یاس پسند نہیں ہوں اور مجھے اِس امر کا اقرار بھی ہے کہ اِس دُنیا میں دلچسپی کا عنصر ضرور موجود ہے اور یہ بہ ہیئتِ مجموعی ایک مزیدار تماشا ہے گو ترتیب و تنظیم کی رُو سے اِس میں تضاد سراب اور طرح طرح کی دیوانگیاں بھی ضرور ہیں۔ بھلا ذرا لمحے بھر کے لئے قصابوں کی اُن دو کانوں پر تو غور کرو جو ہر کونے پر موجود ہیں جو قتلِ عمد کے ذریعے سے ریشمی لباس اور عطر لگانے والوں کی ہر گھڑی تواضع کرتے ہیں اور اُن کا جی خوش کر دیتے ہیں ٭

یہ میں مانتا ہوں کہ شاندار تعمیرات، خوشنما پھول، عظیم الشان پہاڑ، وسیع سمندر، ننھی آبجوئیں، سیمیں جھیلیں، جنگلوں کی گنجان خاموشی، پرندوں کا گیت، اُلفت و محبت حُسن کی یہ ہزاروں صورتیں، زندگی کی وحشت و بربریت پر اپنے رنگ رنگ کے آنچل ڈالتی ہیں لیکن پھر اس آرائش و زیبائش میں مثلاً توہمات کی کیچڑ اور اُس کی بدصورتی ملاحظہ کرو کہ جو کسی کے خوف یا جہالت نے اُسے دکھا دیا وہ اُسے اپنے زور شور میں دوسروں کے آگے زندگی کا معمّا سمجھانے کو لے آیا ٭

میں تو اپنے آپ کو ایک بڑی مشین کا ایک چھوٹا سا سالمہ سمجھتا ہوں۔ جب میں مر جاؤں گا تو میں ذرا ذرا سے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاؤں گا۔ شاید پھر میں عالمگیر قوت کا ایک جزو ہو جاؤں لیکن کہیں بالکل گھلا ملا اور ہمیشہ کے لئے ملیامیٹ! اور میں چاہتا بھی نہیں کہ جیسا میں یہاں ہوں اُس شکل میں میں جئے جاؤں۔ میرا ایمان تو فقط یہ ہے کہ اپنے کام یا اپنی زندگی کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا جس سے کوئی دلچسپی یا جس کی کوئی بھی سُود مندی ہو۔ زندگی میرے نزدیک فقط مُبہم قوتوں کا ایک بے معنی کھیل ہے جس کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے۔ مختصر یہ کہ جو کچھ میں نے اِس دُنیا میں دیکھا ہے اُس سے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور میں جیسا حیران و مبہوت یہاں آیا تھا ویسا ہی حیران و ششدر یہاں سے چلا جا رہا ہوں۔ اخیر میں چند نظمیں جو میں نے اپنی مختلف ذہنی حالتوں میں لکھیں پیش کرتا ہوں:۔

ایک ہے "من کی موج":۔

سُورج اور پھُول اور چوہے اور بادشاہ۔

فوجیں اور برقے ۔
مُرشد اور کیڑے ۔
ہیضے کے جراثیم ۔
سینٹ فرانسس کی دُعائیں اور خواب ۔
شیلے گاتا ہوا ۔
لاندرو اپنی بیس بیویوں کو قتل کرتا ہوا ۔
بُدھ ۔
اور مارکوئس دَساد ۔
دس ہزار کروڑ
قاتل اپنی کوٹھڑیوں میں بند ۔
یا باہر سرگرداں ۔
اور دس لاکھ شہدآ اور اولیاء
گاتے ہوئے اور مصروفِ عبادت ۔
نیرو، میسیناز، کان گراند
اور میرے دروازے پر آبدیدہ سائل ۔
دو کوڑی مانگتا ہوا ۔
اور ثریّا
اور
یہ تیز رو شعلہ
جس کے ہوتے مَیں لکھ رہا ہوں ۔
اور فضا ۔
اور یہ چھوٹی سی گیند ۔
جس پر ہم گھوم رہے ہیں ۔

تاہم مَیں پوچھتا ہوں اور پوچھتا ہوں اور پوچھتا ہوں ۔
مَیں عبادت کرتا ہوں —— خدا کی قسم ——
جھک کر ۔
مَیں دعا میں اپنے ہاتھ اُٹھاتا ہوں کہ مجھے کچھ پتہ چلے ۔
پھر بھی تُو جواب نہیں دیتا ۔
یا
دینا نہیں چاہتا ۔
یا
دے نہیں سکتا ۔
لے اب ،
اب پھر ،
مَیں تجھ سے منّت کرتا ہوں ۔
مَیں تجھے بلند آواز سے پکارتا ہوں ۔
بول ، تُو بول !
کیا تُو ہنسی اُڑاتا ہے ؟
تصنّع کرتا ہے ؟
خواب دیکھ رہا ہے ؟
غصّے میں ہے ؟
کیا تُو بھی میری طرح
مجبُور و بیکس ہے ؟
کیا تُو جانتا ہے ؟
تجویز کرتا ہے ؟
لرزتا ہے ؟

چاہتا ہے ؟
کیا تُو گرتا پڑتا ہے ؟
خواب دیکھتا اور حیران ہو جاتا ہے ؟
کیا تُو نفرت کرتا ہے ؟
محبّت کرتا ہے ؟
رشک کرتا ہے ؟
خوش ہوتا ہے ؟
آہ بھرتا ہے ؟
آخر، مرجاتا ہے ؟
میری ہی طرح ؟
تُو بھی ؟
اے تُو سُورجوں اور پھُولوں اور چُوہوں اور بادشاہوں کے جوہر !

دوسری نظم ہے "جواب کے لئے" یُوں :-

تاریکی،
بارش،
ہوا،
اور یہ سرد منجمد نِدامتیں،
جو اِس وقت،
میری رُوح
کے اندر،
باہر،
میری زندگی کے دروازے،
اُس کی بے وقوفیوں

اُس کی شکستوں کے خلاف ۔
چیختی چلاتی اور واویلا کرتی ہیں ۔
اور پھر ،
اِس مصیبت کے خاتمے پر ،
نہ یہ بارش ،
نہ سُورج ،
نہ دل کی لہر ،
نہ اُمید ،
نہ درد ،
نہ زندگی ——
پھر مَیں کہاں ——
پھر مَیں کہاں ——
دوبارہ
اپنے دل کو اُس کی دھڑکن ،
اپنی رُوح کو اُس کا اپنا آپ ،
اپنی زندگی کو اُس کی حرص دکھانے کے لئے ،
پھر مَیں کہاں ،
پھر مَیں کہاں پاؤنگا
یہ بارش
یا ہوا
یا تاریکی
یا دِل کی لہریں
یا فضول ندامتیں

کہ اُکسائیں
اور ماتم کریں
اور چیخیں چلائیں
اور مجھے زندہ بنا دیں ؟
اور آخری نظم "متعلق" ہے یوں :۔
دھڑکتے ہوئے تعلقات
کا یہ شیریں لمحہ ،
یہاں ——
اب ——
پرندے ،
چٹان ،
پھول ،
درخت ،
جانور ،
بارش ،
خاموشی ،
آواز ،
گرمی ،
سردی کے لئے ——
یہ رفاقت
یہاں اور اب
ہوا
اور سورج

اور سمندر،
گیہوں،
طاقتوں کے ساتھ ——
تنوّع
اور کامل توازن میں
یہ مکمل پن،
لمحہ بہ لمحہ،
کُل کے ساتھ اتحاد کا احساس،
ساعت بہ ساعت،
نسل بہ نسل؛
یہ بدلتی ہوا
اور پھر بھی نہ بدلتا ہُوا حُسن،
ناٹک۔
یہ ایک دوسرے کو جواب،
تم ——
مَیں ——
تمام جامد یا متحرک
چیزیں،
خوشی میں،
درد میں،
جوش میں،
مایُوسیوں میں،
ہر ایک اور سبھی،

جیسے کسی راگ میں ،
جیسے کسی ماتمی گیت میں ،
جیسے کسی فخریہ نعرے میں ،
جیسے کسی دُکھ کی بڑی سِسکی میں ،
یا بے اعتنائی کی آہ میں ،
یا مقابلے میں ؛
تم ،
مَیں ،
تمام چیزیں ——
کس مستقبل کی طرف ؟
کس ہمیشگی میں ؟

اپنے اِس اعتقاد بلکہ عدمِ اعتقاد پر مَیں سب سے عذر خواہ ہوں لیکن با ایں ہمہ اپنا سلام نیاز پیش کرتا ہوں ۔

**بشیر احمد**

(باقی)

تسلّی سعی میں مضمر ہے نہ کہ تحصیل میں۔ مکمل سعی مکمل فتح ہے۔ (گاندھی)

جو شخص کچھ کر سکتا ہے کرتا ہے جو کچھ نہیں کر سکتا وہ تلقین کرتا ہے ۔ (برنارڈ شا)

ایثار ذاتی آزادی کا سب سے بڑا ثبوت ہے ۔ (کالنز رلنگ)

کسی قسم کا اطمینان جو خود فریبی پر مبنی ہو پائدار نہیں ہو سکتا (برٹرنڈ رسل)

# نازکی نیازمندی

لو، آگیا وہ دعوتِ ایماں لئے ہوئے
شانوں پہ کفرِ زلفِ پریشاں لئے ہوئے

رفتار، شاخِ گل کا مٹاتی ہوئی غرور
بانہیں جمالِ خنجرِ عریاں لئے ہوئے

انگڑائیوں سے، دل کی گرہ کھولتا ہوا
موجِ نفس میں چشمۂ حیواں لئے ہوئے

بکھرائے مصحفِ رخِ رنگیں پہ کاکلیں
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لئے ہوئے

ہر اک قدم پہ گوئے دو عالم سے کھیلتا
گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لئے ہوئے

قامت میں دلفریبیٔ سروِ چمن نژاد
سروِ چمن میں دولتِ بستاں لئے ہوئے

بادِ شمال و ابرِ خراماں و موجِ گل
ہر آب و رنگِ عالمِ امکاں لئے ہوئے

رک جائے جس کے سامنے طغیانیوں کی سانس
چہرے پہ وہ شباب کا طوفاں لئے ہوئے

دستِ حنا نواز میں باوصفِ نازکی
عشقِ زمانہ سوز کا داماں لئے ہوئے

رخسار میں جلائے ہوئے شمعِ اختلاط
آنکھوں میں التفاتِ فراواں لئے ہوئے

شیریں لبوں میں حرف و حکایت کے ولولے
چشمِ سیہ میں دید کا ارماں لئے ہوئے
شوخی پہ رازِ عشق کی سنجیدگی کا بار
سنجیدگی میں پرتوِ یزداں لئے ہوئے
چہرے پہ صبحِ عشق و جوانی کی سرخیاں
آنکھوں میں شامِ خوابِ پریشاں لئے ہوئے
جادو بھری نگاہ میں اک داستانِ غم
غم کی جِلو میں گردشِ دوراں لئے ہوئے
آنکھوں میں عزمِ جامہ دری، دل میں خوفِ خلق
پلکوں میں پارہ پارہ گریباں لئے ہوئے
جاں بخش و دلفریب زلیخائیوں کے ساتھ
تابِ جمالِ یوسفِ کنعاں لئے ہوئے
دل کی کھٹک کے ساتھ اٹھاتا ہوا قدم
ماتھے پہ دودِ آتشِ پنہاں لئے ہوئے
مژگاں کی لرزشوں میں، لبوں کے خطوط میں
صد پیچ و تابِ وقفۂ باراں لئے ہوئے
ژولیدگیٔ کاکلِ عنبر سرشت میں
شرحِ درازیٔ شبِ ہجراں لئے ہوئے
لہجے میں چوٹ کھائے ہوئے دل کی کروٹیں
آواز میں خراشِ رگِ جاں لئے ہوئے
خود دوش پر اٹھائے ہوئے کائناتِ درد
ہر دردِ کائنات کا درماں لئے ہوئے

نازِ جمالِ یار ہے لب تشنۂ نیاز
اٹھ، جوش، اٹھ، متاعِ دل و جاں لئے ہوئے

جوش

# بُلبُلہ ہے پانی کا

کیا بلبلے کا ماضی کیا اس کا مستقبل مگر پانی میں بُلبُلے بنتے رہتے ہیں ٹوٹتے رہتے ہیں بعض فوراً ٹوٹ جاتے ہیں بعض کچھ دیر تیز سے تیز لہر پر سواری کا لطف اٹھاتے ہیں، سورج کی کرنوں کا رنگین جام بنتے ہیں، دیکھنے والی نگاہوں کے لیے مقناطیس بن کر شاعری کرتے ہیں اور یہ سلسلہ جب تک کہ پانی ہے، سورج ہے اور نگاہیں ہیں غیر فانی ہے۔ دنیا میں بُلبُلوں کا کال نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔

خود پانی کو کچھ علم نہیں مطلقاً پروا نہیں کہ کتنے بُلبُلے بنے، کہاں بنے اور کیسے رہے، کتنی دور چلے اور کیونکر مٹے مگر بُلبُلہ مجبور ہے کہ یہ سمجھے کہ دریا اس کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس سرنگوں تہی مغز کی زندگی کے سحر کا مدار اسی اُلٹی سمجھ پر ہے۔ اس اُلٹی سمجھ، اس تاریک وحشیِ طبع، اس بلا کا ترجمان بننے کی ہوس بھی اسی بُلبُلے میں ہے۔

ہاں تو اے اپنے آپ کو معیار مقرر کر کے سمندروں اور آسمانوں کو ناپ ڈالنے والے بُلبُلے سُن! تیری غلطیوں پر تیری الٹی سمجھ پر ہزار ہستی نثار ہے۔ تو دنیا کی آنکھ ہے، تو نہ ہو تو دنیا اندھی بانجھ ہے اور کیوں تو یہ سب کچھ نہ ہو؟ کیا یہ مسلّمہ نہیں کہ ہر ہستی کا مورثِ اعلیٰ کوئی نہ کوئی بہتان ہے۔ اے بُلبُلے! تو خود اپنے آپ پر بہتان ہے اور یہی تیری شان ہے۔

سُن! اس سرنگوں تہی مغزوں کی ذاتیں گن۔ ایک ذات وہ ہے جسے جوگن کہتے ہیں۔ جوانی میں حسین اور اگر اصلی ہو نقلی نہ ہو تو بڑھاپے میں بھی حسین اور خوش ادا۔ اس بُلبُلے کو راکھ سے اور راگ سے پیار ہے۔ جو اسے چاہے وہ پہلے راکھ بنے پھر اچھے راگ کی طرح خاموشی میں ختم ہو جائے۔ یہ بُلبُلہ اب کمیاب ہے وہ دریا نہیں بہتے جن میں یہ بُلبُلہ بنتا تھا، بہتا تھا اور ٹوٹتا تھا۔ ایک ذات وہ ہے جسے ہیلن ہومر کے یونان والی (Helen) کہتے ہیں یہ ہمہ تن تبسم بُلبُلہ اب عام ہے۔ گھر گھر اس رانی کا راج ہے۔ یہ بُلبُلہ بھی مٹتا رہتا ہے مگر یہ ذات مٹائے نہیں مٹتی، سمندر میں، دریا میں، ندی میں، موری میں سب جگہ اس ذات کا زور ہے جو نہیں ہیں وہ بھی ہیلن بننا چاہتے ہیں۔ نازک بُلبُلوں کی طرح بڑے بلبلوں میں بھی ایک ذات بدھ ہوا اور ایک ذات بائرن۔ آج کل بدھ کمیاب ہیں بائرن ٹکے سیر بکتے ہیں۔

اے بُلبُلے! تو اپنی ذاتیں نہیں گنواتا؟ تیری خوشی مگر ابھی تو اور بہت ذاتیں ہیں مثلاً چنگیز، ملک التجار، ڈاکو، پیر، درندے، حاکم، سانپ، ایڈیٹر، ان ذاتوں کا قصہ چھوڑا، تیرے رنگ بھی چھوڑے مگر تیری رنگ رلیاں کیسے محو ہوں۔ اے بُلبُلے! بیزار نہ ہو۔ تو ہزار بُرا ہو مگر اپنے دریا سے بہتر ہے کیونکہ تجھے کہانی کہنے اور سننے کا شوق ہے۔ لے ایک ہلکے سے بلبلے کی سوانحمری سُن۔ خود اپنے خط میں لکھتا ہے

"پیاری! مجھ سے آزادمنش کے لئے ہر وقت زندہ رہنا بھی اک گونہ مجبوری ہے اس لئے کبھی کبھی میں مر بھی جاتا ہوں یعنی جان بوجھ کر تجھے یاد نہیں کرتا، تیرا خیال نہیں کرتا اور وہ کرتا ہوں جو تجھے ناپسند ہے۔ یہ میرا مردہ بے انتہا خوار ہوتا ہے عقل کی باتیں کرتا ہے، دور اندیشی کے سوانگ بھرتا ہے، لوگوں کو نیک مشورے کبھی قومی خدمت کے کبھی علمی وقار کے کچھ تحریروں میں کچھ تقریروں میں پیش کرتا رہتا ہے۔ اگر اس حالتِ مرگ

کی سوانح نگاری شروع کر دوں تو تُو سمجھے کہ روزانہ اخبار ہے قصہ مختصر اس ببرے مُردے سے وہ وہ کام ہوتے ہیں جن کا ہر مسلمان کو دعویٰ ہے اور کسی مسلمان کو توفیق نہیں۔ مگر پیاری جب ہم اور تم دونوں ہوتے ہیں تو یہ دقیانوسی دنیا ایک نرالی دنیا بن جاتی ہے۔ تم نئی سے نئی بات کہتی ہو میں پرانی سے پرانی ہاں ملا دیتا ہوں۔ تم کہتی ہو کہ Love (محبت) بیہودگی ہے میں کہتا ہوں کہ اس میں کیا شک ہے۔ تم کہتی ہو کہ مذہب ایک قطعی غیر ضروری وبال ہے میں کہتا ہوں کہ مذہب ایک ضروری وبا ہے۔ اگر دنیا میں ایک ہی خدا کو پوجنے والے ایک دوسرے کے لہو سے یوں ہاتھ نہ رنگتے تو ہم بُرا کسے کہتے؟ شکر کرو کہ ابھی تک مذاہب کا سرکس چل رہا ہے۔ جب تم چُپ ہوتی ہو تو تمہیں چھیڑنے کے لئے وہی پرانی بات کہہ دیتا ہوں کہ اگر قدرت سے جُوا کھیلنا ہے اور اسے ہرانا ہے تو صبح سویرے اُٹھو اور نماز پڑھو نماز تمہاری جبلی کمزوری ہے۔ نہ مانتے ہوئے بیسیوں پڑھ ڈالتی ہو۔ جب تمہاری طبیعت حاضر ہوتی ہے تو تم کہتی ہو کہ شیطان کو نماز کا حامی اب پہلی دفعہ پایا۔ میں کہہ دیتا ہوں کہ پیاری یہی تو میری جدّت ہے کہ شیطان انسانوں کو گمراہ کرتا ہے میں شیطان کو گمراہ کرتا ہوں اور اُسے مجبور کرتا ہوں کہ وہ لوگوں سے نیک کام کرائے۔"

اے بُلبُلے! اور کیا سناؤں؟ یہ قصہ یہیں تک ہے' یہ دونوں بُلبُلے مٹ گئے۔ اے بُلبُلے اب کیا میں تیری خاطر جھوٹ بولوں؟ واقعی یہ دونوں بُلبُلے مٹ گئے۔ ان کو بُرا کہنے والے بھی مٹ گئے بعض غصہ سے پھٹ گئے بعض رشک سے مٹ گئے۔ یہ دونوں تو ایک دوسرے کو دیکھنے بھی نہ پانے تھے کہ ختم ہو گئے۔ اے بُلبُلے یہ مانا کہ جھوٹی کہانی دلچسپ ہو تو غیر دلچسپ سچی کہانی سے بہتر ہے مگر میں اس سچ کو جھوٹ کیسے کر دوں۔

اے بُلبُلے! تعجب تو یہی ہے کہ تیری نوع کے قصے لمبے ہیں عمریں چھوٹی ہیں۔ پیدا ہونا گویا مرنے کے برابر ہے اور اس پر یہ لمبے لمبے قصے اور قصوں سے دراز تر غصے۔ کیا تو نے وہ غیظ و غضب کی داستان سنی ہے جو ایک خودپسند خودپرست بُلبُلے کے متعلق ہے۔ یوں تو سب بُلبُلے خودپسند خودپرست ہوتے ہیں مگر یہ جوشیلا بُلبُلہ مذہب کے نشہ میں چور فصاحت کا پتلا تھا جس سے اختلاف ہوا اسے بدنام کر کے چھوڑا۔ جب بدنام ہونے پر بھی بعض بُلبُلے چلتے پھرتے رہے تو اس جوشیلے بُلبُلے کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ پانی سے آگ ہو گیا پھر کیا؟ وہی ہوا جو بُلبُلے کی قسمت میں روزِ ازل سے لکھا ہے۔

"آدمی بُلبُلہ ہے پانی کا" جس شاعر نے یہ مصرع لکھا محض آدمی کی خوشامد کی ورنہ کہاں بُلبُلہ کہاں آدمی۔ مٹنے میں دونوں برابر ہیں۔ "اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے"۔ مگر بُلبُلہ بُلبُلے کو کاٹتا نہیں' ڈستا نہیں' لوٹتا نہیں' مارتا نہیں۔ آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے۔ کیا یہی اس کا شرف ہے؟ "آدمی بُلبُلہ ہے دوزخ کا" اگر کہا ہوتا تو قدرے تعلّی کم ہوتی۔

اے پانی کے بُلبُلے! تیری معصومیت سے متاثر ہو کر وہ شُبہ جو میرے دل میں ہے زبان پر لاتا ہوں۔ مجھے یہ شُبہ ہے کہ ناری ہوتے ہوئے بھی یہ دوزخ کا بُلبُلہ ناری نہ رہے گا نوری بن جائے کیونکہ تیری کچھ کچھ جھلک اس میں ضرور ہے۔ جو تجھے دیکھے گا جو تجھے چاہے گا وہ میرے ان الفاظ کو کبھی نہ بھولے گا۔

# یاد

کلفت میں بھی بہانۂ راحت ہے تیری یاد
دوزخ میں بھی مرے لئے جنّت ہے تیری یاد
پھر روتے روتے یاد ہنسی آ گئی تری
تاریک دل میں نورِ مسرت ہے تیری یاد
حرص و ہوس کی گرد سے دل صاف دُھل گیا
روحِ صفا و جانِ لطافت ہے تیری یاد
دل سے فسانۂ غمِ عالم بھُلا دیا،
سحرِ وفا، فسونِ محبّت ہے تیری یاد
کس سنگِ سخت سے گہرِ مدعا ملا،
خوش ہوں کہ حاصلِ غمِ فرقت ہے تیری یاد
میں دو جہاں بھی کھو کے نہ بے مایہ ہو سکا
اے روحِ دو جہاں مری دولت ہے تیری یاد
گویا بسی ہیں اِس میں دو عالم کی راحتیں
یہ کیا طلسم خانۂ حیرت ہے تیری یاد
یہ آ گئی تو دل میں نہ کچھ بھی ٹھہر سکا،
دنیا و دیں کی یاد کی رخصت ہے تیری یاد

پایا تجھے تو غایتِ ہستی کو پا لیا
آئینِ دو جہاں سے فراغت ہے تیری یاد

میں اک قدم بھی ہٹ نہ سکا راہِ راست سے
آخر کھُلا کہ راہِ سلامت ہے تیری یاد

بے لُطف ہے فسانۂ ہستی ترے بغیر
اِس زندگی کی اصل و حقیقت ہے تیری یاد

ہر بزم میں ہے ذکر ترا اور زباں مری
ہر روز ایک تازہ حکایت ہے تیری یاد

میرا سیاہ خانہ تو شایانِ ذکر کیا
جنّت بھی ہو تو اُس کی بھی زینت ہے تیری یاد

جب تُو نہیں تو پھر یہ غمِ جاوداں ہے کیا
خالق سے زندگی کی شکایت ہے تیری یاد

جیسے غمِ ازل سے مرا دِل مراد ہے
دردِ ابد سے یوں ہی عبارت ہے تیری یاد

مجھ سے الم نصیب پہ اور یہ نوازشیں
مہر و وفا و لطف و مروّت ہے تیری یاد

حامد علی خاں

# رباعیات

اٹھتی نہیں اب خلش کی مجھ سے تدبیر
اک درد سا سینے میں پرا دے تیر
کیوپڈ مری جان! مری محبت کے خدا!
اک بار مرے دل سے جب آ کے کھینچ تیر

کیوں چھیڑنے مجھے بار بار یاد آتے ہو
کیوں پھرے دل میں ایک جھلک دکھا جاتے ہو
اک میں ہوں کہ کھو چکا ہوں اپنی ہستی
اک تم ہو کہ پھر بھی مجھ کو پا جاتے ہو

ساقی مجھے اس شراب کا ساغر دے
اک پل میں غموں سے جو اٹھا دے پردے
تاریک ہے مدتوں سے دل کی دنیا
اے چاند! اے چاند! اس کو روشن کر دے

وہ ناز سے جو میرے سر کو ٹھکرا جاتے ہو
آہستہ دل و جگر کو بہلا جاتے ہو
جس چیز کی مدتوں تمنا کی ہے
اے جانِ ندیم اسی سے شرما جاتے ہو

ندیم

# قلوبطرہ

## انطونی کو اُس سے محبّت تھی یا اُس کی دولت سے؟

"قلوبطرہ سے شاعروں کو اس لئے دلچسپی ہے کہ شکسپیئر نے اس کی کہانی لکھی۔ عورتوں کو اُس سے اس لئے دلچسپی ہے کہ دنیائے عشق کی ساری تاریخ میں اس درجے کی عورت اور کوئی نہیں ہوئی۔ تاریخ کے طلبہ کو اُس سے اس لئے دلچسپی ہے کہ کوئی دو تاریخ نویس اس کی نسبت متفق الخیال نہیں ہیں۔ ماؤں کو اُس سے اس لئے دلچسپی ہے کہ وہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتی تھی۔" وہ اپنے موٹے تازے بچے کی پرورش خود کرتی تھی۔ وہ صرف اُس وقت مایوس ہوئی اور اُس نے اس وقت خودکشی کی جب اُسے معلوم ہوا کہ مصر کا تخت اُس کے لڑکے ـــــ جولیس سیزر کے بیٹے کے لئے محفوظ نہیں ہے۔"

اپنے بچوں کی تربیت، شاندار تقریبوں کا انصرام، جنگی جہازوں کی سربراہی، انطونی یا سیزر دونوں میں سے کسی ایک کے پہلو میں بیٹھ کر روم کی قیصرہ اور مصر کی ملکہ بننے کی امید کرنے والی قلوبطرہ ایک زبردست فرمانروا خاتون تھی۔

جیسا کہ عورتوں کی زندگیوں میں اکثر ہوا ہے قلوبطرہ بھی مردوں کی غلطیوں کا شکار ہوئی۔ اُس پر یہ الزام ہے کہ اُس نے انطونی کو اُس کی نیک سیرت رومن بیوی سے جدا کرکے بالکل تباہ کر دیا، اور سیزر کو بھی تقریباً تباہ کرکے چھوڑا۔ مسٹر آرتھر وائیگال جنہوں نے قلوبطرہ کے عہد اور زندگی کے متعلق ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی ہے بتاتے ہیں کہ سیزر نے خود قلوبطرہ کا پیچھا کیا۔ فیریرو جو ایک صاف گو اور سلیم الطبع مورخ ہے لکھتا ہے کہ انطونی بھی خود ہی قلوبطرہ کے درپے ہوا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اُس کی بے حساب دولت اور زبردست بیڑے کی مدد سے روم پر قبضہ کرلے۔ دولت اور جہاز اسے مل گئے لیکن ایک اور رومی جس کا نام آگسٹس تھا اس کے لئے حریفِ غالب ثابت ہوا۔

مسٹر وائیگال کی کتاب میں انطونی اور سیزر کا حال پڑھتے ہوئے ہمیں پاسکل کی یہ سطور یاد آجاتی ہیں:۔

"انسان کیسی عجیب مخلوق ہے! ایک اچنبھا، ایک موضوعِ تناقض و تعجب! ہر چیز کو جانچ لینے والا، زمین کا ایک حقیر کیڑا صداقت کا امین، شک اور گناہ کا پیکر، کائنات کی شوکت و عظمت اور پھر خود ہی کائنات کے لئے ننگ و عار"

اِسی سنجیدہ فرانسیسی مصنف نے ایک اور عجیب خیال ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "اگر قلوبطرہ کی ناک ذرا چھوٹی ہوتی تو ساری دنیا کا نقشہ بدل جاتا۔" قلوبطرہ کی ناک لمبی تھی جو عام طور پر قوت اور ذہانت کی نشانی ہے۔ چھوٹی ناک اس کے حسن میں تو اضافہ

کر دیتی لیکن اس کی عسکری سرگرمیوں میں کوئی کشش باقی نہ رہتی۔

مسٹر وائیگال نے قلوبطرہ کی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کو اس نوجوان خاتون سے ملنے کی خواہش ہوتی تھی باوجود اس کے کہ اُس نے اپنے بھائی اور اَور بہت سے اشخاص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سیزر اور انطونی دونوں کی عمر اس کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ قلوبطرہ کی عمر اس کے دلچسپ عہدِ حکومت کے آغاز کے وقت چودہ سال کی تھی جب اُس نے اور انطونی نے خودکشی کی تو اس وقت انطونی کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور قلوبطرہ کی صرف انتیس سال۔ سیزر جس کا انتقال اس سے کچھ عرصہ پہلے ہو چکا تھا انطونی سے بھی بڑا تھا۔

مسٹر وائیگال نے مصر کی اس عجیب و غریب ملکہ کو "نسوانیت کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے" اعلیٰ سے اُن کا مطلب یقیناً قلوبطرہ کے عہد کے لئے ہے، اگرچہ بعض لوگ اس خیال سے متفق نہیں ہوں گے۔ وائیگال کے بقول "قلوبطرہ کی رگوں میں مشرقی خون کا ایک قطرہ بھی نہ تھا" وہ مقدونیہ کے ایک یونانی خاندان سے تھی جس کی ابتدا اسکندرِ اعظم کے اُس جرنیل سے ہوئی جس سے بطلیموس پیدا ہوا اور جو قلوبطرہ کے زہر کھا لینے پر ختم ہو گیا۔

پلوٹارک کہتا ہے کہ قلوبطرہ کا حسن "ایسا نہ تھا کہ اس کی مثال نہ مل سکتی ہو، بلکہ ایسا بھی نہ تھا کہ ہر ایک کو متاثر کر سکے" اُس کی رائے میں آگسٹس کی بہن آکٹویا جس کے ساتھ انطونی نے شادی کی تھی اور جسے پھر قلوبطرہ کے لئے اس نے طلاق دے دی قلوبطرہ سے زیادہ حسین تھی لیکن نہ اس کے پاس دولت تھی، نہ تخت، نہ جہاز، نہ فوجیں۔ دوسری طرف ڈائن کیسیوس قلوبطرہ کی نسبت کہتا ہے "اُس کی آواز اور اُس کے حسن میں ایک شان تھی۔ اور ایک ایسی کشش تھی جو محبت کے اثر کو قبول نہ کرنے والے اور عمر کے تقاضے سے متوجہ نہ ہونے والے دلوں کو بھی مغلوب کر لیتی تھی۔"

فیریرو کہتا ہے کہ وہ معمولی شکل و صورت کی عورت تھی، اُس کی ناک بہت بڑی تھی اور دو حریص رومیوں کو وہ اس لئے خوبصورت نظر آتی تھی کہ وہ امیر تھی۔

یہ بات کہ شاہانِ مصر کے ایک قدیم خاندان میں پیدا ہونے پر بھی اس کی رگوں میں مشرقی خون کا کوئی قطرہ موجود نہ تھا کچھ غیر ممکن سی معلوم ہوتی ہے

قدما کے بقول قلوبطرہ کا سارا حسن اس کی آواز میں تھا، اور اُس کا پیکر اس کی آواز کے ساتھ مل کر انسان کو مسحور کر لیتا تھا۔ جب وہ بولتی تھی تو اس کی آواز میں ایک شیرینی سی محسوس ہوتی تھی"۔

قلوبطرہ کی موت کے ساتھ ایک بہت اچھا دماغ ضائع ہو گیا، اور اس کے ساتھ سیزر اور انطونی جیسے عظیم الشان انسانوں سے دنیا محروم ہو گئی۔ قلوبطرہ بے حساب زبانیں بول سکتی تھی۔ پلوٹارک کہتا ہے کہ وہ یونانیوں، عربوں، شامیوں، میدیوں اور پارتھیوں سے اُن

کی زبان میں بے تکلف گفتگو کر سکتی تھی اور بہت سی دوسری قوموں کی زبانیں جانتی تھی۔

انطونی کی رومن بیوی آکٹیویا کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ وائیگال آکٹیویا کی نسبت کچھ زیادہ نہیں لکھتا۔ اس کے لئے فیریرو کا تذکرہ سیزر پڑھنا چاہیئے۔ اس کا قول ہے کہ آکٹیویا ایک بے نظیر عورت تھی، بلکہ غالباً وہ کوئی فرشتہ تھی۔ جب انطونی اور قلوبطرہ دونوں نے خودکشی کر لی اور آکٹیویا کا بھائی آگسٹس اُن کے بچوں کو اور قلوبطرہ کے ایک بُت کو جس میں ایک سانپ اُس کے بازو سے لپٹا ہوا تھا فتح کے جلوس کے ساتھ لے گیا تو نیک دل آکٹیویا نے قلوبطرہ کے اُن دو بچوں کو جن کا باپ اُس کا بے وفا شوہر تھا اپنے گھر میں پناہ دی۔ اور پھر ان ننھے بدقسمت یتیموں سے انتہا درجے کی مہربانی کا سلوک کیا، اور اُن کی غور و پرداخت اپنے بچوں کی طرح کی۔

اگرچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قلوبطرہ جس نے بیسیوں زندگیاں بسر کیں اور بیسیوں دفعہ موت کے منہ سے ہو کر نکلی آخر ایک سانپ سے اپنے آپ کو ڈسوا کر مر گئی، لیکن یہ زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اور اُس کی دو وفادار سہیلیوں نے کوئی زہرِ قاتل کھا کر خودکشی کر لی۔ اس کے بازوؤں پر دو چھوٹے چھوٹے داغ زہر پینے کے علاوہ سانپ کے ڈسنے سے لگے ہوں گے۔

مسٹر وائیگال قلوبطرہ کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ ایک روتے ہوئے بچے کو وہ اپنے سینے سے لگا کر چپ کرا رہی ہے اور تین تنا در بچے اس کے آس پاس کھیل رہے ہیں۔ ایسی عورت نفس پرست کیسے ہو سکتی ہے؟” لیکن قلوبطرہ کئی طبیعتوں کی مالک تھی، وہ بہت جلد بدل جایا کرتی تھی۔ وہ ایک عجیب طوفانی مزاج عورت تھی جس نے کئی لوگوں کو قتل کرا دیا، اور جب اس کے میر سامان نے یہ راز افشا کر دیا کہ قلوبطرہ نے اپنی جائداد کی فہرست میں بعض چیزیں شامل نہیں کیں تو اُس نے اُسے بالوں سے پکڑ کر خوب جھنجوڑا اور اس کا منہ اس طرح نوچا کہ اُس کی آنکھیں بمشکل بچ سکیں۔

علم سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے انطونی سے سکندریہ کی لائبریری کو دو لاکھ کتابیں دلوائیں، اور سسرو کو مصر کی نایاب کتابیں تحفے میں دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسے علم ہیئت سے بھی شغف تھا اور اس نے سیزر کو اپنے دربار کا مشہور مہندس اور ماہر فلکیات پیش کیا جس نے بعد میں جولیانوسی تقویم تیار کی۔

خواہ آپ قلوبطرہ کے اخلاق، اس کے شوہروں اور اس کی خودکشی کے متعلق کچھ ہی خیال کریں آپ کو اس کے انجام پر افسوس ضرور ہوتا ہے۔ قلوبطرہ کی خودکشی سے پہلے انطونی نے اپنی زندگی کا خاتمہ بہت بُری طرح کیا۔ اس نے یکدم اپنے آپ کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ آہستہ آہستہ جان دی۔ وہ اُس معبد میں بھٹک رہا تھا جہاں قلوبطرہ چھپی ہوئی تھی، اور قلوبطرہ اور اس کی دو کنیزوں نے رسّوں کے ذریعے سے اسے اوپر کھینچ لیا۔ قلوبطرہ اسے اپنی آغوش میں تھامے رہی اور انطونی کا خون اس کے بازوؤں پر بہتا رہا۔ اُس وقت قلوبطرہ کی قدیم محبت عود کر آئی اور اگرچہ وہ ایکٹیم کی جنگ سے بھاگ گیا تھا جس میں اگر وہ اپنی پرانی شجاعت کو ہاتھ سے نہ دیتا تو وہ دونوں ایک

کر دیتی لیکن اس کی عسکری سرگرمیوں میں کوئی کشش باقی نہ رہتی۔

مسٹر وائیگال نے قلوبطرہ کی ایک ایسی تصویر کھینچی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کو اس نوجوان خاتون سے ملنے کی خواہش ہوتی تھی باوجود اس کے کہ اُس نے اپنے بھائی اور اور بہت سے اشخاص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سیزر اور انطونی دونوں کی عمر اس کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ قلوبطرہ کی عمر اس کے دلچسپ عہدِ حکومت کے آغاز کے وقت چودہ سال کی تھی جب اُس نے اور انطونی نے خودکشی کی تو اس وقت انطونی کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور قلوبطرہ کی صرف اڑتیس سال۔ سیزر جس کا انتقال اس سے کچھ عرصہ پہلے ہو چکا تھا انطونی سے بھی بڑا تھا۔

مسٹر وائیگال نے مصر کی اس عجیب و غریب ملکہ کو "نسوانیت کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے" اعلیٰ سے اُن کا مطلب یقیناً قلوبطرہ کے عہد کے لئے ہے، اگرچہ بعض لوگ اس خیال سے متفق نہیں ہوں گے۔ وائیگال کے بقول "قلوبطرہ کی رگوں میں مشرقی خون کا ایک قطرہ بھی نہ تھا" وہ مقدونیہ کے ایک یونانی خاندان سے تھی جس کی ابتدا اسکندرِ اعظم کے اُس جرنیل سے ہوئی جس سے بطلیموس پیدا ہوا اور جو قلوبطرہ کے زہر کھا لینے پر ختم ہو گیا۔

پلوٹارک کہتا ہے کہ قلوبطرہ کا حسن "ایسا نہ تھا کہ اس کی مثال نہ مل سکتی ہو، بلکہ ایسا بھی نہ تھا کہ ہر ایک کو متاثر کر سکے" اُس کی رائے میں آگسٹس کی بہن آکٹیویا جس کے ساتھ انطونی نے شادی کی تھی اور جسے پھر قلوبطرہ کے لئے اس نے طلاق دے دی قلوبطرہ سے زیادہ حسین تھی لیکن نہ اس کے پاس دولت تھی، نہ تخت، نہ جہاز، نہ فوجیں۔ دوسری طرف ڈائن کیسیوس قلوبطرہ کی نسبت کہتا ہے "اُس کی آواز اور اس کے حسن میں ایک شان تھی۔ اور ایک ایسی کشش تھی جو محبت کے اثر کو قبول نہ کرنے والے اور عمر کے تقاضے سے متوجہ نہ ہونے والے دلوں کو بھی مغلوب کر لیتی تھی۔"

فیریرو کہتا ہے کہ وہ معمولی شکل وصورت کی عورت تھی، اُس کی ناک بہت بڑی تھی اور زود حریص رومیوں کو وہ اس لئے خوبصورت نظر آتی تھی کہ وہ امیر تھی۔

یہ بات کہ شاہانِ مصر کے ایک قدیم خاندان میں پیدا ہونے پر بھی اس کی رگوں میں مشرقی خون کا کوئی قطرہ موجود نہ تھا کچھ غیر ممکن سی معلوم ہوتی ہے

قدما کے بقول قلوبطرہ کا سارا حسن اس کی آواز میں تھا، اور اُس کا پیکر اس کی آواز کے ساتھ مل کر انسان کو مسحور کر لیتا تھا۔ جب وہ بولتی تھی تو اس کی آواز میں ایک شیرینی سی محسوس ہوتی تھی"۔

قلوبطرہ کی موت کے ساتھ ایک بہت اچھا دماغ ضائع ہو گیا، اور اس کے ساتھ سیزر اور انطونی جیسے عظیم الشان انسانوں سے دنیا محروم ہو گئی۔ قلوبطرہ بے حساب زبانیں بول سکتی تھی۔ پلوٹارک کہتا ہے کہ وہ یونانیوں، عربوں، شامیوں، میدیوں اور پارتھیوں سے اُن

کی زبان میں بے تکلف گفتگو کر سکتی تھی اور بہت سی دوسری قوموں کی زبانیں جانتی تھی۔

انطونی کی رومن بیوی آکٹیویا کی شخصیت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ وائیگال آکٹیویا کی نسبت کچھ زیادہ نہیں لکھتا۔ اس کے لئے فیریرو کا تذکرہ بیشتر پڑھنا چاہیئے۔ اس کا قول ہے کہ آکٹیویا ایک بے نظیر عورت تھی، بلکہ غالباً وہ کوئی فرشتہ تھی۔ جب انطونی اور قلوبطرہ دونوں نے خودکشی کر لی اور آکٹیویا کا بھائی آگسٹس اُن کے بچوں کو اور قلوبطرہ کے ایک بُت کو جس میں ایک سانپ اُس کے بازو سے لپٹا ہوا تھا فتح کے جلوس کے ساتھ لے گیا تو نیک دل آکٹیویا نے قلوبطرہ کے اُن دو بچوں کو جن کا باپ اُس کا بے وفا شوہر تھا اپنے گھر میں پناہ دی۔ اور پھر ان ننھے بدقسمت یتیموں سے انتہا درجے کی مہربانی کا سلوک کیا، اور اُن کی غور و پرداخت اپنے بچوں کی طرح کی۔

اگرچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قلوبطرہ جس نے بیسیوں زندگیاں بسر کیں اور بیسیوں دفعہ موت کے منہ سے ہو کر نکلی آخر ایک سانپ سے اپنے آپ کو ڈسوا کر مر گئی، لیکن یہ زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اور اس کی دو وفادار سہیلیوں نے کوئی زہرِ قاتل کھا کر خودکشی کر لی۔ اس کے بازوؤں پر دو چھوٹے چھوٹے داغ زہر پینے کے علاوہ سانپ کے ڈسنے سے لگے ہوں گے۔

مسٹر وائیگال قلوبطرہ کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ ایک روتے ہوئے بچے کو وہ اپنے سینے سے لگا کر چپ کرا رہی ہے اور تین تناور بچے اس کے آس پاس کھیل رہے ہیں۔ ایسی عورت نفس پرست کیسے ہو سکتی ہے؟" لیکن قلوبطرہ کئی طبیعتوں کی مالک تھی، وہ بہت جلد بدل جایا کرتی تھی۔ وہ ایک عجیب طوفانی مزاج عورت تھی جس نے کئی لوگوں کو قتل کرا دیا، اور جب اس کے میرساماں نے یہ راز افشا کر دیا کہ قلوبطرہ نے اپنی جائداد کی فہرست میں بعض چیزیں شامل نہیں کیں تو اُس نے اُسے بالوں سے پکڑ کر خوب جھنجوڑا اور اس کا منہ اس طرح نوچا کہ اُس کی آنکھیں بمشکل بچ سکیں۔

علم سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے انطونی سے سکندریہ کی لائبریری کو دو لاکھ کتابیں دلوائیں اور سسرو کو مصر کی نایاب کتابیں تحفے میں دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسے علم ہیئت سے بھی شغف تھا اور اس نے سیزر کو اپنے دربار کا مشہور مہندس اور ماہر فلکیات پیش کیا جس نے بعد میں جولیانوسی تقویم تیار کی۔

خواہ آپ قلوبطرہ کے اخلاق، اس کے شوہروں اور اس کی خودکشی کے متعلق کچھ ہی خیال کریں آپ کو اس کے انجام پر افسوس ضرور ہوتا ہے۔ قلوبطرہ کی خودکشی سے پہلے انطونی نے اپنی زندگی کا خاتمہ بہت بُری طرح کیا۔ اس نے یکدم اپنے آپ کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ آہستہ آہستہ جان دی۔ وہ اُس معبد میں بھٹک رہا تھا جہاں قلوبطرہ چھپی ہوئی تھی، اور قلوبطرہ اور اس کی دو کنیزوں نے رسّوں کے ذریعے سے اسے اوپر کھینچ لیا۔ قلوبطرہ اسے اپنی آغوش میں تھامے رہی اور انطونی کا خون اس کے بازوؤں پر بہتا رہا۔ اُس وقت قلوبطرہ کی قدیم محبت عود کر آئی اور اگرچہ وہ ایکٹیم کی جنگ سے بھاگ گیا تھا جس میں اگر وہ اپنی پرانی شجاعت کو ہاتھ سے نہ دیتا تو وہ دونوں ایک

دنیا پر بادشاہی کرتے۔ تاہم اس نے انطونی سے مہربانی کا سلوک کیا۔

باوجود اس کے کہ اب وہ بوڑھا اور موٹا ہو گیا تھا اور بہت شراب پیتا تھا قلوبطرہ کو اُس سے محبت تھی، یا وہ سمجھتی تھی کہ اسے اس سے محبت ہے، چنانچہ خودکشی سے پہلے وہ اس کے لئے روتی پیٹتی اور واویلا کرتی رہی۔

قلوبطرہ کی موت پر رنج ہوتا ہے اور اُن دو بہادر عورتوں آئیسس اور شارمین کی وفاداری پر منہ سے تحسین نکلتی ہے جنہوں نے آخر دم تک قلوبطرہ کا ساتھ دیا اور پھر وہی زہر پی کر مر گئیں جو قلوبطرہ نے پیا تھا۔ سانپ والا افسانہ درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ایک چھوٹا سا سانپ جو انجیروں کی ایک ٹوکری میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہو تین جانوں کو ہلاک کرنے کے برابر زہر بہم نہیں پہنچا سکتا۔ شارمین کے آخری الفاظ جو اس نے رومی افسر سے کہے شجاعت کی جان ہیں۔ جب رومی افسر نے اس سے پوچھا:۔

"کیا تمہاری بیگم نے یہ اچھی بات کی ہے؟"

تو اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا "بہت اچھی، ایسی جیسی ایک بادشاہ زادی کے شایانِ شان تھی"۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ ملکہ کے پاس گر پڑی اور جان دے دی۔

وسیع الاقتدار آگسٹس کی بہن آکٹیویا جس نے انطونی اور قلوبطرہ کے ننھے یتیموں کو اپنے گھر میں جگہ دی ایک ایسی خاتون ہے کہ اس کی ایک نہایت اچھی سوانحعمری لکھی جانی چاہیئے، اور اسی طرح کسی کو سکندرِ اعظم کی بیوی اولمپیا کی بھی اچھی سی سوانحعمری لکھنی چاہیئے اور پالیطوس کی بیوی ایلیا کی۔ جب پالیطوس کو حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے آپ کو قتل کرے اور ایلیا نے دیکھا کہ اُس میں اس کام کی جرأت نہیں ہے تو اُس نے خنجر لیا اور اپنے سینے میں پیرا کر کہا "پالیطوس اِس سے بالکل تکلیف نہیں ہوتی"۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کو ایسی ہزاروں نیک شریف اور بہادر خواتین کی سوانحعمریوں کی ضرورت ہے جن کا وجود نسلِ انسانی کے لئے مایۂ ناز ہے۔

(ترجمہ) منصور احمد

---

رات اندھیری ہے اور گہری ہے تمہاری نیند میرے وجود کی خاموشی کے اندر۔
جاگ اے دردِ محبت! کہ میں باہر کھڑا ہوں اور نہیں جانتا کہ دروازہ کیوں کر کھولوں۔
گھڑیاں منتظر ہیں، تارے تک رہے ہیں، ہوا ساکت ہے۔
خاموشی بوجھل ہے میرے دل کے اندر۔
جاگ اے محبت جاگ! میرے خالی پیالے کو بھر دے اور راگ کے ایک سانس سے رات کو درہم برہم کر دے!

گلچیں

# حدیثِ محبّت

وہ تیرا دِل میں رہ کر آنکھ سے مستور ہو جانا     وہ میرا باوجودِ قرب تجھ سے دور ہو جانا

وہ تیرا میرے ضبطِ غم کی قدرت لے کے چل دینا     وہ میرا رنگِ رخسارِ خوشی کافور ہو جانا
وہ تیرا میرے دل کو داغِ فرقت دے کے چل دینا     وہ میرا داغ زخم اور زخم سے ناسور ہو جانا

وہ تیرا میری امیدوں کو بیدردی سی ٹھکرانا     وہ میرا شیشۂ دل سنگِ غم سے چور ہو جانا
وہ تیرا جور پر تاکیدِ شکرِ جور فرمانا     وہ میرا امتثالِ امر سے معذور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر مژدۂ پاسِ وفا دینا     وہ میری غم نصیب اُمیّد کا مسرور ہو جانا
وہ تیرا مجھ کو آخر اپنی منزل کا پتا دینا     وہ میری جدّ و جہدِ شوق کا مشکور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو باصد طلعتِ دلبر نظر آنا     وہ میرا نذرِ عقل و ہوش پر مجبور ہو جانا
وہ تیرا مجھ کو باصد حُسنِ افسوں گر نظر آنا     وہ میرا دیکھنا اور دیکھ کر مسحور ہو جانا

وہ تیرا برخلافِ پاسِ ضبطِ راز کھُل پڑنا     وہ میرا قصّہ عینِ قصۂ منصور ہو جانا
وہ تیرا باہزاراں برق زا انداز کھُل پڑنا     وہ میرا حال رشکِ حالِ کوہِ طور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو پیہم بادۂ لَاتَقْنَطُوا دینا     وہ میرا پھر مئے اُمید سے مخمور ہو جانا
وہ تیرا مجھ کو ہر دم ساغرِ ہر آرزو دینا     وہ میرا پھر تمنّا کے نشے میں چوُر ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنے درد کی دولت عطا کرنا     وہ میرے دامنِ امّید کا بھرپور ہو جانا
وہ تیرا مجھ کو اپنی لم یزل اُلفت عطا کرنا     وہ میرا سرمدی تسکین سے معمور ہو جانا

وہ تیرا اپنی اُلفت کا مجھے کافی صلا دینا     وہ میرا اپنی محنت سے سوا ماجور ہو جانا
وہ تیرا اپنی رحمت سے مجھے کامل جزا دینا     وہ میرا زمرۂ عشاق میں محشور ہو جانا

خوشا! آزاد کا فیضانِ صحبت جس نے سمجھایا
خدا کا قرب کیا شے ہے، خودی سے دور ہو جانا

حکیم آزاد انصاری

# ادبی تنقید

لفظی پیرائے میں حسنِ تخلیق کا نام ادب ہے جس طرح رنگین پیرائے میں حسنِ تخلیق کو نقاشی کہتے ہیں، صوتی پیرائے میں حسنِ تخلیق کو موسیقی کہتے ہیں اور سنگین پیرائے میں حسنِ تخلیق کو سنگ تراشی۔ ادب کے معنی الفاظ کو اس طرح ترتیب دینا ہے کہ آدمی کی اُس حس کو تشفی پہنچے جس کا تعلق حسن سے ہے۔ انسان تخلیق کرتا ہے کیونکہ اس کی تخلیقی قوت اس کو مجبور کرتی ہے جس شخص میں شاعری کا جذبہ ہوتا ہے وہ شاعری کرنے پر مجبور ہے خواہ ہر روز صبح اٹھ کر اسے اپنے اشعار جلا دینے پڑیں۔

تخلیق ادب کی پہلی صفت ہے۔ جو شخص دنیا کے سامنے کوئی ایسی چیز نہیں پیش کر سکتا جس کو وہ اپنا کہہ سکے جو اس طرح نئی ہے کہ اس کا معدوم ہو جانا دنیا کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے اُس کو ادیب کہلانے کا حق نہیں۔ جو شخص دوسروں کے حسیات و خیالات کو اپنے طریقے پر دہراتا ہے وہ ادیب نہیں بلکہ صدائے بازگشت ہے۔ اگر دوسری زبانوں کے خیالات اور کارناموں کو اپنی زبان میں عام فہم بنایا جائے تو اس ضروری کام کو بھی ادب نہ کہنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کے لئے ایک زیادہ موزوں لفظ 'ترجمہ' زبان میں موجود ہے۔

ایک قدیم یونانی فلسفی کا قول تھا کہ فن فطرت کی نقالی کا نام ہے۔ یہ مقولہ اُن اَن گنت بیانوں میں سے ہے جو اپنے وقت میں صحیح تھے مگر جن کا کام آنے والی نسلوں کو گمراہ کرنا ہے۔ تخلیق یعنی کسی نئی چیز کی پیدائش 'بیرونی عناصر سے ممکن نہیں۔ کسی چیز کا پیدا کرنا ایک روحانی مشغلہ ہے۔ اس کی ابتدا روح میں ہوتی ہے اور روح ہی میں سرانجام پاتی ہے۔ جب ہم جمنا کے کنارے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھتے ہیں اور جا کے اپنے دوستوں سے کہتے ہیں "آج شفق کے سرخ سنہرے رنگ دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان والے ہولی کھیل رہے ہیں"۔ یہ فطرت کی نقالی نہیں ہے بلکہ ہم اپنے اندرونی "تاثرات کو بیان کر رہے ہیں۔ ہم اُن اثرات کو ظاہر کر رہے ہیں جو سرِ شام ہمارے ذہن پر منتقل ہوئے تھے اور یہی ہمارے بیان کی ادبی صفت ہے۔ جب بھی ہم کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں، ہم فطرت کو بھول کر اُن اثرات کا اظہار کرتے ہیں جو ہم قبول کر چکے ہیں۔

یونانی حالات میں فلسفی کا بیان صحیح تھا۔ یونانی ڈراما سارا مذہبی ہے۔ یونان کے اوّلیں ڈراما نویس اپنے ذاتی خیالات کا اظہار نہ کرتے تھے۔ وہ اُن جذبات کو اُکساتے تھے جو ساری قوم میں مشترک تھے۔ وہ عام طور پر مسلمہ حکایتوں کو ادبی شکل دے کر مذہبی تیوہاروں کے موقع پر شہریوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ تماشائیوں کی کثرت اور تماشاگاہ کی وسعت میں یہ ناممکن تھا کہ

کوئی ڈراما نویس اپنا یا اپنے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کرے۔ مگر خود یونان میں بعد کے ڈراما نویسوں اور نئے ادیبوں کے بارے میں بہ قول ایک جدید نقاد کے یہ کہنا صحیح ہے کہ خود فطرت فن کی نقالی کرتی ہے۔ جب ہم غم زدہ ہو کر غروبِ آفتاب کا منظر دیکھنے جاتے ہیں ہمیں آنے والی تاریکی میں نا امیدی اور مایوسی کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ جب ہم مسرور ہو کر اور خوشی کی کیفیت میں اپنی دوستوں کے ساتھ وہی منظر دیکھتے ہیں تو ہم حسن کے سحر میں اپنی تمام فکریں بھول جاتے ہیں۔ فطرت سے کسی قسم کا اثر قبول کرنا اور اس کو اپنے حالات کے مطابق معنی پہنانا ہمارا کام ہے۔

اخلاص تخلیق کا لازمی جزو ہے۔ ہم صرف اپنے تاثرات اور اپنے خیالات کے مالک ہیں۔ دوسروں کے جذبہائے رنج و غم کا اندازہ ہم صرف اپنے نفس کے ذریعہ کر سکتے ہیں۔ جو کچھ ہم نے خود محسوس کیا ہے، جو اثرات ہم نے قبول کئے ہیں صرف انہی کو بیان کر کے ہم تخلیقی درجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر شخص کی زندگی سے کم سے کم ایک قیمتی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

مگر ہمارے سب تاثرات یکساں نہیں ہوتے۔ بعض پوچ ہوتے ہیں جن کا اظہار علانیہ کرنا ہم پسند نہیں کرتے۔ بعض بذاتِ خود قیمتی ہوتے ہیں۔ مگر ان کا بیان کرنا محض دوسروں کے بیانات کو دہرانا ہوگا۔ اس طرح دہرانے سے ہماری شخصیت جلوہ گر نہیں ہوتی۔ ان کے دہرانے سے دنیا کے خزانہ میں کوئی مزید اضافہ نہیں ہوتا۔ اور ایسی دنیا میں جہاں نقلی موتی بازار میں بہت آتے ہیں، صرف اصلی موتیوں کی قدر ہو سکتی ہے۔ ہماری زندگی میں بہت سے تجربات ہمیں آئے دن حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ ہر لمحہ، ہر ساعت ہمارے دل پر نئے نقوش بنتے ہیں۔ ادیب کا فرض ہے کہ ان میں سے اُن نقوش کو انتخاب کرے جن کی قدر دائمی ہے۔ جو اثرات ایسے نہ ہوں وہ فنا ہو جاتے ہیں اور ادبی دنیا ان کی موجودگی سے عرصے تک متاثر نہیں رہ سکتی۔

صرف یہی نہیں بلکہ ادیب کا فرض ہے کہ وہ ان اثرات کو تلاش کرے جو کمیاب ہیں، ان کیفیات کو ڈھونڈے جو ہر شخص کو نہیں ملتیں اس کا فرض ہے کہ اپنی روح کو بے انتہا ذکی الحس بنا رکھے تاکہ کوئی نیا تجربہ اُس کی نظروں سے بچنے نہ پائے! ادیب اور معمولی انسان میں یہی فرق ہوتا ہے۔ اوسط حیات کے آدمی کو دنیا یکساں اثرات کا سلسلہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لئے وقتاً فوقتاً برقی لمحے نہیں آتے جو یکایک زندگی بھر کی تاریکی کو منور کر دیں۔ وہ پھولوں کو دیکھ کر گزر جاتا ہے: وہ ہر روز کھِلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں شبنم رات کو گرتی ہے اور صبح سوکھ جاتی ہے۔ آنسو اکثر آنکھوں سے بہا کرتے ہیں کبھی بناوٹ سے کبھی واقعی رنج سے گریہ دنیا میں عام بات ہے۔ مگر جب شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یا درد کا سادہ بیان

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا۔

اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے نئی فضائیں کھل رہی ہیں، نئے افق وسعت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں جس طرح کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ جائے۔ ان روز کی معمولی باتوں، ان عام، غیر اہم مناظر کے ساتھ نوعِ انسان کی قسمت وابستہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ وسعتِ خیال، یہ دقّتِ نظر، جزئیات میں نئے معانی دیکھنے کی قوت، یہی ادیب کا طغرائے امتیاز ہے اور اسی شدید جذبۂ احساس کو قوتِ تخلیق کہتے ہیں۔ یہ ہر شخص کا کام نہیں بلکہ وہی انجام دے سکتا ہے جس نے زندگی اور دنیا کے ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا ہو اور اپنے احساسات کی قدر پہچاننے کی صفت حاصل کر لی ہو جس شخص کی نظر زندگی اور ادبیاتِ عالم پر گہری نہیں اس کو ادیب بننے کا حق نہیں۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کے علاوہ اس کے برعکس عمل پیرائی کا نتیجہ ایسی کتابوں کی پیدائش ہے جو ادبیات کی صف میں رکھے جانے کے لائق نہیں، اور جن کا ذہنی لچرپن اُن کو مطالعہ کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ ادیب صحیح معنوں میں وہی ہو سکتا ہے جس نے زندگی کو اچھی طرح دیکھ کر تمدّن پر عبور حاصل کر لیا ہو، اور اس کے بعد کتابوں کے مطالعہ سے اپنے ذاتی احساسات کی قدر بخوبی پہچان لی ہے۔

مگر احساس بذاتِ خود تخلیق نہیں۔ اگر یہ ہوتا کہ محض قوتِ احساس کو شاعری کہتے تو بہت کم ایسے ہوتے جنہیں کبھی نہ کبھی شاعری کا درجہ حاصل نہ ہو جاتا۔ احساس جب تک بیرونی پیرایہ اختیار نہ کرے۔ ادب نہیں بن سکتا شاعر کے دماغ میں ہزار شکلیں بنتی ہیں اور مدھم ہو جاتی ہیں، ہزار اثرات ہجوم کرتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں، مگر ان ہزار اثرات میں کوئی ایک اثر ہی اتنا پائدار ہوتا ہے کہ وہ خصوصی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے نقوش ذہن میں صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ لفظی پیرایہ اختیار کر لیتا ہے۔ جب تک کوئی احساس مستقل نہیں ہوتا وہ لفظ نہیں بنتا۔ لفظ بننے کے ساتھ اسکو دائمی پیرایہ حاصل ہو جاتا ہے جو اُسے ادب کے نام سے ممتاز کرتا ہے۔ جب جذبات میں ہیجان کے بعد سکون پیدا ہو جاتا ہے غیر ضروری اثرات منتشر ہو جاتے ہیں، ایک خاص دماغی اثر ذہن پر قائم رہتا ہے اور بیرونی پیرایہ اختیار کر کے فن کہلاتا ہے۔

ادب میں پیرائے کی دو صفتیں لازمی ہیں؛ حسن اور لفظ۔ اگر کوئی احساس، کوئی تاثر لفظی پیرایہ نہ اختیار کرے بلکہ رنگوں میں منعکس ہو تو اسے ادب نہیں مصوری کہتے ہیں۔ مگر لفظی پیرایہ سب سے آسان اور سب سے وسیع پیرایہ ہے۔ سنگتراش سنگین پیرایہ میں کام کرتے ہوئے دو باتوں سے مجبور ہے، وہ حرکت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ہر لمحہ جو بدلتے ہوئے تاثرات ہم قبول کرتے ہیں۔ اُن کو سنگین پیرایہ نہیں سنبھال سکتا۔ رنگین پیرایہ میں اس سے زیادہ وسعت ہے، مگر حرکت اور وقت، اور تسلسل کا اظہار اس میں بھی ممکن نہیں۔ الفاظ میں ہم لامتناہی جذبات کو تسلسل کے ساتھ ظاہر کر سکتے ہیں۔ اور الفاظ میں جتنا لوچ ہے کسی اور پیرایہ میں نہیں۔ موسیقی صرف آواز ہے اور اس میں الفاظ سے بھی زیادہ لوچ ہو سکتا ہے۔ مگر اُس میں جذبات اشاروں کے ذریعہ بیان کئے جاتے ہیں اور اس میں فصاحت نہیں۔

اس طرح ادب دوسرے فنونِ لطیفہ سے برتر چیز ہے۔ مگر ہر فنِ لطیف کی یہ خصوصیت ہے کہ اس سے احساسِ حُسن کی تشفی ہوتی ہے۔ اگر لفظی پیرایہ ایسا ہے کہ اس میں متضاد باتیں اکٹھی کر دی گئی ہیں، اگر اس میں تناسب اور حسنِ ترکیب کا التزام نہیں رکھا گیا ہے تو وہ فنِ لطیف

نہیں لفظی پیرایہ کو ایسی شکل دینا کہ انسان معانی کو بھول کر بھی صرف اس کے پیرائے کے حسن میں محو ہو جائے یہ فنّان کا کمال ہے۔ مگر معنی اور پیرایہ دو مختلف چیزیں نہیں۔ ہم یہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ جب تاثّرات لفظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں وہی ادب ہے۔ مگر ہر تاثر کئی طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ ہر اثر کے ادا کرنے کے لئے مکمل پیرایہ صرف ایک ہی ہے۔ اگر کسی مضمون کو کئی شعرا نے ادا کیا ہے۔ تو ہم دیکھیں گے کہ ہر شخص نے اس مکمل پیرایہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو واقعی اس خاص تاثر کو ادا کرنے کے لئے موزوں ہے۔ خود شاعر کے دماغ میں ہیجان کے بعد تاثر ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ شکل وہ پیرایہ کہاں تک اس تاثر کے بیان کرنے کے قابل تھا؟ یہ ادب کی بنیاد ہے۔

اس بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہر شخص جس کے اندر کسی نئی چیز کے محسوس کرنے کی قوت اور اُس کو الفاظ میں خوبصورت طریقے پر ادا کرنے کی اہلیت ہو، اس کو ادیب کہتے ہیں اور اس کے کارنامے کو ادب۔ اس کی ادبیت کا معیار صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے حسیات و جذبات کو مکمل طور پر ادا کرنے میں کس حد تک قادر رہا ہے۔ ہر پہلو سے اپنے تاثرات پر حملہ کر کے شاعر اسے مکمل پیرایہ عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب تک اس کو یہ اطمینان نہیں ہو جاتا کہ ان حالات و اثرات کے ماتحت مکمل ترین پیرایہ اُس کے معانی کو مل گیا ہے۔ اُس وقت تک وہ اپنے تاثرات کو شعر نہیں کہتا جب اس کے تاثرات ایسے لفظی لباس میں آ جائیں کہ اس خاص ذہنیت کے ماتحت اس سے بہتر پیرایہ ممکن نہ ہو تو وہ اپنے ادبی کارنامے کو مکمل کر کے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

لہذا صحیح طور پر تنقید کرنے کے لئے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ہم اس شاعر کو یہ مشورہ دے سکیں کہ اس وقت تم اپنے تاثرات کو لفظی پیرایہ مکمل طور پر عطا کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہو جن حالات کے ماتحت شاعر کارنامے میں مصروف تھا ان کا علم صرف اسی کو ہے۔ صرف وہی اس امر کا بہترین منصف ہو سکتا ہے کہ ان حالات کی موجودگی میں کوئی اور پیرایہ ممکن تھا یا نہیں۔ ہم صرف ادب کے ساتھ اس کے کارنامے کا مطالعہ کر سکتے ہیں ہم اس کے جذبات اور احساسات کا ہر ممکن طریقے سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اپنے مطالعہ کے نتیجے کو دوسروں کے سامنے تشریح کے لئے پیش کر سکتے ہیں اور اس کے مخفی معنی حاصل کرنے کی کوشش کرنے کے بعد ہم اپنی تحقیق کے نتائج کو دوسروں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

مگر یہ تشریحی کام تنقید نہیں۔ یہ ثانوی کام اسکولوں کے مدرّسوں اور پروفیسروں کے لئے مناسب ہے۔ ادبی نقاد کا مطمحِ نظر اس سے بلند ہے۔ وہ لفظی پیرائے کے پردے کو پھاڑ کر اس فنان کی ذہنیت کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے جو الفاظ کے پیرائے میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس کے لئے بیرونی ماحول کے مطالعہ کی ضرورت نہیں سوائے اُس حد تک جتنی خود شاعر نے اپنے کلام میں ظاہر کی ہے۔ اس کے لئے شاعر کی سیرت کے مطالعہ کی ضرورت نہیں؛ جس قدر جزو شاعر اپنی سیرت کا دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا وہ اُس کے ادبی کارنامے میں موجود ہے۔ تاریخی حالات مہیا کرنا اور سیرت کے واقعات جمع کرنا یہ بذات خود اہم کام ہے۔ مگر جہاں تک ادبی تنقید کا تعلق ہے اُن کی حیثیت محض ثانوی ہے۔

لہذا ادبی تنقید فنان کی ذہنیت اور اُس کے روحانی رجحان کے مطالعہ کا نام ہے۔ ادبی تنقید کے وقت یہ بحث غیر ضروری ہے کہ آیا فنان کے کارنامے اخلاقی دنیا کے نزدیک قابلِ قبول ہیں یا نہیں۔ اگر ہم اس اخلاقی بحث میں پڑیں گے تو لامتناہی مسائل شروع ہو جائیں گے۔

تخلیقی قوت اخلاقی قوت سے جدا ہے۔ اُس کا تعلق صرف احساسِ حسن سے ہے، اور جب تک لفظی پیرائے میں حُسن موجود ہے اُس پر کسی اور نقطۂ نظر سے نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔ یہ بحث بھی فضول ہے کہ ادب کا مقصد لذت رسانی ہے یا منفعت رسانی۔ کیا ادب کا یہ فرض ہے کہ پڑھنے والوں کے معلومات میں اضافہ کرے یا صرف ان کو خالص فنی خوشی بخشے؟ کیا یہ شاعر کا فرض ہے کہ وہ ایک خاص پیغام لے کر اپنے ملک یا قوم کو جگانے کی کوشش کرے؟ یہ بحث فضول اس لئے ہے کہ ادبی تخلیق میں یہ چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہر فنان فن کی تکمیل محض احساسِ حُسن کی تشفی کے لئے کرتا ہے۔ اگر اس فنی تکمیل سے حساس کو لذت دستیاب ہو تو بہتر، مگر یہ لازمی نہیں۔ ایک اچھی تصویر دیکھ کر ہمیں رنج ہو سکتا ہے اگر ہمیں کسی بھولے ہوئے دوست کی یاد آ جائے۔ ایک بُرا ناول دیکھ کر ہمیں خوشی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں ہمارے کسی دشمن کا خاکا اڑایا گیا ہے۔ مگر یہ ثانوی چیزیں ہیں۔ پہلی چیز محض خالص ادبی حُسن کی تخلیق ہے۔ اسی طرح آج کل کی دنیا میں جب ہر طرح کی نئی تحریکیں روز پیدا ہوتی ہیں، جب ذہنی اور اخلاقی دنیا میں انقلاب برپا ہے، جب قوم نئی نئی ضروریات کا احساس کر کے بیدار ہو رہی ہے یہ ناممکن ہے کہ شاعر کا قلب و دماغ بیدار نہ ہو اور اُس کے تاثرات ایسے نہ ہوں جو قوم کے لئے نئے اہم معنی رکھتے ہوں۔ چونکہ اس کا دل و دماغ ہم سے زیادہ ذکی الحس ہے، اس لئے ہم اس کے تاثرات کا مطالعہ کر کے اپنے حسیات کو تیز کرنا چاہتے ہیں۔ "فن برائے فن" یہ قرونِ وسطیٰ کا نظریہ ہے جب حسن کی پرستش قومی رنج و الم سے جداگانہ کی جاتی تھی، جب حسن کی دیوی امرا کے قصروں اور بادشاہوں کے محلوں سے کبھی نیچے نہ اترتی تھی۔ آج کل جب شاعر قومی سیرت اور غربا کی مصیبت میں اپنے تاثرات تلاش کرتا ہے یہ ناممکن ہے کہ اس کے تخلیقی کارنامے میں اس کا اثر نہ آ جائے۔ مگر یہ اُس کی تخلیق کا اصلی مقصد نہیں۔ اصلی مقصد حُسن کی پیدائش ہے اور اگر وہ اس ضروری نظریہ کو چھوڑ دے تو اُس کو صرف رعایتی طور پر شاعر کہہ سکتے ہیں۔

فنان کے رجحانِ روح کے خالص مطالعہ کا نام تنقید ہے۔ ہمیں یہ حق نہیں کہ کسی شاعر کو بُرا کہیں یا کسی کو اچھا کہیں۔ جیسا کہ ایک اطالوی فلسفی نے کہا ہے ہر رجحانِ روح انسانی تاریخ میں قیمتی ہے اور ہر روح کو انسانی تاریخ میں یکساں وقعت حاصل ہے۔ اپنی رائے کا اظہار کرنا معمولی کام ہے۔ نقاد کا فرض ہے کہ اپنی رائے کو حتی الوسع چھپا کر بغیر کسی تعصب کے فنان کے رجحانِ روح کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس نے کس قسم کے تاثرات قبول کئے اور کن کو مسترد کر دیا۔ ادبی تنقید میں اس روحانی مطالعہ کے سوا اور کوئی مطالعہ کارآمد نہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادبیات کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دینا بے معنی بات ہے۔ شاعری، افسانہ، ڈراما یا مضمون نگاری یہ سب چیزیں روح کے رجحان کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ ہر صنفِ ادب میں یکساں طور پر تخلیقی قوت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ خواہ ہم شاعری کا مطالعہ کر رہے ہوں، خواہ ناول نویسی کا، ہم کسی صنفِ ادب کو کسی مستقل قاعدے کے ماتحت نہیں جانچ سکتے۔ یہ ہمارے ادب کی بدنصیبی ہے کہ ہر صنفِ ادب کے لئے سخت اور بے لوچ قواعد مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ ان پابندیوں میں انسانی روح کا اظہار کرنا بے حد مشکل ہے۔ اور یہی ہمارے ادبی تنزل کا اصلی سبب ہے۔ روح کسی صنفی حد کی پابند نہیں۔ جب وہ الفاظ میں اپنے رجحان کا اظہار کرتی ہے تو اس کے سامنے

صرف ایک سطح ہوتا ہے یعنی تخلیقِ حسن۔ اور اس کا معیار خود روح مقرر کر سکتی ہے کسی بیرونی شخص کو حسن کا معیار مقرر کرنے کی استطاعت نہیں۔ ایک معیارِ حسن جو کسی کو پسند ہو دوسرے کو ناپسند ہو سکتا ہے اور کسی مقررہ معیار پر حسن کو جانچنا اس کو جہالت پر قربان کرنا ہے مثنوی اور قصیدہ اور غزل کو الگ الگ خانوں میں بند کر دینا آثارِ قدیمہ میں سے ہے جس کو جلد سے جلد مٹا دینا ہی بہتر ہے عام انسان کے مطالعہ کے لئے بطور یادداشت یہ بُرا نہیں کہ ادب کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا جائے تاکہ جب کوئی شخص کتاب اٹھائے تو اسے معلوم ہو جائے کہ اُسے کس قسم کے جذبات سے واسطہ پڑیگا مگر یہ عوام کا معیار ہے نہ کہ نقادوں کا! یہ ضرور مناسب ہے کہ ایک خاص اندرونی جذبے کے اظہار کو غزل کہا جائے کسی کی مدحیہ نظم کو قصیدہ کہا جائے کسی مرے ہوئے کی یاد میں لکھی ہوئی نظم کو مرثیہ کہا جائے، مگر اس کے ساتھ ہی ہر صنفِ نظم کے الگ الگ قواعد اور معیار مقرر کرنا ذہانت، طباعی اور جدت کا خون کرنا ہے۔ اس سے زیادہ نقصان دہ اور بے معنی بات ممکن نہیں کہ نہ صرف ادب کی تقسیم نظم و نثر، ناول اور ڈرامے میں کر دی جائے بلکہ ہر صنف ادب کی الگ تقسیم کر دی جائے۔ یہ قرونِ وسطیٰ کی علمیّت کا نمونہ ہے جو اس بیسویں صدی میں بھی اپنا پنجہ ادبیات کے گلے پہ گاڑے ہوئے ہے۔

اسی طرح ادب کی تقسیم عہد اور مقام کے لحاظ سے کسی طرح مناسب نہیں۔ اردو شاعری کی قدیم تقسیم دہلی اور لکھنؤ میں اگر کسی زمانہ میں اہمیت رکھتی بھی تھی تو اب اس کی اہمیت معدوم ہو گئی ہے۔ کیا لکھنؤ کے شعراء کے کلام میں ایسے اشعار نہیں جو دہلی کے لئے مایۂ ناز ہوں، یا دہلی کے شعرا میں لکھنؤ کا رنگ موجود نہیں؟ اب یہ تقسیم صرف مرجھائے ہوئے پھول کا عکس رہ گئی ہے۔ ادبی دنیا آج دہلی اور لکھنؤ کو چھوڑ کر ہندوستان کے ہر گاؤں اور ہر گوشے تک پھیل چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس انتشار کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو دان طبقے میں اس وقت کوئی مشترک ذوقِ ادب نہیں بلکہ ہر فنّان اپنے طریقہ پر تخلیقی کارناموں میں مصروف ہے لیکن اگر حسن کے کسی خاص معیار کی ضرورت ہے تو وہ بجائے قیود مقرر کرنے کے اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ سارے ادیب ایک دوسرے سے واقف ہو کر ایک دوسرے کے معیارِ حسن کا اندازہ کریں اور اثر قبول کریں۔ بدنصیبی سے اس وقت اردو کی ادبی دنیا میں اس طرح کا کوئی واحد مرکز موجود نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر فنّان اپنے شخصی معیار کے مطابق اپنا کارنامہ انجام دیتا ہے لیکن اس طرزِ کار سے اگر نقصان ہے تو فائدہ بھی ہے۔ مختلف شخصی معیاروں کے الگ الگ ترقی پانے کا لازمی نتیجہ ادب کے ہر شعبہ میں ترقی ہے اور یہ مناسب نہیں ہے کہ کوئی ایسا ذوق جیسا لکھنؤ اور دہلی پر حاوی تھا تمام شخصی اور ذاتی جدّت کا خون کرے۔ برخلاف اس کے حیدرآباد اور پنجاب میں جو مرکزی کوششیں اس وقت ہو رہی ہیں۔ وہ وہاں کے ادیبوں کو ایک معیاری لہجہ عطا کر رہی ہیں جس میں شخصیّت اور عمومیت دونوں مشترک ہو گئی ہیں۔

اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ادبیات کی تقسیم زمانے اور مقام دونوں کے لحاظ سے لایعنی ہے۔ کیا ادب کی کوئی اور مستقل تقسیم ممکن ہے؟ اگر ادب کی کوئی تقسیم ہو سکتی ہے تو وہ بیرونی پیرایہ پر مبنی نہیں ہو سکتی کیونکہ بیرونی پیرایہ صرف اندرونی رجحان کا لباس ہوتا ہے اور اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کی تقسیم صرف ادیبوں کے روحانی رجحان ہی کی بنا پر ممکن ہے۔

اگر اردو ادب کا دقیق طور پر مطالعہ کیا جائے تو دو قسم کے ادبی کارنامے ممتاز نظر آئیں گے: ایک وہ جو اپنے جذبات اور تاثرات کو بیرونی مادی دنیا سے قبول کرتے ہیں اور اپنے تاثرات کو خلوص کے ساتھ لفظی پیرایہ پہناتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بیرونی دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنے تاثرات کے لئے قطعی طور پر اپنے اندرونی ہیجانات کے محتاج ہیں، جو دنیا و مابعد کے مسئلوں کا ایک بلند چوٹی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ تقسیم کسی طرح مکمل نہیں، اور بہت سے اصل نگار وقتاً فوقتاً علویت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور بہت سے علویت نگار اصلیت کے اثرات کو بھی اپنے ذہن میں قبول کر لینے پر مجبور ہیں۔ یہ طریقۂ تقسیم کسی طرح دوسرے طریقے سے واضح اور صاف نہیں مگر میں جس بنا پر اس طریقۂ تقسیم کو ترجیح دے رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس سے ان نقصان دہ اثرات کے پیدا ہونے کی توقع نہیں جو صنفی تقسیم کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کو عہد وار تقسیم پر اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ ہم اس کی روشنی میں ادبی ارتقاء کے عہد بہ عہد خاص راستوں پر نشو و نما کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی بناء پر ہماری موجودہ تقسیم ایک زمانے کو دوسرے زمانے سے متضاد چیزوں کی طرح الگ کر دیتی ہے۔ مگر انسانی ذہن اور ادبی دنیا کا ایک لازمی اصول تمام رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود مسلسل ترقی ہے! اور یہ ارتقاء دنیا کے تمام ادبیات کی طرح اردو ادب میں بھی موجود ہے۔

اگر ہم اس راستے کو اختیار کر کے اردو ادب میں روحانی رجحانات کے نشو و نما کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ اردو ادب کی ابتدا دکن میں اصل بیانی سے ہوئی۔ واقعیت اور سادگی، عوام الناس کی زبان میں روزمرہ کے تجربات کا بیان، دکن کے ادبیات کا جوہر ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کا کلام پھلوں اور ترکاریوں، اور عوام کے رسم و رواج اور تیوہاروں کے بیان سے پرہیز نہیں کرتا۔ اس زمانے کے مرثیئے مذہبی جوش کو سادگی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ "سب رس" کے مصنف نے انسانی صفات اور نیکیوں کو بھی شخصیت کا جامہ پہنا کر بحث و مباحثہ میں حصہ لینے کا موقع دیا ہے۔ دکنی ادب کی تکمیل ولی دکنی کے ساتھ ہوئی۔ اُس کے جذبات سلجھے ہوئے اور فطری ہیں۔ وہ اس معصوم بچے کی طرح ہے جس کو نئے جواہر ریزے مل گئے ہوں اور وہ ان سے ہر طرح کے گھروندے بنا کر اپنے تصور کے مطابق کھڑے کر رہا ہو۔ مگر ولی کی معصومیت اس لئے چھپ جاتی ہے کہ اگر وہ ایک نئے ادب کی پیدائش کرتا ہے تو ساتھ ہی اُسے ایک دوسرے عظیم الشان فارسی ادب کی وراثت بھی ملی ہوئی ہے، مگر اُس کی شخصیت کے طبع زاد عناصر کھلے پڑتے ہیں، کس معصوم جذبہ کے ساتھ وہ اعلان کرتا ہے۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سی کہونگا　　جادو ہیں ترے نین غزلاں سے کہوں گا
دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی　　یہ کشورِ ایراں میں سلیماں سے کہوں گا

جب ولی کے اثر سے دہلی میں شاعری شروع ہوئی تو یہ طفلانہ جذبہ پہیلیوں میں بھی ظاہر ہوا اور آبرو وغیرہ جنہوں نے ولی کے اثر میں شاعری شروع کی وہ دکنی طریقہ کے پیرو رہے۔ مگر وہاں فارسیت کا اثر زیادہ تھا۔ ایک عظیم الشان تمدن کے اثرات اُن پر مستولی تھے، تصوف درجۂ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ رفتہ رفتہ دکنی طرز کے خلاف ایک صدائے مخالفت بلند ہوئی اور اختلاف آرا کے باوجود نئے طرز نے برتری حاصل کر لی۔ اس طرز

میں شاعر اپنے جذبات و احساسات میں اتنا محو ہو کہ وہ بیرونی دنیا کو صرف اُسی دنیا کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ عشق مجازی صرف عشقِ حقیقی تک رسائی کا زینہ ہے۔ دہلی کے اکثر شعرا اس علوی اصول کے پابند ہیں اور اس کا سلسلہ میر درد سے لے کر غالب تک ملتا ہے۔

مگر شروع ہی سے تصادم کے اجزا موجود تھے۔ اصلیّت سے ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جانا ممکن نہیں۔ سودا کی شاعری میں علویت کے ساتھ وہ اصلیت کا جوہر بھی ہے جو عموماً ان کی ہجو میں اور کہیں کہیں غزلوں میں موجود ہے۔ اس طرح سودا کی حیثیّت ادبی دنیا میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ مبالغہ ان کی خُو بُو میں شامل تھا، مگر یہ مبالغہ دو طرفہ تلوار کی طرح ہے، وہ جب کبھی خیالی دنیا میں مبالغہ کی طرف مائل ہوتے ہیں تو تشبیہوں اور استعاروں کا طلسم باندھ دیتے ہیں اور جب اصل بیانی پر آتے ہیں تو حقیقت اور دہلی کی بربادی کے حسرت بھرے مناظر پُر اثر لہجے میں کھینچتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں یہ دونوں عناصر علویت اور اصلیّت حیرت ناک طریقہ پر متحد ہو جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے غالب کی تحریریں ادبی ارتقا کی تکمیل ہیں کہ ان میں دونوں عناصر ہمیشہ کے لئے متحد ہو گئے ہیں۔ اُن میں اصلیّت محض ایک ذریعہ ہے بلند خیالی کا، اور اُن کی بلند خیالی کبھی اصلیت سے منقطع نہیں ہوتی۔

مگر غالب کی روایت کی کسی نے پیروی نہیں کی۔ اُن سے پہلے ہی جرأت نے معاملہ بندی کی ابتدا کی تھی، جو اصل بیانی کا ایک شعبہ ہے۔ لکھنؤ کے شعرا، جو اس دنیا میں دوسری دنیا سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے اس اصل بیانی کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ وہ شرمناک سے شرمناک مناظر کو لفظی پیرایہ دینے سے عار نہیں کرتے۔ انہوں نے اصلیّت کو صحیح لفظوں میں نباہا۔ اُن کی دنیا ایسی تصویر کی طرح ہے جس میں روشنی اور تاریکی فطری طریقہ پر ملی ہوئی ہو۔ مگر اصل نگاری کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ فنّان کریہہ جزئیات کو بھی اپنی شخصیّت میں قید کر لیتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات اتنی بے محابا جزئیات نگاری تنفر پیدا کر دیتی ہے، مگر یہ تسلیم کرنا قرینِ انصاف ہے کہ فن کا تقاضا یہی ہے کہ کسی قسم کی روپوشی نہ اختیار کی جائے، اور زندگی کا صحیح عکس بغیر کسی پہلو کو چھپائے پیش کیا جائے اور اس فن کی تکمیل کا سہرا لکھنؤ کے شعرا کے سر ہے۔ اس لحاظ سے استاد ناسخ اس نئے زمانے میں اصل نگاری کے علمبردار ہیں۔ مصحفی اور آتش کی قدر کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان نظریوں کے تصادم میں وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکے، اور خاص طور پر مصحفی اس عدم توازن کے باعث اولیں صف میں جگہ حاصل کرنے سے مجبور رہے۔ لکھنؤ میں اصل نگاری کی ایک زیادہ خالص شکل (اس لئے کہ وہ ہمعصر دنیا کو چھوڑ کر ایام ماضی کی عکاسی کے درپے تھی) اُس زمانے کے مراثی میں ملتی ہے۔ اس میں اصل نگاری سے تنفر کا عنصر الگ کر دیا گیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مرثیہ صرف اُسی جگہ اور اُسی زمانے میں پھیلا ہے جہاں ان دنوں اصل نگاری رائج تھی یعنی دکن اور لکھنؤ میں۔ اور مذہبی عنصر کی موجودگی نے اس میں شک نہیں کہ اس رجحان کو تیز کر دیا۔

اصلیت نگاری میں ایک نقصان یہ بھی ہے کہ انسان کے روحانی جذبات پس پشت جا پڑتے ہیں اور بیرونی پیرایہ اور اندرونی تاثرات میں توازن قائم نہیں رہتا۔ لکھنؤ میں یہی ہوا۔ امانت اور دوسرے درجہ کے دیگر شعرا اندرونی عناصر کو بھول گئے اور انہوں نے

اس توازن کو تباہ کر دیا جو فن کی اصلی صفت ہے۔ صرف مثنوی میں یہ صفت باقی رہی، اور اس میں بھی تنزل کے عناصر نسیم کی مثنوی کے سحرالبیان کے ساتھ مقابلہ کرنے سے دریافت ہو سکتے ہیں۔

اس عرصے میں ایک نیا عنصر اپنا کام کر رہا تھا۔ کلکتہ میں انگریزی اثر کے ماتحت نثر اردو کو ترقی دی جا رہی تھی۔ اس نئے اثر کا مقصد صرف افادی تھا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلیت نگاری کو تقویت پہنچی اور اس وقت تک اردو ادب کو جو ترقیاں ہوئی ہیں وہ سب اسی اصل نگاری پر مبنی ہیں۔

اس مختصر اور تشنہ نظر سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اردو ادب میں ہمیشہ یہ دو عناصر کبھی متصادم اور کبھی الگ الگ بروئے کار رہے ہیں اور اردو کے ادبی ارتقا کے مطالعہ کا مقصد فی الحال یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح نسلاً بعد نسلٍ کبھی اس عنصر اور کبھی اُس عنصر کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس سے کسی ایک عنصر کی برائی مقصود نہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ مطالعہ کا یہ طریقہ اختیار کرنے سے اردو ادب پر ایک نئی روشنی ڈالی جا سکتی ہے، اور مستقبل کے نقاد کا فرض ہوگا کہ وہ ادبی ارتقا کے منازل کو خلوصِ قلب اور احتیاط کے ساتھ دریافت کرے۔ تعریف و الزام تنقید کا مقصد نہیں۔ نکتہ چین نقاد دیمک کے کیڑوں کی طرح ہیں جو کتابیں کھا کر کتابیں پیدا نہیں کرتے۔ اصلی تنقید ادبی ارتقا کے بے تعصب مطالعہ کا نام ہے +

ظفر الاحسن

---

ایک ڈاکٹر نے اپنی روتی ہوئی بیوی سے کہا، کہ آنسو فضول شے ہیں۔ میں اُن کا تجزیہ کر چکا ہوں۔ اُن میں تھوڑا سا فاسفری چونا تھوڑا سا نمک باقی نرا پانی ہوتا ہے۔

کسی نے کہا "معلوم نہیں اتنے لوگ سمندر پر کیوں جاتے ہیں جب اتنے وہاں مر بھی جاتے ہیں۔" اُس کے دوست نے جواب دیا "لیکن تمہیں معلوم ہے کہ اتنے لوگ بستر پر کیوں لیٹتے ہیں جب اتنے لوگ بستر ہی پر جان تک دے دیتے ہیں۔"

ایک اخبار نے اعلان کیا کہ ہم "طبع زاد نظم" بھی آئندہ انہیں شرائط پر درج کریں گے جن پر ہم اشتہارات درج کرتے ہیں۔"

کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ پھر تعجب ہے کہ اکثر عشاق کو اپنے معشوق میں وہ کچھ نظر آتا ہے۔ جو باقی دنیا کو کہیں نظر نہیں آتا۔

گلچیں

# ہولے ہولے

(۱)

میگھ[1] پریم کا چھایا مَن میں پریتم بول پپیہا بولے
برکھا رُت اور رات اندھیری ناؤ پریم کی کھائے جھکولے
پورم[2] پار بھری ہے گنگا کھیون ہارے ہولے ہولے

(۲)

جَل بھر آیا نین کنول میں آنسوُن موتی پرتھوی رولے[3]
اِس بہتی دھارا میں پریمی دھولے اپنے مَن کو دھولے
پورم پار بھری ہے گنگا کھیوَن ہارے ہولے ہولے

(۳)

سنبھل سنبھل رے پریم کے جوگی من کی گانٹھ نہ کوئی کھولے
دیکھ دیکھ انمول سمے ہے، اپنے مَن ہی مَن میں رولے

---

[1] میگھ یعنی بدلی، [2] پورم پار یعنی بھرپور۔ ہر طرف بھری ہوئی [3] رولے یعنی اکٹھا کرلے۔

پورم پار بھری ہے گنگا کھیون ہارے ہولے ہولے

(۴)

نیند پریم کی سب سے پیاری دُکھ سَہہ لے پھر جی بھر سولے
ریت یہی ہے اس نگری کی پہلے مَن کی مایا کھولے
پورم پار بھری ہے گنگا کھیون ہارے ہولے ہولے

(۵)

آگ برہ کی اَنگ جلاوے ہِیہہ[1] دھڑکن کے پڑے ہنڈولے[2]
تن میں پران رَہَنْ نہ چاہیں جلدی جلدی ناڑی[3] ڈولے
پورم پار بھری ہے گنگا کھیون ہارے ہولے ہو

**مقبول**

---

[1] ہِیہہ یعنی دِل۔ مطلب یہ ہے کہ تلاطم جذبات سے روح پریشان ہے۔ (۲) ایک قسم کا جھولا ہے
[3] ناڑی یعنی نبض

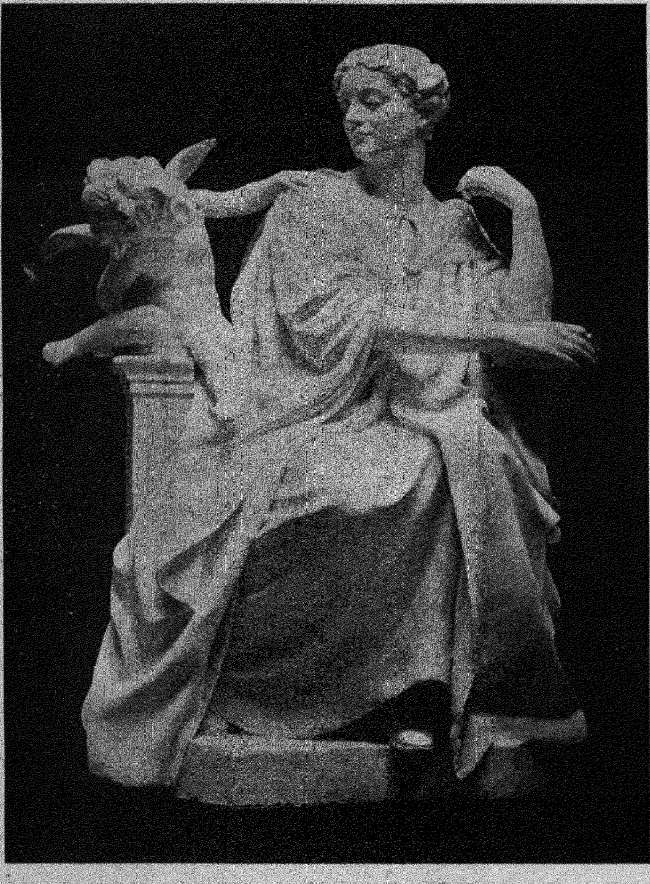

اضبی

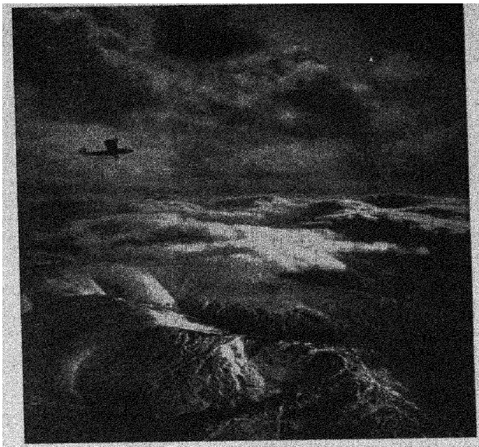

پرواز

مشہور ہوا باز خاتون مس ایمی جانسن

**فیروزہ۔** (جیسے کسی سوچ میں ہو) ہوں!

**اسلم۔** کیوں یہ ہوں کیسی ؟

**فیروزہ۔** کچھ نہیں . . . اور . . . میں سوچ رہی ہوں کہ ابا اور اماں اس وقت کیا باتیں کر رہے ہوں گے۔

**اسلم۔** یہ تو میں نہیں مانتا۔ کوئی اور بات ہوگی۔ یہ جھوٹ بولنا کب سے سیکھا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کیا سوچ رہی تھیں ؟

**فیروزہ۔** بتانے والی بات نہیں۔

**اسلم۔** نہیں بھئی فیروزہ ضرور بتاؤ۔ تمہیں قسم ہے جو نہ بتاؤ۔

**فیروزہ۔** اچھا پھر بتاؤں گی۔

**اسلم۔** نہیں ابھی ابھی

**فیروزہ۔** اچھا کل سہی

**اسلم۔** (اسے بازو سے پکڑ لیتا ہے) ذرا میری طرف تو دیکھو۔ بتاتی ہو یا نہیں۔ اب منہ کیوں پرے کئے جا رہی ہو۔ بتا دو۔

**فیروزہ۔** چھوڑ دیجئے (بازو چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلم دوسرے بازو سے بھی پکڑ لیتا ہے) خدا کے واسطے چھوڑ بھی دیجئے۔ اماں نے دیکھ لیا تو

**اسلم۔** تو کیا، دیکھ لیں۔ اب اُن سے کیا واسطہ، تم میری ہو اُن کی ؟

**فیروزہ۔** اچھا یہ باتیں تو پھر کر لیجئے اب چھوڑ تو دیجئے

**اسلم۔** پہلے بتا دو نہیں تو میں نہیں چھوڑوں گا خواہ صبح ہی ہو جائے۔

**فیروزہ۔** تو آپ زبردستی پوچھتے ہیں! اس طرح تو میں نہیں بتاتی۔

**اسلم۔** زبردستی! (بازو چھوڑ دیتا ہے) اچھا یہ لو نہ بتاؤ (چلنے کو قدم اٹھاتا ہے)

**فیروزہ۔** (ہنستے ہوئے) دیکھا نا یوں چڑاتے ہیں!

**اسلم۔** اچھا!! (مڑ کے)

**فیروزہ۔** (ایک قدم ہٹتے ہوئے) اب نہ پکڑنا، دیکھو نا اماں کتنی دور چلی گئی ہیں۔ وہ نہ ہو کل سے سیر ہی بند ہو۔

**اسلم۔** تو پھر بتاتی کیوں نہیں ہو اتنی بھی ضد کیا، پھر کہتی ہو تمہاری کونسی بات نہیں مانی!

**فیروزہ۔** تو میں آپ کی کس بات سے انکار کرتی ہوں!

**اسلم۔** میں تم سے کہتا ہی کس چیز کو ہوں۔

**فیروزہ۔** توبہ! توبہ!! آپ کسی چیز کو کہتے ہی نہیں! واہ!

**اسلم۔** تو پھر یہ کیوں نہیں بتا دیتیں؟

**فیروزہ۔** تو ہے ہی کونسی بات۔ یونہی خیال آیا تھا۔

**اسلم۔** کیا!!

**فیروزہ** (شرما کے) یہی کہ اب تو آپ کے اصرار سے بھائی اسلم کہہ لیتی ہوں، پھر کیا کہا کروں گی؟

**اسلم۔** بس!!

**فیروزہ۔** یہ بس ہی ہُوا!

**اسلم۔** (پیچھے سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے) تو اچھا بتاؤ تمہیں مجھ سے محبت ہے؟

**فیروزہ۔** دیکھئے تو سہی کوئی دیکھ لے گا۔

**اسلم۔** اس وقت کون کمبخت یہاں بھٹکتا ہوگا! (پیچھے دیکھ کے) یہاں تو آدم ہے نہ آدم زاد

**فیروزہ۔** تو اس وقت اس سوال کی ضرورت ہی کیا پیش آگئی؟

**اسلم۔** تو پھر بتانے میں بھی کیا حرج ہے!

**فیروزہ۔** (ذرا شوخی سے) مگر مجھے کیا معلوم!

**اسلم۔** اچھا! اب معلوم ہی نہیں لو ذرا بتاؤ تو سہی۔

**فیروزہ۔** کہہ تو دیا مجھے پتہ نہیں

**اسلم** (مذاق سے دونوں ہاتھ اُٹھا کر تھیئٹر کے انداز میں) خدایا میرا اس خوبصورت اور شیریں لیکن نہایت شوخ و شریر سیم تن سی کیسے گزارا ہوگا جو اپنے تایازاد بھائی کی منکوحہ ہو کر بھی اُس سے یوں ضد کرتی ہے۔

**فیروزہ۔** (ہنستے ہوئے) خدا کے واسطے آہستہ آہستہ

**اسلم۔** (ذرا آہستہ آواز سے) خدایا مجھے اس حسین فتنے سے بچائیو۔

**فیروزہ۔** بھائی اسلم خدا کے لئے ہر بات میں مذاق نہ کیا کیجئے

**اسلم۔** تو بتاتی کیوں نہیں ہو۔ بتاؤ نہ ہے کہ نہیں!

**فیروزہ۔** اچھا، ہے۔

**اسلم۔** ہے! خیر شکر ہے! اب بتاؤ کتنی ہے!

**فیروزہ۔** یہ میں کیسے بتاؤں؟

**اسلم۔** کچھ تو کوشش کرو۔

**فیروزہ۔** اچھا اتنی (دونوں ہاتھ پھیلا کے بتاتی ہے)

**اسلم۔** کُل!

**فیروزہ۔** ہاں تو اور آپ کو کتنی چاہیئے؟

**اسلم۔** (مسکراتے ہوئے) کل تو اس سے زیادہ تھی

**فیروزہ۔** کل کا دن کل تھا!

**اسلم۔** واہ یہ خوب کہتی ہو (فیروزہ کی کمر کو بھینچتے ہوئے) روز اسی نسبت سے گھٹاتی گئیں تو دسمبر تک صفایا ہو جائے گا۔

**فیروزہ** (جسم کو لچک دے کر اسلم کے بازو کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے) اچھا یہ تو اب چھوڑ دیجئے، کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ آپ ابا جان کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔

**اسلم۔** تو دیکھتا کون ہے۔ پیچھے کوئی ہے نہیں اور پھر میرے بازو پر تمہارا برقع پھیلا ہوا ہے۔

**فیروزہ۔** پھر بھی دیکھئے نا ہم کتنی دور رہ گئے ہیں، ذرا جلدی جلدی ہی چلئے۔

**اسلم۔** (کچھ دیر چپ رہنے کے بعد) میں کہتا ہوں فیروزہ کاش تمہاری کوئی تصویر ہی ہوتی۔

**فیروزہ۔** کیوں؟

**اسلم۔** میں اپنے پاس ہی رکھتا۔ ابھی تین مہینے اور ہوں گے۔

**فیروزہ۔** ماشاءاللہ اب آپ سے تین مہینے کاہے کو کٹتے ہیں، خواہ پتہ بھی نہ چلے کہ کب گزر گئے، میں جانتی ہوں آپ کو بھولے سے بھی کبھی یاد نہیں کرتے اور دن کاٹنے کو تصویریں مانگتے ہیں!

**اسلم۔** بھئی تم جیسا تو شکی دنیا میں کوئی آدمی نہ ہوگا۔ تمہیں کبھی یقین بھی آئے گا کہ نہیں ...... (جبلی ظرافت غالب آتی ہے) میں پہروں تمہاری یاد میں رویا کرتا ہوں اور موتیوں کی لڑیاں پرو دیا کرتا ہوں۔

**فیروزہ۔** جی ہا! کیوں نہ ہو، وہ کون ہے مس لال آپ کی ہم جماعت چھوٹے بھائی بتایا کرتے ہیں، اُسے موتیوں کی لڑیاں پرو کے دیا کرتے ہوں گے۔

**اسلم۔** توبہ نعوذ باللہ وہ تم نے دیکھی نہیں، خدا نہ دکھائے۔

**فیروزہ۔** جی میں کیوں دیکھوں! آپ کی قلعی کھل جائے نا۔ چھوٹے بھائی تو کہا کرتے ہیں کہ بہت خوبصورت ہے۔

**اسلم** لعنت بھیجو اس پر۔ چھوٹے بھائی کی مجھے کسی نہ کسی دن ضرور مرمت کرنی پڑے گی۔

**فیروزہ** (ہنستے ہوئے) کیا مس لال کی یاد میں؟

**اسلم** (خود بھی ہنستے ہوئے) اچھا اب دفع بھی کرو، کس کا ذکر لے بیٹھا کرتی ہو، تم بتاؤ تمہاری کوئی تصویر بھی ہوگی

**فیروزہ**۔ کیوں میں کس دن تصویر کھنچواتی پھری ہوں۔

**اسلم**۔ میں کہتا ہوں فیروزہ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہاری . . . . . . .

**فیروزہ**۔ کیوں رُک کیوں گئے؟ کیا جی چاہتا ہے آپ کا؟

**اسلم**۔ کچھ نہیں جانے دو۔

**فیروزہ**۔ نہیں بھئی ہم ضرور پوچھیں گے؛ آپ کو بتانا ہوگا۔

**اسلم**۔ نہیں نہیں کوئی خاص بات نہیں۔

**فیروزہ**۔ تو بتا دیجئے نا، کیا آپ میری ضد کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔

**اسلم**۔ نہیں تو، مگر وہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔

**فیروزہ**۔ کیا نہیں ہو سکتا؟ میری ذات کے متعلق ہے کیا؟ آپ بتائیں تو سہی؟ کونسی ناممکن بات ہے؟

**اسلم**۔ اصل میں فیروزہ، میں سوچتا ہوں کہ جو کچھ بھی میں اندازہ لگا سکا ہوں تمہارا جسم بہت ہی سڈول اور خوبصورت ولطیف ہے۔

**فیروزہ**۔ (مسکراتے ہوئے) میرے جسم کو آپ رہنے دیں، اپنی بات بتائیں۔

**اسلم**۔ یہی تو بات ہے۔

**فیروزہ**۔ کیا!!

**اسلم**۔ تمہیں تو معلوم ہی نہیں مگر مجھ سے پوچھو جب تم گھر میں چلتی ہو تو بعض دفعہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔

**فیروزہ** (شرماتے ہوئے، بات ٹالنے کی خاطر) تو کیا میں اتنی ہی بدصورت ہوں!

**اسلم**۔ (اب کی تو فیروزہ کی کمر کو بھینچ کے اپنے سے بغل گیر کرتے ہوئے) اس کا جواب تو یہی ہے۔

**فیروزہ**۔ (اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے) خدا کے لئے وہ دیکھو ابّا جان کھڑے ہو گئے ہیں، کہیں دیکھ ہی نہ لیا ہو۔

**اسلم**۔ بھئی بالیوں سے بھی زیادہ بعض دفعہ کوئی تکلیف دہ چیز نہیں ہوتی۔

**فیروزہ**۔ توبہ کرو توبہ۔

**اسلم**۔ میں نے کوئی کفر کا کلمہ تو نہیں کہا۔ اب تم ہی دیکھو کہ چچا جان ہیں کہ مڑ مڑ کے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ بھئی کیوں؟

**فیروزہ۔** (ہنستے ہوئے) آپ کو جانتے ہوں گے کہ ذرا آنکھ بچی اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔

**اسلم۔** اور کیا؟

**فیروزہ۔** کچھ نہیں، آخر انہیں کبھی تو پیچھے دیکھنا ہی چاہیئے کہ ہم ہیں بھی کہ غائب ہو گئے ہیں اور اگر نہ دیکھیں تو ایسے معلوم ہونے لگتا ہے گویا دانستہ طور پر پلٹ کے دیکھنے سے پرہیز کر رہے ہیں۔ مجھے تو سخت شرم سی آنے لگتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

## دوسرا سین

(شام کا وقت ہے۔ ایک جوان آدمی سوٹ پہنے ہوئے، چھڑی لئے اور ایک خاتون ساڑھی میں ملبوس پیچھے دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ سورج غروب ہو رہا ہے، مغرب کی جانب افق پر سنہری، گلابی، ارغوانی رنگ بکھرے ہوئے ہیں، کہیں سے زرد گلاب کی کیف آور خوشبو ہوا کو مہکا رہی ہے سڑک کے ایک طرف سفیدے کے راست قامت، بلند درخت، دھندلکے میں چمک رہے ہیں۔ نزدیک و دور کوئی اور بشر دکھائی نہیں دیتا۔ خیال ہوتا ہے جیسے یہ دلپذیر سماں محبت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے)

**جوان آدمی** (چھڑی گھماتے ہوئے) فیروزہ بھئی تم برا نہ مانو تو میں ضرور کہوں گا کہ یہ جو تم نے باورچن رکھی ہے مجھے بہت ناپسند ہے۔

**فیروزہ۔** پر کیوں؟

**جوان۔** دیکھتی نہیں ہو غلیظ کتنی ہے اور پھر میں نہیں جانتا اگر کسی کو دعوت دینی پڑ جائے تو یہ کیا پکا سکتی ہے۔

**فیروزہ۔** نہیں تو، بالکل ہی بُری نہیں، اور پھر آپ جانتے ہیں باورچنیں ملنی کتنی مشکل ہیں۔ باورچی اور دکھ دیتے ہیں۔ پہلے خانساماں کو آپ ہی نے نکالا تھا۔

**جوان۔** اصل میں وہ اتنا بُرا تو نہ تھا۔ مگر اس کا نام بھی اسلم تھا اور بعض دفعہ بہت مشکل پیش آ جاتی تھی، کوئی دوست آ کے مجھے پکارے تو میاں اسلم کا جھگڑا اور تمہارے ابا اُسے آواز دیں تو میں کئی دفعہ اپنے کمرے سے بھاگا بھاگا گیا ہوں کہ کیوں خفا ہو رہے ہیں۔

**فیروزہ۔** (ہنستے ہوئے) ہاں آپ کو یہ الجھن ضرور تھی۔ مگر وہ سودے سلف اور دوسری چیزوں میں سے بہت کاٹتا کھاتا تھا۔ اب یہ باورچن کتنا چراتی ہو گی۔

**جوان۔** خیر تمہاری مرضی۔ جانتی ہو میں تمہارے خانگی معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتا مگر مجھے ڈر تھا کہیں کسی دن شرمندہ نہ کرائے

**فیروزہ۔** نہیں تو، میں خود اس کی نگرانی کرتی ہوں، امید ہے بہت کچھ سیکھ جائے گی۔

**جوان۔** مگر کب تک! میاں صغیر ابھی کل ہی کہہ رہے تھے کہ بھئی تم نے بہت مدت ہوئی ہماری دعوت نہیں کی، ہماری بیوی تمہاری میم صاحبہ سے ملنا چاہتی ہیں۔

**فیروزہ**۔ کون ہے یہ آپ کے صغیر صاحب کی بیوی؟

**جوان**۔ کون ہے؟ عورت ہے اور جہاں تک میں نے سنا ہے چندے آفتاب چندے .....

**فیروزہ**۔ ہاں ہاں وہ تو میں سب کچھ جانتی ہوں، مگر ہے کہاں کی، اور کیسی ہے، کن کی لڑکی ہے؟ جانتے ہو میں ننھی کے چلہ میں تھی، میں تو ان کی شادی پر نہ جا سکی تھی۔

**جوان** (ننھی کا نام سن کر) آج ننھی کو عبداللہ ابھی ہوا خوری سے واپس نہیں لایا تھا۔

**فیروزہ**۔ میں نے ہی کہہ دیا تھا کہ باغ میں اسے رکھے ہم اسے وہیں ملیں گے۔

**جوان**۔ تو پھر کب کرتی ہو میاں صغیر کی دعوت۔ آخر دعوت تو دینی ہی ہوگی۔ یہاں آئے ہوئے انہیں دیر تو نہیں ہوئی مگر آخر صغیر جانتی ہو میرا .......

**فیروزہ**۔ ہاں ہاں وہ تو میں کئی دفعہ سن چکی ہوں۔ آپ یہ بتائیے کہ کب انہیں بلانا چاہتے ہیں۔

**جوان**۔ اس ہفتہ میں تو مشکل ہے۔ کل مجھے ایک جگہ چائے پر جانا ہے اور پرسوں دفتر میں کام ہوگا۔ یہ دو تین دن اور ہاں ہفتہ کے دن شیخ صاحب کے ہاں کھانا ہے۔ صغیر کو بھی بلا رکھا ہے، یہ ہفتہ تو پورا ہو گیا۔

**فیروزہ**۔ تو چلو اتوار کو سہی۔ مگر اتوار کو بھی نہیں، اُس دن تو مجھے صفیہ کے ساتھ بازار جانا ہے کچھ کپڑا، کچھ اور چیزیں خریدنی ہیں۔

**جوان**۔ (مسکراتے ہوئے) اگلی اتوار تک جناب کو کہیں ملنے جانا ہوگا۔ اور اس سے اگلی اتوار کو شاید اور سہیلی آ رہی ہوگی۔

**فیروزہ**۔ جی! جیسے کل آپ کی چا، اور پرسوں آپ کے شیخ کی دعوت اور اترسوں .....

**جوان** (ذرا بگڑ کے) تو میں دعوت سے انکار کر دیتا ہوں، یا یوں کہو تو پرسوں دفتر نہیں جاتا، جیسے تم کہو .....

**فیروزہ**۔ اب آپ ناحق مجھ سے تو ناراض ہوں نہیں، کیونکہ میں نے صفیہ سے 'شاپنگ'[1] کا فیصلہ تو بہت دنوں سے کر رکھا ہے اور لڑکوں کی قمیصوں کے لئے کپڑا لانا ضروری ہے، اپنے لئے میں گرگابی لاؤں گی، ننھی کے لئے سویٹر اور ......

**جوان**۔ ہاں ہاں، بالکل! میں بھول گیا تھا یہ چیزیں بھلا کیسے رک سکتی ہیں، ان کا لانا تو سخت ضروری ہے۔

**فیروزہ**۔ آپ ناحق الجھتے ہیں، آپ ہی جانیں آپ کی بیگم صغیر صاحبہ جو آئیں تو اچھا رہے کہ لڑکوں کی قمیضیں پرانی ہوں اور نہ اُن کی جرابیں ہوں اور نہ میرے پاؤں میں کوئی کام کی گرگابی ہو۔

**جوان**۔ آنجناب کی اس وقت کتنی گرگابیاں گھر میں ہونگی۔

**فیروزہ**۔ بس یہی تین چار ہوں گی، ایسی کونسی زیادہ ہیں اور سبھی دس دس بیس بیس دفعہ پہنی جا چکی ہیں

**جوان**۔ ٹھیک! بالکل! لے آئیے میں غلطی پر تھا۔

---

[1] زار سے اشیا خرید کر لانے کو کہتے ہیں۔

**فیروزہ۔** آپ واقعی بُرا مانتے ہیں تو میں نہیں جاؤں گی۔ صفیہ کو آج شام ہی کہلا بھیجتی ہوں کہ کام پڑ گیا ہے۔ اس اتوار کو فرصت نہیں ہوگی۔ تو پھر آپ کل چا سے واپس آتے ہوئے ننھی کا سوئیٹر اور لڑکوں کے لئے کپڑا اور چھ شیشے کے عمدہ سے گلاس اور کچھ چینی کی اچھے ڈیزائن کی پلیٹیں اور چا کا . . . . . . .

**جوان** (ہنس کر) بڑی چالاک ہو۔ جانتی ہو کہ یہ عذاب مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ بس چیزیں گننی شروع کر دیں۔

**فیروزہ۔** نہیں کچھ ایسی زیادہ تو نہیں چاہئی اور تولیے اور صابن اور تھوڑا سا عطر . . . . .

**جوان۔** بھئی مجھے معاف کرو۔ میں باز آیا۔ تم خود بازار جاؤ اور صبح سے شام تک شاپنگ کرو، دعوت پیر کو کر دیں گے۔

**فیروزہ۔** آخر آپ کو چیزیں خریدنے سے کیوں نفرت ہے۔ اپنے بوٹ سوٹ معلوم نہیں کیسے خرید لیتے ہیں۔

**جوان۔** ان میں ڈر تو نہیں ہوتا کہ جناب کی منظوری لینی ہوگی جیسی پسند آئی لے لی۔ تمہاری اور گھر کی چیزیں کون خریدے۔ کون مصیبت مول لے۔ نوکر تک کی لائی ہوئی چیزیں تمہیں پسند نہیں آتیں خواہ وہ بوٹ پالش ہی کیوں نہ ہو۔

**فیروزہ۔** تو آپ جانتے ہی ہیں وہ کتنا جاہل ہے لاکھ ہدایتیں کرو، لاکھ تدابیر بتاؤ بازار میں سب سے بری چیز خرید لانے میں اسے وہ کمال ہے کہ مثال نہیں مل سکتی۔ اسے تو بس ننھی دے دو اور شام کو پریم[1] میں اسے سیر کرا لاتے اور معلوم نہیں کہاں کہاں کی۔

**جوان۔** مجھے کبھی خیال ہوتا ہے کہ کہیں ننھی کو بیٹھا چھوڑ ادھر ادھر نہ ہو جاتا ہو۔

**فیروزہ۔** نہیں بالکل ہی تو ایسا نہیں ہوگا اور اب دیکھ ہی لیتے ہیں باغ بھی آ ہی گیا ہے۔

**جوان۔** یہ احمد بھی ساتھ چلا جایا کرے۔ یہ بھی کھیل ویل آیا کرے۔

**فیروزہ۔** مگر وہ تو بڑے بھائی کے ساتھ یوں چمٹا رہتا ہے کہ پل کو جدا نہ ہو اور اکیلا تو کبھی سیر کو نہ جا۔

**جوان۔** (پیچھے مڑ کے دیکھتے ہوئے اپنے لڑکوں سے) حمید اور احمد کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

**حمید۔** (باپ کی اس توجہ سے گھبرا کے) کچھ نہیں جی!

**جوان۔** کچھ نہیں! اور ابھی تو گرما گرم گفتگو ہو رہی تھی۔

**حمید۔** یوں ہی تھی جی۔

**فیروزہ** آپ چھوڑیں انہیں نہیں اپنی ہی آم کہانیاں کہنے دیجئے۔

(اتنے میں باغ میں داخل ہوتے ہوئے دربان کے چوراہے میں جا نکلتے ہیں۔ یہاں نرم گھاس پر بہت سے بچے اور ان کی آیائیں اور نوکر ہیں۔ بچے کھیل رہے ہیں، پاس کئی ایک پریم کھڑے ہیں)

**جوان۔** یہاں عبداللہ تو دکھائی نہیں دیتا۔

---

[1] بچوں کی سیر گاڑی

**فیروزہ** ۔ (تجسس نظروں سے بچوں کی طرف دیکھتی ہوئی) وہ رہا ننھی کا پریم۔ سو رہی ہے کیا؟

**جوان** ۔ (قریب جاتے ہوئے) نہیں تو لیٹی ہوئی ہے اور یونہی ٹانگیں ہوا میں چلا رہی ہے ۔

**فیروزہ** ۔ (ننھی کو اٹھا کر چومتے ہوئے) کہاں ہے عبداللہ؟

**جوان** (دیکھتے ہوئے) وہ تو نہیں وہ اُس آیا کے پاس باتیں کرتا ہے ہنس ہنس کے اس کے ساتھ

**فیروزہ** (گھور کے دیکھتے ہوئے) وہی ہے۔ آپ آواز دیں۔

**جوان** ۔ عبداللہ! عبداللہ!!

**عبداللہ** ۔ (بہت گھبرا کے اُٹھتے ہوئے) جی۔

**جوان** ۔ کیوں بھئی اچھا انتظار ہو رہا ہے ہمارا؟

**عبداللہ** ۔ نہیں جی، ابھی ابھی ننھی کے پاس سے گیا ہوں، یہاں کوئی ڈر تو نہیں ہے، اتنے واقف نوکر ہیں۔

**جوان** ۔ خیر اب تو ہم جاتے ہیں، تم حمیدا اور احمد کو بھی اپنے ساتھ یہیں رکھو، آدھ گھنٹے تک لے آنا۔

**عبداللہ** ۔ اچھا جی!

**جوان** (واپس آتے ہوئے) یہ تو یہاں اپنا وقت آیاؤں کے ساتھ گزارتا ہے۔

**فیروزہ** ۔ دیکھی ہے وہ آیا آپ نے؟

**جوان** ۔ یونہی سرسری نظر میں تو پتلی سی موٹی موٹی آنکھوں والی دکھائی دے رہی تھی، مگر شام کا وقت ہے ۔

**فیروزہ** ۔ اگر روز یہی کچھ ہوتا ہے۔ تو ٹھیک نہیں۔

**جوان** ۔ یہ آج ثابت ہوا کہ نوکروں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے ۔

**فیروزہ** ۔ ایسی عادتوں والے آدمی کا گزارہ میرے گھر میں مشکل ہے

**جوان** ۔ ہاں ہاں سخت بُری بات ہے ۔

**فیروزہ** اور اگر یہ ننھی کی یونہی بے پروائی سے نگہداشت کرتا ہے تو خواہ اسے کوئی اٹھا ہی کے لے جائے۔ آپ نہیں پڑھتے آج اس کا بچہ کھو گیا اور کل سیر کرتے ہوئے کوئی لڑکی پریم سے اٹھا کر لے گیا۔

**جوان** ۔ بالکل، یہ بہت بُری بات ہے۔ اس کا بندوبست کرنا چاہیئے ۔ . . . . . . .

# تیسرا سین

موسمِ بہار کی ایک عنبریں شام ہے۔ سرما کی بچی کھچی تھوڑی تھوڑی سردی ہوا کی نرم اور شفیق تھپکیوں میں مل ملا کر سیر کرنے والوں کے لئے باعث تفریح وانبساط ہو رہی ہے۔ سورج غروب ہو چکا ہے آسمان پر ہلکا سا نازک اور رنگین غبار چھایا ہوا ہے۔ خوشبوئیں آس پاس کے باغیچوں سے آ آ کر سڑکوں پر مست ہوئی پھرتی ہیں۔ درخت اپنے متین اور پراسرار انداز میں ہلکے ہلکے سروں میں جھوم جھوم کر ایک مدہم اور موہوم مگر سرور انگیز نغمہ گا رہے ہیں، ساری فطرت سُن رہی ہے اسی مخمور سمے میں چند افراد سیر کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ سب سے آگے ایک معمر شخص ہے جس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی، اُس کے ساتھ ایک خاتون ہے جو اگرچہ جسم کے لحاظ سے بہت عمر کی معلوم نہیں ہوتی۔ مگر چہرے سے پتا چلتا ہے کہ اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہوگی۔ یہ اسلم صاحب اور فیروزہ ہیں۔ ان کے پانچ ایک گز پیچھے نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے۔ مگر ان سے بھی پیچھے دو شخص (ایک نوجوان اور ایک لڑکی) چُپ چاپ چلے آ رہے ہیں۔

**خاتون** (پیچھے دیکھتے ہوئے) اتنی جلدی تو نہ چلیئے، لڑکیاں پیچھے رہ جاتی ہیں اور مجھے فکر لگا رہتا ہے۔

**اسلم صاحب**۔ بیگم تمہیں تو یونہی کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اب کس بات کا فکر کر رہی ہو۔

**بیگم**۔ آپ کو تو کسی چیز کا خیال ہی نہیں ہوتا تو کیا میں بھی اندھی بنی رہوں

**اسلم صاحب**۔ مگر یہ خفگی کا کیا موقع ہے؟

**بیگم**۔ آپ کی بے پروائی بھی تو بے موقع ہی ہوتی ہے۔

**اسلم صاحب** (کچھ دیر چپ رہنے کے بعد) میں تو نہیں سمجھ سکا کہ اس وقت میں کونسی بے پروائی کر رہا ہو

**بیگم**۔ پرائی لڑکی ہے آپ کو کیوں پروا ہو!

**اسلم صاحب**۔ مگر کون؟

**بیگم**۔ ممتاز اور کون!

**اسلم صاحب**۔ مگر ممتاز کب سے پرائی ہو گئی۔ تمہاری بھانجی ہے اور مجھے پرائی لگے! کیوں؟

**بیگم**۔ آپ کہیں جان بوجھ کے تو تجاہل نہیں کر رہے۔

**اسلم صاحب** (کچھ چیں بجبیں ہوئے) مگر میں تو یہ معمے نہیں سمجھ سکتا۔

(بیگم چپ ہو جاتی ہیں۔ پیچھے سے قہقہے کی آواز آتی ہے)

**بیگم**۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ حمید سے کہہ دیجئے۔

**اسلم صاحب**۔ کیا؟

**بیگم**۔ توبہ آپ کے حافظے کو کیا ہو گیا ہے؟

**اسلم صاحب**۔ مجھے کوسنا ہو تو گھر بیٹھ کے کوس لیا کرو، یہاں آدمی سیر کو آتا ہے نہ اپنا سر کھپانے کو۔ اور پھر حمید سے جو کچھ کہنا ہو تم خود نہیں کہہ سکتیں، میرا زیادہ حق ہے اس پر؟

(کچھ دیر دونوں چپ رہتے ہیں۔ اتنے میں سڑک دائیں طرف کو مڑتی ہے۔ بیگم مڑتے وقت پھر ایک نظر پیچھے ڈال لیتی ہیں۔ دوسرے لوگ ان سے دور رہ گئے ہیں۔ وہ دونوں جو سب سے پیچھے تھے اب بھی پیچھے ہیں)

**بیگم**۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے اسے شرم نہیں آتی کہ اور بھائی بہنیں ہیں کیا کہیں گی، ہر وقت ممتاز کے ساتھ ساتھ......

**اسلم صاحب**۔ کون؟ حمید!

**بیگم**۔ اور کون!

**اسلم صاحب**۔ اچھا اب یاد آیا۔ وہ کہتی تھیں حمید سے کہنے کو۔

**بیگم**۔ شکر ہے آپ کو یاد تو آ گیا۔

**اسلم صاحب** (بیگم کی طرف دیکھ کے) یہ آج کیوں تم جلی کٹی باتیں کر رہی ہو؟

(بیگم جواب نہیں دیتیں۔ بیس پچیس گز تک یونہی خاموش چلے جاتے ہیں)

**اسلم صاحب** میں کہوں بھی اسے کیا پچیس سال کا ہو گیا ہے، نوکر ہے، مگر کہتی ٹھیک ہو یہ طریقہ اچھا نہیں۔

**بیگم**۔ میں خود اسے کہتے جھجکتی ہوں۔ منہ پھٹ ہے، بدتمیز تو نہیں مگر نہ جانے آج کل کے لوگ زبان کے اتنے آزاد کیوں ہیں ——

**اسلم صاحب**۔ اور ابھی تو ان کی منگنی ہی ہوئی ہے!

**بیگم**۔ پھر یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ بچپنے سے اکٹھے پلے ہیں، برسوں ایک جگہ رہے ہیں، ماموں کی لڑکی ہے اور اب تو بھائی یوسف نے بھیج بھی یہیں دی ہے۔

**اسلم صاحب**:۔ مگر کیا کر رہے ہیں وہ، کیا کچھ بے تکلفی کر رہے ہیں؟

**بیگم**۔ اب میں مڑ مڑ کے تو دیکھنے سے رہی۔ آخر اسے شرم نہیں تو مجھے تو اس کا اور اس کے بھائی بہنوں کا لحاظ ہے۔

**اسلم صاحب**۔ مگر وہ ہمارے ساتھ ہی کیوں نہیں چلتا

**بیگم**۔ یہ آپ اس سے پوچھیے۔ مجھے تو کسی وقت ممتاز ہی بری لگنے لگتی ہے، گھر میں کہیں بیٹھے ہو حمید کی آنکھیں تو ممتاز کے چہرے پر گڑی ہوں گی۔

**اسلم صاحب**۔ تو ان کی شادی ہی جلد کر دو۔

**بیگم**۔ بس ہاتھ سے ہی جائے!

**اسلم صاحب** (سوچ کے) مگر یہ پریشانی اور یہ ذمہ داری جو محسوس کر رہی ہو، اس سے تو نجات پاؤ گی۔

(چند لمحوں تک پھر دونوں خاموش رہتے ہیں۔ البتہ ان کے پیچھے جو لڑکے لڑکیاں ہیں، وہ ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے چلے آ رہے ہیں۔ اب حمید اور ممتاز بھی اُن میں شامل ہیں)

**اسلم صاحب** (ٹھہر ٹھہر کے بات کرتے ہوئے) تو . . . . . پھر . . . کیا علاج تجویز کرتی ہو۔

**بیگم**۔ میں کیا کہوں، کم از کم جب سیر کو آیا کریں تو ایک دوسرے کو چھوڑ دیا کریں۔

**اسلم صاحب** (آہستہ سے اور رک رک کے) مگر . . . . اے . . . . شاید ان کو آپس میں . . . کچھ . . . . . رغبت ہو۔

**بیگم**۔ (تیوری چڑھا کے) رغبت نہیں خاک ہو۔

(اس پر دونوں ایک عرصے تک چپ رہتے ہیں) . . . . . . .

**فیاض محمود**

---

"خدا جانے میرا بھائی مجھے تنہا چھوڑ کر کدھر چلا گیا؟ اکیلا کھیلنے کو دل نہیں چاہتا۔ بہار آنے والی ہے۔ باغوں میں ہر روز صبح کو کلیاں کھلیں گی اور بھونرے اُن کے ارد گرد جمع ہوں گے۔ انگور بھی پکے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھ سے اکیلے نہیں کھائے جاتے۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ میرا بھائی کہاں ہے؟ آہ! مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔ میرے بھائی کو واپس بلاؤ۔"

"ابھی تم کمسن ہو۔ تم زمانے کی نیرنگیوں سے ناواقف ہو۔ تمہاری آواز تمہارے بھائی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اُس کا چمکتا ہوا چہرہ تم دوبارہ اس دنیا میں کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی زندگی گلاب کے پھول کی طرح مختصر تھی۔ میرے پیارے! تم اکیلے ہی کھیلو۔ تمہارا بھائی بہشت میں ہے۔"

"میرے بھائی کو پرندوں اور پھولوں سے بہت محبت تھی۔ اب وہی موسم آ رہا ہے۔ جب ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ کیا میرا بھائی اُس وقت بھی واپس نہ آئے گا؟ اُس کی جدائی میں میرا یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ جگہ جہاں ہم دونوں بیٹھ کر کھیلا کرتے تھے، وہاں اب ایک پل بھی چین نہیں آتا! میرے اللہ! مجھ پر رحم کر! میرے بھائی کو واپس بھیج!"

(ترجمہ)

**محمد یعقوب**

# دل می رود ز دستم

لے لیا دل اک ہوشربا نے کانِ شوخی، جانِ حیا نے

آفتِ جانے، فتنۂ شہرے جانِ جہانے، روحِ روانے

جس کے تبسّم کے دامن میں برق کی رَو بجلی کے خزانے

وقتِ خرامِ ناز جِلو میں صبحِ چمن کے تازہ ترانے

بکھری، اُلجھی زُلفِ سیہ میں شامِ طرب کے لاکھ فسانے

جنبشِ لعلِ عہد شکن میں کتنے حیلے، کتنے بہانے

رقصاں تابِ چشمِ سیہ میں کیف کے دن شورش کے زمانے

رخ پر کافر زلف کی لہریں لمحے جیسے شب کے سہانے

گاہ بلب صد چشمۂ نوشیں گاہ بگردن تیغِ روانے
گاہ بہ خلوت سازِ خموشے گاہ بہ جلوت شعلہ زمانے
گاہ بگفتار آیۂ رحمت گاہ بہ رفتار آبِ روانے
گہ بہ تلطّف نرم نسیمے گہ بہ تحکّم سخت کمانے
گاہ بہ نورِ صبحِ یقینے گاہ بہ ابرِ شام گمانے
گاہ بہ شوخی مست غزالے گاہ بہ مستی خوابِ گرانے
گاہ بہ مسند گفتہ حدیثے گاہ بہ پہلو رازِ نہانے

شکر، کہ بختِ جوش کے عقدے
کھول دیئے پھر فضلِ خدا نے

جوشؔ ملیح آبادی

# بتانِ پشاور

ہماری زبان میں بیشمار شاعرانہ اصطلاحات کچھ اس طرح گھل مِل گئی ہیں، کہ ان کے اصل مفہوم کو لغوی معنوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا ہے، جیسے "نام خدا" سے خدا کا نام مراد نہیں ہوتا، بلکہ ہم اس لفظ کو "کم سن" کے معنی سے تعبیر کرتے ہیں، یا لفظ "دھان پان" کی بھنک پڑتے ہی کسی نازک اندام محبوب کا تصوّر ذہن میں کھینچ جاتا ہے۔

اس وجہ سے سوچتا ہوں، کہ کہیں میرے مضمون کا رنگین عنوان "بتانِ پشاور" دیکھ کر اہل دل دھوکا نہ کھا جائیں، اور خدانخواستہ گوناگوں تصورات کی بھول بھلیاں میں پڑ کر کہیں کے کہیں نہ جا نکلیں، اور اصل بھید کھلنے پر اپنی غلط فہمی نظر انداز کر کے مجھ غریب کو معتوب ٹھہرائیں۔

لہذا پہلے ہی کیوں نہ عرض کر دوں کہ یہاں "بتان پشاور" سے وہ جیتی جاگتی تصویریں مراد نہیں، جو قصہ خوانی بازار میں چلتی پھرتی ہنستی بولتی نظر آتی ہیں، خطا معاف میرا مقصد کچھ اور ہی ہے:۔

وہ یہ کہ سنہ ۱۹۲۴ء میں جبکہ ہجرت و خلافت کی ہنگامہ آرائیاں فرو ہو کر سرحد کی فضا پر ایک ہولناک سکوت طاری ہو گیا، تو مجھے سوجھی کہ بھئی یہ جمود تو اچھا نہیں اور کچھ نہ سہی آؤ وہاں چل کر علمی و ادبی ہی سلسلہ جنبانی کریں، ایسے میں سرحد سے کوئی اخبار یا رسالہ بھی نہیں شائع ہو رہا ہے، ہم خرما و ثواب کا مضمون ہو جائیگا، چنانچہ اس نصب العین کے ماتحت میں اور عزیزی ملک جمال الدین حسن بھٹی پشاور گئے، اور جس طرح بھی ہو سکا ایک ماہوار رسالہ "ہاتف" نکالا۔

میں نے پرورش پائی ہے گوالیار میں، جہاں کے پہاڑی قلعہ میں اگلے وقتوں کے جینی حکمران مہاتما بدھ کے بیشمار بُت، انواع و اقسام دیوی دیوتا، ہاتھی، گھوڑے، عجیب غریب اشکال، دنیا سے نرالے وحوش و طیور کے سنگی مجسمے اور نہ جانے کیا کیا اَلا بَلا بنا گئے ہیں۔

کیونکہ وہ قلعہ میرا گھر آنگن تھا، اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ میں بتوں کے پڑوس میں پروان چڑھا، اور شاید یہی سبب ہے کہ مسلمان ہوتے کے باوجود بتوں سے اس درجہ مانوس ہوں، کہ جہاں کہیں بھی ان کے متعلق کچھ سُن گن پاؤں انہیں دیکھنے کو جی چاہنے لگتا ہے، ان کے عقیدت مند زائروں کی تو نہ جانے ان درشنوں سے کون کون سی آرزوئیں وابستہ ہوتی ہوں گی، مگر یہاں انہیں دیکھ کر وطن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کے سبب سے بھولی بسری صحبتیں آنکھوں میں پھر کر جیسا لطف آتا ہے کیا کہوں۔

پشاور پہنچے ابھی کچھ زیادہ دن نہ ہوئے تھے، سنتا کیا ہوں، کہ لیجئے صاحب مبارک ہو وہ مہاتما یہاں بھی براجمان ہیں۔

خوب! کہاں پشاور کہاں مہاتما بُدھ، ان کی زاد بوم تو کپل وستو بتاتے ہیں، جو یہاں سے کالے کوسوں دُور نیپال کی ایک بستی تھی، بڑا دھاوا مارا، اس قدر لمبی مسافت طے کر کے کابل کے ڈانڈے تک آپہنچے، پشاور میں جو ایک اسلامی شہر ہے، مہاتما جی منگل چار کر رہے ہیں، پھر خیال آیا نہیں نہیں ؎

"آج کعبہ بن گیا، کل تک یہی بُت خانہ تھا"

ٹھیک ہے مہاتما بُدھ کا راج پاٹ تو چین جاپان تک ہے، اس لحاظ سے پشاور کیا دور ہوا، بیشک کسی زمانہ میں یہ علاقہ ان کا حلقہ بگوش رہا ہوگا۔

بہرحال کیونکہ وطن چھوٹے ایک زمانہ گزر گیا تھا، اس خبر سے مجھے بیحد مسرت ہوئی سنا گیا کہ سنہ ۱۹۰۶ء سے علاقۂ سرحد میں محکمۂ آثارِ قدیمہ قائم ہے۔ جب محکمہ قائم ہوا تو اس نے مقامی تاریخ سینہ بسینہ روایات اور دیگر قرائن و آثار کے مطابق شاہ جی کی ڈھیری، جمال گڑھی بالاحصار، تخت باہی اور سہری بہلول وغیرہ مقامات پر کھدائی کا کام شروع کر دیا طلبِ صادق بڑی چیز ہے۔ بہت جلد مادرِ گیتی نے بیش بہا خزانے اگلنے شروع کر دیئے۔

جا بجا تہ خانے پائے گئے، جن سے مٹی، پتھر، چونا، لوہا، تانبا، کانسا اور پیتل کی مختلف اشیا مثلاً برتن، بھانڈے، بُت، سکے، مہریں، زیورات اور انواع و اقسام کی اشیا برآمد ہوئیں، پھر تاریخی و علمی تحقیقات اور سخت چھان بین سے ثابت ہوا کہ یہ وہ عجائبات ہیں، جو اب سے قرنہا قرن پہلے حکومتِ گندھارا کے فرماں رواؤں نے اِن تہ خانوں میں محفوظ کئے تھے اور جن پر انقلابِ زمانہ اور مخلوق کی لاعلمی نے گہرے پردے ڈال دیتے تھے۔

جنہوں نے مجھے یہ خبر دی تھی، میں نے اُن سے سوال کیا:۔

کیوں جناب! اس وقت وہ اشیا ہیں کہاں؟

جواب ملا۔ صدر اسٹیشن کو جاتے وقت الٹے ہاتھ پر ایک عمارت ملتی ہے، "وکٹوریا میموریل ہال"۔ وہاں!

میں۔ کیا وہ یہاں کا عجائب خانہ ہے؟

فرمایا۔ بات یہ ہے کہ ان اشیا کو قرینے سے رکھنے کا پہلے سے کوئی خاص انتظام تو تھا نہیں، اور نئی عمارت تعمیر کرنے میں دقت معلوم ہوئی، اس واسطے سنہ ۱۹۱۰ء میں محکمۂ آثارِ قدیمہ نے گورنمنٹ سے اجازت لے کر وکٹوریا میموریل ہال میں برآمد شدہ اشیا سجا دیں، جب سے یہ ہال مستقلاً تو عجائب خانے ہی کا کام دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس میں طرح طرح کے جلسے سرکاری دربار اور مختلف امتحانات بھی ہوا کرتے ہیں

میں نے پوچھا:۔

کیوں جناب! کیا وہ عجائبات میں بھی دیکھ سکتا ہوں؟

جواب دیا۔ کیا ہوا، جس کا جی چاہے دیکھے، کچھ ممانعت تھوڑا ہی ہے۔

اب میں نے سوچا کہ بھئی یوں جانے میں نہ تو کچھ لطف آسکتا ہے، اور نہ ضروری معلومات حاصل ہونے کی امید کیا ہی اچھا ہو اگر

مقامی مہربانوں میں سے کوئی خوش مذاق اور علم دوست کرم فرما اس سیر میں شرکت فرمائیں، جب میں نے پشاور کے احباب پر نظر ڈالی اور غور کیا تو مخلص بندہ حضرت میاں محمد صاحب خالصؔ متخلص ثم پشاوری ایک ایسے صاحب سمجھ میں آئے، جن سے اس معاملہ میں امداد کی توقع کی جاسکتی تھی۔

گو اُس وقت اُن سے نئے نئے تعلقات قائم ہوئے تھے، تاہم یک رنگی شرط ہے۔ رابطۂ اتحاد استوار ہوتے اور مراسم بڑھتے دیر نہیں لگتی، چنانچہ دو ایک ہی نشستوں میں ہم اچھے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے، جب سیر کے ہوٹل میں عجائب خانہ کا تذکرہ چھڑا اور خالصؔ صاحب سے استدعا کی گئی تو انہوں نے بلا تامّل تائید فرمائی اور ساتھ چلنے کی صلاح پکی ہو گئی۔

حُسنِ اتفاق سے خالصؔ صاحب کے ایک دوست جناب دلاور خان صاحب کی نگرانی میں عجائب خانہ تھا اس طرح گویا مجھے مزید کامیابی کی امید بندھ گئی، خالصؔ صاحب کے ہمراہ عجائب خانہ پہنچا، تو وہاں کیا دیکھا:۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی، برآمدے کے اُلٹے بازو میں دفتر کا کمرہ ہے، ہم وہاں گئے، خالصؔ صاحب نے میرا اور ملک صاحب کا دلاور خانصاحب سے تعارف کرایا، خانصاحب موصوف جو کہ خلق مجسم ہیں نہایت تپاک سے ملے، خاطر تواضع آؤ بھگت اور پر از معلومات گفتگو کے بعد چاہتے تھے کہ تکلیف فرما کر خود ایک ایک چیز دکھائیں، لیکن میں نے شکریہ ادا کر کے گزارش کی، بندہ نواز زیادہ زیر بار احسان نہ کیجئے، آپ نے بہت کچھ بتا دیا، اب میں اپنے آپ دیکھ لوں گا، البتہ ذرا ایک فیتہ ہو تو عنایت کر دیجئے تاکہ اگر کہیں کچھ ناپنے کی ضرورت پیش آئے تو دقت نہ ہو۔

کمرہ سے نکل کر عجائب خانہ میں داخل ہوتے وقت سنگِ سیاہ کے دو بُت اِدھر اُدھر استادہ نظر آئے، یہ بُدھ ستو مورتیں ہیں جو ۱۹۰۹ء میں سہری بہلول سے برآمد ہوئی تھیں، ان میں سیدھے ہاتھ والے صاحب ۱۴۴۶ کی لمبائی آٹھ فٹ چھ انچ، سینہ کی چوڑائی دو فٹ سات انچ نکلی، اور دوسرے ہاتھ والے مہاتما نو فٹ آٹھ انچ لمبے، دو فٹ پونے چار انچ چوڑے تھے۔

یہ حضرات گوالیار یا بعض دیگر مقامات کی بدھ مورتوں کی طرح بالکل برہنہ نہیں، بلکہ کندھوں سے لے کر پنڈلیوں تک سنگ نما کے لباس پر ایک ایک چادر اوڑھے، وعظ کرنے کا سا انداز بنائے پابرہنہ کھڑے ہیں سر سے انگشت پا کے ناخون تک کچھ عجیب ہی تناسب ہے، واللہ کاریگر نے ہاتھ پیر کے انگوٹھوں اور انگلیوں کے ناخون تک اس خوبی سے ظاہر کئے جنہیں دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتے۔

سبحان اللہ جب اس لُٹی بہار اور اجڑے وقار پر، کمال صنعت سے قلوب مسخر ہو جاتے ہیں، تو خیال فرمائیے اس وقت ان مصنوعی معبودوں میں کیسی بے پناہ کشش ہو گی، جب اُن کے پرستار دادرسی کی نیّت سے اُن کے قدموں میں سر ڈال کر اپنا دکھڑا روتے ہوں گے، یا یہ نوبت پہنچی کہ اُن بتوں پر جو حاجت روائے عالم مانے جاتے تھے، ایک عبرت ناک سنّاٹا طاری ہے، اور بیچارے مجبور

انسانوں کی طرح اپنی معذوری پر خاموشی سے غور کرتے معلوم ہوتے ہیں۔

اگر ان کے بندے خدا کی قدرت سے اسی مذہب کے بسلامتی ہوش و حواس زندہ ہو جائیں اور انہیں ایسی کس مپرسی میں دیکھیں، تو شاید انہیں جھٹلائیں، اور جھگڑ دیں، کہ نہیں نہیں تم ہمارے خدا ہرگز نہیں ہو۔

کیونکہ جس وقت یہ خلق اللہ پر خدائی کر رہے تھے، تو ایسی کس مپرسی نہ تھی، ہندو تو صرف گھی میں سیندور ملا کر اپنے دیوی دیوتاؤں پر چولا چڑھاتے ہیں لیکن جیسا کہ ۱۰۰ اور ۸۰۰ سے ظاہر ہوتا ہے، ان کے پجاریوں نے ان کو سنہری روپہلی آب اور رنگا رنگ بوقلمونیوں سے آراستہ کیا تھا، اس وقت سر کا ہالہ جو انوار و تجلیات کا مظہر مانا جاتا ہے ٹوٹ گیا، ہاتھ کٹ گئے، چہرہ کا رنگ اڑ گیا، آہ کبھی زمانہ میں ان کی بارگاہ تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہ تھی، ان کا جسم بخور و عطریات سے معطر رہتا تھا، ان پر پھولوں اور جواہرات کی بارش ہوا کرتی تھی، اب فلاکت زدوں کو رونے کے لئے مزدور نہیں ملتے، بیچاروں پر وہ مصیبت نازل ہوئی جس کے ماتم میں آج سیاہ پوش نظر آتے ہیں۔

ان عجائبات میں سب سے زیادہ عجیب چیز جو واقعی بیش بہا نوادرات میں شمار کی جانی چاہیئے۔ کنشکا چیتیا[1] سے سنہ ۱۹۰۸ء سنہ ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر ڈی۔ جی اسپونر کے ذریعہ سے برآمد ہوئی، یہ کانسے کی ایک عجیب و غریب تاج نما ڈبیہ تھی، جس کے اوپر طرح طرح کی ابھری ہوئی شکلیں بنی ہوئی تھیں۔ جب اُسے کھول کر دیکھا گیا تو اندر ایک چھوٹے سے بلوری شیشہ میں مہاتما بدھ کے پھول[2] ملے، تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ وہ پھول ہیں، جو نہ جانے کن کن دقتوں سے وائی ٹیلسلہ نے کہیں سے دستیاب کر کے اس مقام پر دفنا کر یہاں پر ایک عالیشان مندر بنوایا تھا جس کو کہ اب شاہ جی کی ڈھیری کہتے ہیں۔

گو اب وہ پھول تو یہاں نہیں، برما کے کسی بدھ مندر میں بھیج دیئے گئے تھے لیکن ان دو بتوں کے درمیان ایک اسٹینڈ پر وہ بیش قیمت ڈبیا ضرور رکھی ہوئی ہے اور یہیں تہ خانوں سے نکلے ہوئے بہت سے سکے بھی ایک شوکیس میں موجود ہیں، ان سکوں اور بعض اشیا پر خروشتھی[3] زبان لکھی ہوئی ہے، یہ زبان چار سو سال قبل از مسیح میں دارا شاہ ایران نے علاقہ گندھارا میں رائج کی تھی، جو سنہ ۴ء تک قائم رہ کر بھول بسر گئی۔

اس میں شک نہیں کہ ان سکوں اور دیگر اشیا کی تحریروں میں بہت کچھ تاریخی دلچسپیاں ہیں، لیکن اس قسم کے عجائبات کی دوسرے عجائب خانوں میں بھی کمی نہیں، نیز یہاں کی قلمی کتب قدیم اسلحہ، تصاویر، زیورات، برتن اور مہروں وغیرہ کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے، لیکن یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ علاقہ گندھارا سے برآمد شدہ مہاتما بدھ کے کثیر التعداد بت ایسی چیز ہیں، کہ ہندوستان، برما،

---

[1] اس مقام کو اہل پشاور شاہ جی کی ڈھیری اور محبوبہ کا قلعہ بھی کہتے ہیں [2] جلی ہوئی ہڈیاں [3] خروشتھی زبان سریانی اور سنسکرت الفاظ کی آمیزش سے صورت پذیر ہوئی تھی، اور اسے رسم الخط فارسی کی طرح سیدھی طرف سے الٹے رخ کو لکھا جاتا تھا۔

تبت اور چین وغیرہ کا کوئی مندر، تہ خانہ، قلعہ، کھنڈر، پرانی عمارت یا دنیا کا کوئی عجائب خانہ جن کی مثال پیش نہ کر سکے گا۔

اس بنا پر در اصل تو میں ان بتوں کے متعلق ہی کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں، تاہم بر سبیل تذکرہ ان کے ساتھ دستیاب ہونے والی اشیا پر بھی کسی قدر روشنی ڈالنا کچھ نامناسب نہیں سمجھتا۔

منجملہ دیگر اشیا کے ان تہ خانوں سے کچھ مٹی کے برتن، کھلونے اور چراغ وغیرہ بھی برآمد ہوئے ہیں، ان چراغوں میں توجہ جذب کرنے والی ایک بات پائی گئی، کہ یہ گول نہیں ہیں، بتی کی جگہ ان کی ساخت ڈرائنگ نائل کی طرح ہے، گویا موجودہ طریقہ نوایجاد نہ سمجھنا چاہیئے، بلکہ یہ اس ہی وقت سے رائج چلا آتا ہے، اس امر سے بھی مجھے تعجب ہوا، کہ اتنا زمانہ گزر جانے کے باوجود بعض چراغوں میں ابھی تک اس کالونچ کا نشان باقی ہے، جو تیل اور دھوئیں کے اثر سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

یہ چراغ صرف مٹی کے ہی نہیں بہت سے سنگ سیاہ کے بھی ہیں، اور جسامت کے لحاظ سے عام چراغوں سے کہیں زیادہ بڑے، چنانچہ نمبر ۳۴۱ پان کی سی شکل کا ایک دو فٹ لمبا اور غالباً کوئی ڈیڑھ فٹ چوڑا سنگی چراغ بھی دیکھنے میں آیا۔

اچھا صاحب! آمدم برسرِ مطلب، تو جب ہم نیچے کا کمرہ چھوڑ کر سیدھے ہاتھ کی جانب نظر ڈالتے ہوئے زینہ کی طرف بڑھیں، تو راستے میں کتنے ہی بت ملتے ہیں، جن میں کسی غریب کا سر غائب، کسی کا دھڑ لاپتہ، کسی کا ہاتھ ندارد اور کسی کا پاؤں مفقود الخبر۔ اب باقی ماندہ حصے دیکھ کر قوتِ متصوّرہ کے زور سے اُن کے مکمّل جسم کی کچھ ٹوٹی پھوٹی سی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ اس بنا پر چند بتوں کے رہے سہے اعضا کا ذکر کرتا ہوں:-

ان میں سے بُت نمبر ۱۱۶۲ برآمدہ تخت باہی سنہ ۱۹۰۸ء کا چہرہ کسی قدر غنیمت ہے، اس کے سر کا ہالہ تو سیدھے رُخ سے شکست ہو گیا، باقی سر پر ایک مرصّع تاج جس میں مانگ کی سیدھ پر خوشنما جڑاؤ پھول، اس کے اوپر طُرّہ، تاج کے دائیں بائیں عجیب الخلقت پرندا اُبھرے ہوئے، دھوتی باندھے، چپلی پہنے مزے میں دیوار سے ٹکا دیکھنے والوں کو نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

اس کے بائیں پہلو پر دوسرا بت نمبر ۴۲۲ برآمدہ سہری بہلول سنہ ۱۹۰۷ء ہے جس کا سر نہ جانے کون لے گیا، ہاتھ اور پاؤں کا اگلا حصہ بھی باقی نہیں، دھڑ کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔ گردن میں ایک قسم کی ہنسلی، اس کے اوپر گُندھے ہوئے تاروں کی گُنج، جو کوڑی تک آئی ہے، کوڑی پر آ کر اس میں دو شیر دہانے بنے ہوئے ہیں، ان کے درمیان ایک موتی پڑا ہے، الٹے کاندھے سے سیدھی کوکھ تک بجائے جینو کے ایک ایسا زیور پہنے ہوئے ہے، جس میں مسلسل بہت ہی چھوٹی چھوٹی ڈھلنیاں اور ننھے ننھے سے تعویذ ہیں، سیدھے بازو پر کوئی چار انگل چوڑا چھ انگل لمبا ایک بازو بند جڑاؤ فیتے سے ایسا باندھا ہے کہ آج تک نہیں کھلا، گردن سے ناف سے چار انگل نیچے تک کا جسم برہنہ ہے اور وہ بھی پتھر کا، اس کے نیچے ہنسلی کے درمیان سے ایک خفیف سی نالی شروع کی ہے پھر کس خوبصورتی سے چپٹے راست سینہ اُبھارتے اُبھارتے مردانگی کی حد تک پہنچا کر کیسے باقاعدہ اتار کے بعد پسلیاں نمایاں کی ہیں کہ واہ وا، آگے چل کر پتلی کوکھ، ناف اور

پیڑو وغیرہ کے حصے نہایت صفائی سے واضح کرکے، ناف اور کوڑی کے درمیان ایک شکن ایسی ڈالی ہے کہ الٰہی توبہ، کیونکر توصیف کروں کفر و اسلام کا معاملہ حائل ہے۔

اس پر بھی صبر نہ آیا ظالم صنّاع نے اُسے دھوتی بندھوادی، جس میں کم از کم دو سو جھول ڈالے ہیں، جس طرح ہم ازار بند باندھتے ہیں نا! بس اسی طرح دھوتی کھلنے کا شبہ دُور کرنے کے خیال سے اس کی کمر میں ایک ڈوری لپیٹ کر اس کے دونوں پھندنوں دار سرے نیچے لٹکا دیئے ہیں، ہندو ایسی کر دھوتی نہیں ڈالتے، نہ ہم نے کبھی خوش قد پارسیوں یا نازک اندام پارسنوں کو اس قسم کا زنّار ڈالے دیکھا۔

یہ تو کچھ نرالی ہی ادا ہے کہ کسی غارت گر دین و ایمان نے پتھر کے بُت کو پتھر کی دھوتی بندھوائی، اور پتھر کی ڈوری میں سلیقہ سے ایک گرہ دے کر قرنہا قرن بعد خدا پرستوں سے جبراً اخراج تحسین و آفریں وصول کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

اِن پر اسرار بتوں کی ہئیت کذائی سے ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ اور ان کے دوسرے بہن بھائی دیوی دیوتا جو آج کل میموریل ہال یا عجائب خانہ پشاور میں جاگزیں ہیں، ہندوستانی صنعت کا نمونہ نہیں، یونانی بت تراشوں کے کمال کے مجسمے ہیں، اس وجہ سے کہ ان میں ہندوستانی عقائد کے ساتھ یونانی جذبات و معاشرت کی علامات کا اظہار نمایاں ہے، گویا یوں کہنا چاہیئے کہ چابک دست کاریگر نے ہندوستانی بتوں کو یونانی لباس زیورات اور دیگر لوازم سے آراستہ کرکے اہل نظر کے سامنے پیش کیا ہے، جب ہی تو محققین اس صنعت کو "انڈو گریک آرٹ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اہل غور و فکر کو بہت جلد یقین آجائے گا، کہ واقعی ان میں دیگر ممالک کے بُت بھی آملے ہیں، کیونکہ غیر ملکی معاشرت کا رنگ اس درجہ چڑھایا گیا ہے کہ ہم اُن کو خالص ہندوستانی تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں پاتے،

مثلاً ۱۷۷۳ کو ہی لیجئے، یہ ایک چار ہاتھ والی دیوی ہے جس کے اوپر کے دائیں ہاتھ میں یونانی وضع کا ترسول ہے، سیدھے میں شراب کا جام، نیچے کے اُلٹے ہاتھ میں ڈولچی لٹکائے، سیدھے ہاتھ میں آدمی کا بچہ، کانوں میں مندرے، گلے میں تعویذ اور چندن ہار، کسی خاص وضع کا گھاگرا پہنے کمر میں پٹکا لپیٹے، پیروں کے چپ و راست آدمی کے نیچے، اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوؤں کی ایسی کونسی دیوی ہے۔

۱۸۸۶ ایک پردار اٹلس، جس کا مثل سوائے علاقہ گندھارا کے یقیناً ہندوستان کی کسی قدیمی عمارت یا مندر میں ملنا ناممکن ہے۔

۲۴۳ چونے کا بنا ہوا انگور کا پتہ، جو دراصل ہندوستان کا میوہ نہیں۔ نیز بہت سے ایسے عجیب الخلقت جانوروں کے چہرے جو یونانی آثار قدیمہ کے سوائے ہندوستان میں نہیں پائے جاتے۔

۱۳ چونے کا ایک رُنڈ، سر تو خیر اس کا اُڑ ہی گیا، باقی اُلٹے ہاتھ میں یونانی وضع کی ڈھال، پیروں میں ایک قسم کا بوٹ جوتہ، پنڈلیوں تک موزے، رانوں تک زرہ، اس مجسمے کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، کہ یہ سپاہی لڑتا بھڑتا، گرتا پڑتا یہاں کہاں آگیا، پرانے مرعوب

سے ملا لیجئے، صاف عہد سکندری کا سپاہی معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ وضع کبھی نہیں رہی۔

الغرض ایسے کتنے ہی ثبوت موجود ہیں، جن کی بنا پر یقین کیا جا سکتا ہے، کہ یونانی حملہ کے بعد ہندوستان کے حکمرانوں نے یہ عجائبات یونانی صناعوں سے تیار کرلئے ہوں گے، اس واسطے ان میں فرمائش کنندہ اور کاریگر دونوں ہی کے عقائد اور جذبات و معاشرت کی جھلک پائی جاتی ہے۔

مجھے خوف ہے کہیں قارئین اس عجائب خانہ کی سیر سے اُکتا نہ جائیں، مجبوراً مضمون مختصر کرتا ہوں، ورنہ یہاں تو بدھ مذہب اور ہندوستان کی قدیم تاریخ کے متعلق اس قدر سامان ہے کہ برسوں لکھے جائیے اور اختتام کو نہ پہنچے، بدھ کی زندگی اور بدھ مت کی تعلیم کے متعلق ان سنگریزوں پر طرح طرح سے سبق آموز مرقعے پیش کئے گئے ہیں، اور چینی عہد کی وہ وہ تصاویر کھینچی گئی ہیں، جن کی تحقیقات مدتوں جاری رہ سکتی ہے۔

کہیں مہاتما بدھ کی پیدائش سے پہلے کی حالتیں ہیں، کہیں پیدائش کا منظر ہے، کہیں رانی مایا کا خواب، کہیں پڑھنے سیکھنے کی حالت، کہیں سیر و شکار کی زندگی، کہیں ہاتھی کا زیر کرنا اور مار ڈالنا، کہیں آزمائش اور شیطان مار کا حملہ، کہیں محل سے نکلنا، کہیں کنتھک کی وداع، کہیں اندر کی ملاقات، کہیں کاشیب باشدہ اور ردلو اور سانپ کی کرامت، کہیں سفید کتّے کا بھونکنا، کہیں چھ سال کا مجاہدہ، کہیں ہریتی[1] کی اصلاح، کہیں گھاس اور چراغوں کا چڑھاوا، کہیں پہلا وعظ، کہیں بدھ کی درخت تک جانا، کہیں سوداگروں کا چڑھاوا، کہیں مہاپدی نروان، کہیں بدھ کی ارتھی، کہیں شمشان بھومی (مرگھٹ) کا منظر، اور کہیں تبرکات کی تقسیم وغیرہ وغیرہ۔

تقریباً ۱۷۰۴ ۔ ۱ اعداد موجود ہیں، ان پر مفصل بحث کی جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں، جس کے لئے ایک طویل وقت کی ضرورت ہے، اس مضمون میں مجھے صرف اہل ذوق کو اس طرف متوجہ کرنا تھا، جنہیں ان باتوں کا شوق ہو، پشاور جاکر ہر چیز بچشم خود ملاحظہ فرمائیں اور میرے بیان سے فائدہ اٹھائیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ سرحد کا محکمۂ آثار قدیمہ ایک روز رنگ لانے والا ہے، اور اس کی سرگرم تحقیقات تاریخِ ہند پر حیرت انگیز حاشیے چڑھائے بغیر نہ رہے گی۔

میرزا فہیم بیگ فہیم چغتائی

ہمیں چاہیئے کہ ہم سبق سیکھیں نہ صرف ہنسی سے بلکہ آنسوؤں اور خطروں سے بھی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم فطرت کی تلاش میں چل نکلیں۔ جاہلوں کا ہنسی ٹھٹھا اور عقلمندوں اور شاعروں کا علم و ادب ہم یہ سب کچھ دیکھیں سُنیں اور آرام سے تفریح پائیں جو زندگی کی کشاکش کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

---

[1] ہریتی ایک عورت تھی، جس کے پانچسو بچے بتائے جاتے ہیں۔

# روحِ جذبات

مجاز کیسا؟ کہاں حقیقت؟ ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے،
یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت، جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے
میں سر سے پا تک ہوں مے پرستی، تمام شورش، تمام مستی
کھلا ہے مجھ پر یہ رازِ ہستی، کہ مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
چمک دمک پر مٹا ہوا ہے، یہ باغباں تجھ کو کیا ہوا ہے؟
فریبِ شبنم میں مبتلا ہے، چمن کی اب تک خبر نہیں ہے
یہ مجھ سے سن لے تو رازِ پنہاں، سلامتی خود ہے دشمنِ جاں
کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ جب پُر خطر نہیں ہے
نظر میں وہ گُل سما گیا ہے، تمام ہستی پہ چھا گیا ہے
چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں میں، مجھے اب اس کی خبر نہیں ہے
شمیمِ گلشن، نسیمِ صحرا، شعاعِ خورشید و موجِ دریا،
ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں، مرا کوئی ہم سفر نہیں ہے
ہوا کو موجِ شراب کر دے، فضا کو مست و خراب کر دے
یہ زندگی کو شباب کر دے، نظر تمہاری نظر نہیں ہے
پڑا ہے کیا اُس کے در پہ اصغرؔ وہ شوخ مائل ہی امتحاں پر
ثبوت دے زندگی کا مرکر، نیاز اب کارگر نہیں ہے

اصغر گونڈوی

# کیا اب بھی نہ آؤ گے

۱

تکوں گی میں کہاں تک راہ - کیا اب بھی نہ آؤ گے
مرے سرتاجِ عالی جاہ کیا اب بھی نہ آؤ گے
اب اک اک سانس ہی جانکاہ کیا اب بھی نہ آؤ گے
یہ حالت ہو گئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۲

تصور میں تمہارے جب کبھی آزردہ پاتی ہیں
مجھے چاروں طرف سے دے کے گھیرا بیٹھ جاتی ہیں
کہوں کیا آہ پھر کیا کیا مجھے سکھیاں بناتی ہیں
یہ حالت ہو گئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۳

گوارا ہو کہاں تک بیٹھ رہنا پاس نندوں کے
کہ اس بارے میں مردہ ہیں ابھی احساس نندوں کے
دلاسے اب ہوئے جاتے ہیں طعنے ساس نندوں کے
یہ حالت ہو گئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۴

مجھے اب کاٹنے کو دوڑتا ہے گھر بھی زیور بھی
بگڑتے جا رہے ہیں مجھ سے گھر والوں کے تیور بھی
اڑاتے ہیں مجھے باتوں میں اب تو جیٹھ دیور بھی
یہ حالت ہو گئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۵

نہیں میکے میں کچھ، میکے کی عشرت لُوٹ لی تم نے
وہ بے فکری وہ معصومی وہ راحت لوٹ لی تم نے
وہ دل! اُس کی مسرت ۔ اُس کی طاقت لوٹ لی تم نے
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۶

بہا جاتا ہے دل امواجِ بے تابی کے ریلے میں
رہوں گی تا بکے زندہ مصائب کے جھمیلے میں
پڑی رہتی ہوں اکثر منہ لپیٹے میں اکیلے میں
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۷

جو دن کاٹا تڑپنے میں گزاری رات رونے میں
کٹے کڑھنے میں جاڑے، گرمیاں برسات رونے میں
گنوایا میں نے اپنا رُوپ بھی ہیہات رونے میں
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۸

محبّت کی مروّت کی وہ رسمیں سب بھلا بیٹھے
وہ وعدے وہ دلاسے اُف، وہ قسمیں سب بھلا بیٹھے
خدا جانے کیا ہے کس نے بس میں؟ سب بھلا بیٹھے
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۹

جدائی کے مصائب حد سے گزرے سہ نہیں سکتی
گزرتی ہے جو کچھ دل پر کسی سے کہہ نہیں سکتی
رہی ہوں منتظر اب تک مگر اب رہ نہیں سکتی
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

(وقار انبالوی)

۵

نہیں میکے میں کچھ، میکے کی عشرت لُوٹ لی تم نے
وہ بے فکری وہ معصومی وہ راحت لوٹ لی تم نے
وہ دل! اُس کی مسرت۔ اُس کی طاقت لوٹ لی تم نے
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۶

بہا جاتا ہے دل امواجِ بے تابی کے ریلے میں
رہوں گی تابکے زندہ مصائب کے جھمیلے میں
پڑی رہتی ہوں اکثر منہ لپیٹے میں اکیلے میں
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۷

جو دن کاٹا تڑپنے میں گزاری رات رونے میں
کٹے کڑھنے میں جاڑے، گرمیاں برسات رونے میں
گنوایا میں نے اپنا روپ بھی ہیہات رونے میں
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۸

محبّت کی مروّت کی وہ رسمیں سب بھلا بیٹھے
وہ وعدے وہ دلاسے اُف، وہ قسمیں سب بھلا بیٹھے
خدا جانے کیا ہے کس نے بس میں؟ سب بھلا بیٹھے
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

۹

جدائی کے مصائب حد سے گزرے سہ نہیں سکتی
گزرتی ہے جو کچھ دل پر کسی سے کہہ نہیں سکتی
رہی ہوں منتظر اب تک مگر اب رہ نہیں سکتی
یہ حالت ہوگئی ہے آہ! کیا اب بھی نہ آؤ گے

(وقار انبالوی)

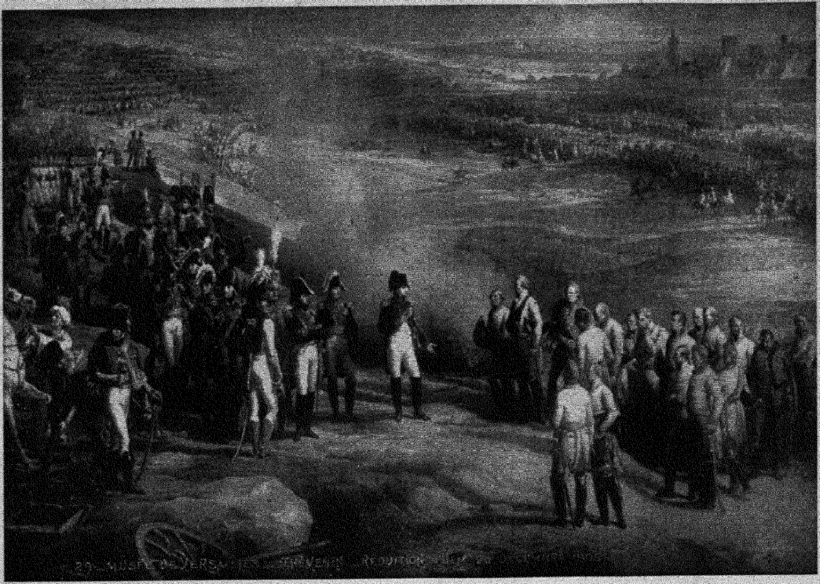

نپولین میدان جنگ میں

# غم خوار دشمن

ڈاکٹر کریگ اپنے دوست چیسٹرٹن کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا ۔ اور شام کو کسی تھیٹر یا سنیما میں جانے کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ۔ اس نے آلہ کان سے لگایا ۔ چند الفاظ سُنے ۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ جاتی رہی اور صرف یہ جواب دے کر کہ "میں ابھی آیا" آلہ کو رکھ کر کھڑا ہو گیا ۔

"چیسٹرٹن دوست آج کا پروگرام تو خراب ہوتا دکھائی دیتا ہے"۔

"کیوں خیر تو ہے"۔

"ہسپتال سے ٹیلیفون آیا ہے کہ ایک شخص موٹر سے دب کر بہت نازک حالت میں ہے ۔ غالباً ابھی آپریشن کی ضرورت ہو گی"۔

"تو پھر؟"

"میرا فوراً وہاں جانا ضروری ہے ۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو ۔ اُسے دیکھنے کے بعد فیصلہ کریں گے کہ کیا کرنا ہے"۔

"بہت اچھا"۔

دونوں موٹر میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے ۔ ڈاکٹر کریگ ٹریفالگر ہسپتال کا انچارج تھا اور دماغ کے نازک آپریشن میں کمال رکھتا تھا ۔ چیسٹرٹن چھ فٹ کا لمبا تڑنگا طاقتور جوان تھا ۔ عمر تقریباً پینتیس سال زمانۂ جنگ میں ہوابازی میں نام پیدا کر چکا تھا ۔ دونوں نے بچپن سے ایک جگہ تعلیم پائی تھی اور آپس میں گہرے دوست تھے ۔

ہسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک لاری اور موٹر کے ٹکرانے میں ایک شخص لاری اور دیوار کے درمیان آکر دب گیا تھا اور چونکہ دیر تک نکالا نہ جا سکا تھا زخموں سے بہت سا خون بہ جانے کی وجہ سے نہایت کمزور حالت میں بے ہوش پڑا ہے ۔ تمام جسم پر اور سر میں چوٹیں آئی ہیں ۔ ڈاکٹر یہ باتیں اپنے ماتحت ڈاکٹر سے سنتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کام کر رہا تھا ۔ چنانچہ بات ختم ہونے تک اس نے اپنا کوٹ اتارا ہاتھ دھوئے اور آپریشن کرنے کا خاص لباس پہن کر تیار ہو گیا ۔

چلتے چلتے اس نے چیسٹرٹن کی طرف دیکھ کر کہا "آؤ تم بھی ایک نظر دیکھ لو ۔ اگر مجھے زیادہ عرصہ ٹھہرنے کی ضرورت ہوئی تو تم چلے جانا"۔

آپریشن کے کمرے کی تیز روشنی میں ۔ جہاں داخل ہوتے ہی چیسٹرٹن کے بدن میں ایک کپکپی سی محسوس ہوئی ۔ میز پر ایک بے حس و

حرکت انسانی جسم پڑا ہوا تھا جس کی ٹانگیں، ایک بازو اور سر خون آلودہ پٹیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ چیسٹرٹن کے دل میں خیال آرہا تھا کہ خدا جانے اس شخص کی وہ چیز جسے جان کہتے ہیں اس وقت کہاں اور کس حالت میں ہوگی۔ اور کیا وہ تھوڑے عرصے میں کسی بے وفا دوست کی طرح اس کے شکستہ و پامال جسم کو چھوڑ کر اپنی خفیہ و پر اسرار جائے قیام کی طرف روانہ ہوجائے گی یا —— ؟

اتنے میں۔ چونکہ وہ قریب آگیا تھا۔ اس کی نظر جسم کے دوسرے حصوں سے گزر کر چہرے پر پڑی اور ان خیالات کا سلسلہ یکلخت منقطع ہوگیا۔

یہ چوڑا چکلا چہرہ۔ مضبوط ٹھوڑی۔ اور ہونٹ جن کے کنارے اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے اور بے ہوشی میں بھی مسکراتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس نے کہیں دیکھے تھے۔ لیکن کہاں —— ؟ کہاں —— ؟

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یاد اس کے دماغ کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ اور فراموشی دھندلے سے پردے کی طرح کسی کی پہچانی ہوئی تصویر کو چھپائے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر اپنے ماتحت سے کہہ رہا تھا "مجھے خون کی ضرورت ہے۔ تقریباً آدھ سیر تازہ انسانی خون کی، جو اس شخص کے جسم میں داخل کر دیا جائے۔ اور بہت جلد، ورنہ دماغ کا اپریشن نہیں ہوسکتا۔ اسے ہوش میں لانے کے لئے دماغ میں سے ٹوٹی ہوئی ہڈی علیحدہ کرنا ہوگی۔ نقاہت سے چند گھنٹے میں یہ مر جائے گا۔ تم جا کر براڈ کاسٹنگ کمپنی (Broad Casting Company) سے ٹیلیفون پر کہو کہ ریڈیو کے ذریعے سے اس امر کو مشتہر کر دیں کہ اگر کوئی طاقتور جوان آدمی جو پوری صحت میں ہو ایک جان بچانے کے لئے اپنا آدھ سیر خون دے سکتا ہو تو ہمیں مطلع کر کے فوراً یہاں پہنچ جائے۔"

یکایک چیسٹرٹن کے دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ وہ چونکا۔ اور ڈاکٹر کے شانے کو اپنے طاقتور ہاتھ کے ساتھ سختی سے جھنجوڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ——

"ڈاکٹر کیا میں اپنا خون دے سکتا ہوں —— ؟"

ڈاکٹر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور اپنے شانے کو ہاتھ سے سہلاتے ہوئے کہنے لگا "بھئی اس کو تو ابھی دنیا میں بہت کچھ کام کرنا ہے۔ اسے توڑے کیوں ڈالتے ہو؟"

"میں نے پوچھا تھا کہ کیا میرا خون کارآمد ہوسکتا ہے؟"

"سنا تو میں نے بھی تھا۔ لیکن تمہارے سر پر بھوت کیوں سوار ہے؟"

"یہ پھر دیکھا جائے گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میرا خون لے سکتے ہو؟ یعنی کیا میں اس قابل ہوں صحت وغیرہ کے لحاظ سے؟"

"کیوں نہیں۔ تمہارے جیسا مسٹنڈا مجھے کہاں ملے گا۔ لیکن ابھی غالباً بہتیرے لوگ آجائیں گے۔"

چیسٹرٹن نے منت کے انداز میں کہا "نہیں تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔"

ڈاکٹر نے اس کے غیر معمولی طور پر سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا۔ "بہت اچھا" کہا۔ اور خون منتقل کرنے کا سامان تیار کرنے لگا۔

اس لمحے میں۔ جس وقت بھولے ہوتے زمانے کی یاد نے۔ شاید ڈاکٹر کے الفاظ کی مدد سے۔ سورج کی کرن کی طرح چیسٹرٹن کے خیالات کے غبار میں داخل ہوکر میز پر کے بے حس وحرکت چہرے کو گویا روشن کردیا چیسٹرٹن کے دماغ میں دوروز کے واقعات بجلی کی سرعت کے ساتھ گذر گئے جو بارہ سال کے عرصے میں کسی حد تک فراموش ہو چکے تھے۔

* * *

جنگ عظیم۔ سکیپا فلو[1] (Scapaflow) ۲۳ جنوری۔ ان سالوں میں سے ایک سال جن کے حالات سے تاریخ کے متعدد صفحے سیاہ ہیں۔ اور ہر سطر کے نیچے سرخی کی جھلک نظر آتی ہے۔ سکیپا فلو۔ جہاں سمندر، آسمان چٹانیں سب سلیٹ کے رنگ کے ہیں۔ جہاں اسی رنگ کی بڑی بڑی مہیب شکلیں آہستہ آہستہ سمندر کے راستے سے اندر داخل ہوتی۔ اور توپوں کے منہ کھولے ہوئے کمال خوشی کے ساتھ باہر نکل جاتی ہیں۔ جہاں بڑے بڑے۔ بہت بڑے۔ اسی سلیٹ کے رنگ کے بھونرے آسمان سے اترتے اور خاموش ہوجاتے ہیں۔ یا ہوا میں چڑھتے اور کسی نامعلوم منزل مقصود کی جانب روانہ ہوکر نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں۔ صبح کا وقت لیکن ایسی صبح جب آفتاب تک کو دنیا کے چہرے پر کہر کے آنچل کی وجہ سے گستاخانہ نگاہیں ڈالنے کی اجازت نہیں۔

انسان کے مزاج کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ خصوصاً اس چھوٹے سے گروہ کی جو سکیپا فلو میں مقیم ہوائی بیڑے کے افسر ونگ کمانڈر فینورتھ کے گرد جمع تھا۔ کچھ مدت سے اس گروہ پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہورہی تھی اور ہر طرف سے طنز آمیز فقرے کسے جارہے تھے۔ کیونکہ برّی اور بحری وزرا اپنے ہوائی بازوؤں سے ایک خود سر کے خون کے طالب ہو رہے تھے جو کسی طرح قابو میں نہیں آتا تھا۔

جزائر برطانیہ کے شمالی گوشے ڈنکنبسی ہیڈ (Duncansby Head) سے لے کر تقریباً تین چوتھائی مشرقی ساحل کی حدود تک کئی ہفتوں سے یہ بے فکرا چکر لگا رہا تھا اور کوئی برطانوی جہاز اس کی حد نگاہ میں آکر اس کے بے پناہ تارپیڈو کی زد سے بچ کر نہ جاسکتا تھا۔ کہاں؟ کب؟ اور کس طرح اسے سامان حرب۔ خوراک تیل اور ضروریات مہیا ہوجاتی تھیں ایک معمّا تھا۔ اس کا پتا بھی نہ چلتا تھا کہ اسے برطانوی جنگی جہازوں کی نقل وحرکت اور آب دوز سرنگوں کی جائے وقوع کا علم کیسے ہوجاتا تھا

---

[1] سکیپا فلو۔ سکاٹ لینڈ کے شمالی کونے پر چھوٹے چھوٹے جزیروں کے گروہ میں یہ ایک جگہ ہے جہاں جنگ عظیم کے زمانے میں جنگی اور ہوائی جہازوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

جس کی مدد سے یہ تمام بحیرۂ شمالی میں آزادی سے پھرتا اور رات دن پہرہ دینے والے جنگی جہازوں سے بچا رہتا تھا۔

پانچ چھ مختلف جہازوں کے پسماندوں سے اس کے نمبر کی خبر ملی تھی۔ آغاز دسمبر سے اس کے کمانڈر کی بیباکی کے ساتھ اس کے کشتگانِ جفا کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پینٹلینڈ فرتھ (Pentland Firth) یعنی ایک طرح برطانوی جنگی بیڑے کے منہ میں جاکر بھی یہ اپنے تباہ کن ارادوں میں کامیاب ہو جاتا۔ یہاں تک کہ بیڑے والے آنکھیں مل مل کر رہ جاتے اور ایک دوسرے سے پوچھتے "کیا یہ صحیح ہے؟"۔ اس کا جواب اکثر اوقات گھنٹہ بھر بعد ہی کسی اور جہاز کے لاسلکی پیغام کی صورت میں ملتا کہ "ہم ڈوب رہے ہیں خدا کے لئے امداد کرو!" اب جب برطانوی تباہ کن جہاز پوری رفتار سے وہاں پہنچتے جہاں سے خبر آئی تھی تو چند پسماندہ کشتیوں کے علاوہ۔ جن میں خوفزدہ کانپتے ہوئے آدمی بھرے ہوتے۔ اور شاید تیل کی مقدار سطحِ بحر پر پھیلی ہوتی کچھ دکھائی نہ دیتا۔ افسرانِ کمانِ اعلیٰ بار بار دریافت کر رہے تھے کہ جنگی بیڑے کی آنکھوں یعنی ان تباہ کن فولادی پہرہ داروں کو کیا ہو گیا جن کا کام ہر وقت سمندر پر دشمن کی آبدوز کشتیوں اور جہازوں کی تلاش میں پھرتے رہنا ہے۔ اور کیوں یہ ایک آبدوز کشتی ان کے اپنے گھر میں سے لقمے اڑا کر لے جاتی ہے اور انہیں خبر نہیں ہوتی۔

یہ وجوہ تھیں جن کی بنا پر سکیپا فلو کے ہوائی بیڑے والے آج خاص طور پر پریشان نظر آتے تھے۔ ان کا کمانڈر اپنے دفتر میں ٹہل رہا تھا اور اپنے ماتحت افسروں سے کہہ رہا تھا۔

"بحری بیڑے والوں کو یقین نہیں آتا۔ اور وہ کسی حد تک سچے بھی ہیں۔ ہماری آبدوز سرنگیں اپنی جگہ قائم ہیں تمام سمندر میں بھاگی بھاگی نہیں پھرتیں کہ جہازوں کو ڈبو دیں۔ ناروے کے جہاز کے کپتان اور اس کے ملاحوں کے دیکھتے دیکھتے ہمارا جہاز ہیرن (Heron) دو ٹکڑے ہو کر سمندر میں غائب ہو گیا۔ اور وہ قسمیں کھاتے ہیں کہ آبدوز کشتی یا اس کی پیرسکوپ (Periscope) کا نشان تک سمندر پر نہ تھا۔"

ایک افسر بولا "ہیرن تھا بھی تو بالکل نیا۔ اس کا پہلا روغن بھی ابھی میلا نہ ہوا ہو گا۔ کیا اس پر جو لوگ سوار تھے وہ سب ڈوب گئے؟ ان میں سے کسی نے نہ بتایا کہ کیا واقعہ ہوا تھا؟"

کمانڈر نے جواب دیا۔ "یہی تو آفت ہے" جب ناروے کا جہاز اس جگہ پہنچا تو ایک بہتا ہوا تختہ تک نظر نہ آتا تھا۔ ہیرن اتنی جلدی ڈوب گیا کہ اس کی سواریوں کو جان بچانے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ بیڑے والے کہتے ہیں کہ آبدوز کشتی ہیرن کی دوسری جانب ہو گی اور تارپیڈ چلاتے ہی غوطہ لگا کر بھاگ گئی ہو گی۔ اب ہمیں پہلے سے بھی زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے ایک آبدوز کشتی کا اس قدر نقصان کر دینا ہمارے لئے شرم کی بات ہے۔"

کمانڈر ٹہلتے ٹہلتے ٹھہر گیا۔ اور اس نے اپنے ماتحت افسروں کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا "تم میں سے ایک رخصت پر

جا رہا تھا؟"

"جی ہاں" بیڑے کے سب سے کم عمر ہوا باز چیسٹرٹن نے جواب دیا "میں جا رہا ہوں۔ آج میری ڈیوٹی کا آخری دن ہے۔"

کمانڈر نے کہا "تو ہم اور بھی کم رہ جائیں گے لیکن کل تک شاید دو افسر ڈاک لے کر آجائیں۔ اس صورت میں اگر اس جرمن لٹیرے نے کہیں سر نکالا تو اسے کچل دینے میں کوئی کسر نہ رہ جانی چاہئے۔ ورنہ ——

میز پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ ایک افسر نے آلہ اٹھایا اور تھوڑی دیر سن کر کمانڈر سے کہا "امیر البحر کا دفتر ہے جناب۔ آپ کے لئے کوئی ضروری پیغام ہے۔"

سب افسر کمانڈر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے کہ کیا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس نے بات کرتے ہوئے جلدی سے کاغذ کا پیڈ اپنی طرف سرکایا اور پنسل اٹھا کر آلہ میں کہا "مہربانی کر کے ذرا دُہرا دیجئے —— ہاں —— میں سمجھ گیا۔ موسم کی رپورٹ بھیج دو۔ میں تیار ہوں"۔ اور آلہ رکھ کر کہنے لگا۔

"یُو ۔ ۳۷ کو ایک غیر جانبدار جہاز کے انگریز کپتان نے ابھی کوئی آدھ گھنٹہ ہوا دیکھا ہے۔ برطانوی ساحل سے تھوڑے ہی فاصلے پر اس کے غوطہ لگا جانے کے بعد اس نے لاسلکی سے اطلاع دی ہے۔ میں ابھی دو منٹ میں موسم کی رپورٹ لے کر آتا ہوں۔ تین سی پلین (Sea-plane) تیار کرو۔ بم کافی تعداد میں رکھ لو۔ اور چونکہ ہمارے پاس آدمی تھوڑے ہیں ایڈورڈ سپارنگ۔ اور چیسٹرٹن تنہا ایک ایک مشین لے جائیں۔ یہ لو یہ سمندر میں اس جگہ کا پتا ہے جہاں آبدوز کشتی دیکھی گئی ہے۔"

پندرہ منٹ بعد تین سی پلین سمندر میں اتار دیئے گئے اور کئی آدمی کمر تک پانی میں جا کر ان کے تیرنے والے حصوں کو پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ہوا باز کمانڈر سے آخری ہدایات حاصل کر رہے تھے۔ وہ کہ رہا تھا "اب تو سب سمجھ گئے نا؟ اگرچہ جرمن سمندر کی تہ میں نہ بیٹھ رہا ہو تو تم میں سے کسی ایک کو کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئے گا۔ اس حالت میں یاد رکھو کہ جانے نہ پائے۔ خواہ تمہیں اپنے جہاز کی ناک ہی سے اس کی فولادی پشت میں چھید کیوں نہ کر دینا پڑے۔ فی الحال سمندر پر ہوا کہیں نہیں ہے۔ اور موسم تمہیں نہایت اچھا ملے گا۔ بعد میں برف گرنے کے سے آثار ہیں گو یہ امر یقینی نہیں ہے۔"

سب ہوا باز اپنے اپنے جہاز کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک آدمی نے چیسٹرٹن کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر پانی میں سے جہاز تک پہنچا دیا۔ اس نے اپنی جگہ پر بیٹھ کر انجن کو چلایا۔ اور جونہی پروپیلر کے گھومنے سے پانی کی ہلکی سی پھوار اس کے چہرے پر محسوس ہوئی۔ آواز دی۔ "چھوڑ دو!" جہاز تھوڑی دور تک پانی پر تیز کشتی کی طرح دوڑا اور پھر آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھنا شروع ہوا۔ چیسٹرٹن نے اس کا رُخ کھلے سمندر کی طرف پھیر دیا اور تینوں جہاز اپنی اپنی مقررہ سمت میں بحری رہزن کی سراغ رسانی کے لئے پوری رفتار سے روانہ ہو گئے۔

اسے ہوا میں اڑتے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے کہ پٹرول کی سوئی نے بتایا کہ اب واپس جانے کی ضرورت ہے کیونکہ صرف تقریباً دو سو میل کے لئے پٹرول باقی رہ گیا تھا اور قیامگاہ سے فاصلہ اس سے کچھ ہی کم تھا۔ اس دو گھنٹے کے عرصے میں اس نے ہر طرف نگاہ دوڑائی تھی۔ کئی جگہ اور چیزوں پر شبہ ہونے سے رک کر چکر بھی کاٹتے تھے۔ اور اپنے مفوضہ علاقے سے باہر بھی اِدھر اُدھر دور تک گھوما تھا۔ لیکن یو بوٹ ۳۰ کا کہیں پتا نہ چلا تھا۔ لہذا مجبور ہو کر اس نے اپنے جہاز کا منہ واپس شمال کی طرف گھما دیا

لیکن رُخ درست ہو جانے پر آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ سامنے چند میل کے فاصلے پر سمندر ختم ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گہری دھند کی ایک سفید دیوار سی سمندر اور آسمان کے درمیان حائل ہو گئی تھی اور مشرق و مغرب کی جانب جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی اس کا اختتام کہیں نظر نہ آتا تھا۔ اس گہرے بادل کے درمیان سے گذرنا لازم تھا اس لئے وہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کے اندر داخل ہو گیا اور جہاز کا منہ اوپر کی طرف اٹھایا تاکہ شاید زیادہ بلندی پر ہوا صاف ملے۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ دھند اس قدر گہری تھی کہ اپنے جہاز کے کچھ حصے دکھائی نہ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ گز بھر کے فاصلے تک دیکھنا بھی ناممکن تھا۔ چونکہ عینک کے شیشے رطوبت جم جانے سے بے کار ہو گئے اس نے عینک اتار دی۔ اب ٹھنڈی ہوا لگ کر آنکھوں میں سے آنسو بہنے لگے۔ اس لئے مجبور ہو کر اس خوف سے کہ جہاز کسی چیز سے ٹکرا نہ جائے اس نے ارادہ کیا کہ خود اترے اور جب تک دھند کم نہ ہو جائے سمندر پر تیرتا رہے۔

لیکن ایسی حالت میں اترنا بھی آسان کام نہ تھا جب نیچے کی طرف کچھ نظر ہی نہ آتا ہو۔ خدا جانے وہ ابھی سمندر ہی پر تھا یا ساحل پر آ گیا تھا ـــ ان بموں کا بھی خیال تھا جو جہاز کے زیریں حصے میں لٹک رہے تھے اور تصادم سے جن کے چل جانے کا اندیشہ تھا۔ بہر حال اس نے توکل بہ خدا آہستہ آہستہ اترنا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں جب بلندی کا میٹر صفر پر آ گیا تو جہاز کا منہ سیدھا کر کے انتظار کرنے لگا۔

ـــــ ایک دفعہ ـــــ دو دفعہ زور کے جھٹکے لگے ـــ جہاز کے تیرانے والے فلوٹ (Float) لہروں کی چوٹیوں سے ٹکرا کر گیند کی طرح اچھلے ـــــ زور کی آواز آئی ـــــ جہاز کو گویا کسی نے پکڑ کر جھنجوڑا ـــــ اور چیٹرٹن کے ہوش بجا ہوئے تو جہاز غالباً سمندر کی سطح پر تیر رہا تھا ـــــ اور سمندر ہی تھا زمین نہ تھی ـــــ کیونکہ وہ خود اور جہاز صحیح و سالم تھے۔

اعصاب کے اتنے سخت امتحان کے بعد اپنی اصلی حالت پر آنے سے چیٹرٹن کو کچھ غنودگی سی محسوس ہونے لگی جو اکثر ہوا باز خصوصاً دھند میں محسوس کیا کرتے ہیں۔ اور وہ اونگھنے لگا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں ـــ معلوم نہیں کس قدر ـــــ یکلخت چونکا اور ہوشیار ہو گیا۔ ایک آواز کہیں قریب سے آئی تھی جس طرح کوئی دھات کی چیز دھات پر گرتی ہے ـــ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ کے آگے پیالہ سا بنا کر دو تین دفعہ اس طرح پکارا جیسے کسی جہاز کو متوجہ کیا جاتا ہے ـــ شاید کوئی جہاز ہو جس سے امداد مل سکے ـــ لیکن کوئی جواب نہ ملا ـــ نہ کچھ نظر آیا ـــ

اس نے دوبارہ آواز دینے کو ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ ہوا کے ایک جھونکے سے سامنے کے سفید پردے میں تھوڑی سی جگہ کھلی اور کوئی سیاہ سی چیز سمندر پر تیرتی نظر آئی۔ لیکن فوراً ہی دھند پھر آگئی اور معلوم نہ ہوسکا کہ کیا ہے۔ اس اثنا میں ہوائی جہاز آہستہ آہستہ تیرتا ہوا خود بخود اس چیز کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک فلوٹ کسی شے کے ساتھ ٹکرایا۔ چیٹرٹن کھڑا ہوگیا اور جیب میں سے پستول نکال لیا۔ اتنے میں یکایک پھر ہوا کا جھونکا آیا۔ سامنے سے دھند صاف ہوگئی ـــ ایک آبدوز کشتی کا فولادی پیٹ جس پر موٹے حروف میں یُو ۳۲ لکھا ہوا تھا چند ہی فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس پر دو تین آدمی کھڑے ہوئے چیٹرٹن کی طرف دیکھ رہے تھے ـــ اس نے پستول کا منہ فائر کرنے کے لئے اٹھا کر ایک سر کی طرف سیدھا کیا۔ لیکن جب وہ سر صاف نظر آیا تو ہاتھ لبلبی پر رک گیا ـــ بحری فوج کی چھجے دار ٹوپی کے نیچے ایک چوڑا چکلا خوش رنگ چہرہ تھا جس کے خوبصورت ہونٹ مسکراہٹ سے کھلے ہوئے تھے، دانتوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ دونوں کہنیاں لوہے کے جنگلے پر سہارا لئے ہوئے تھیں۔ اور ہاتھ خالی تھے ـــ اس طرح ہنستے اور ہنس کر خیر مقدم کرنے والے دشمن کے بے خوف چہرے میں گولی سے سوراخ کر دینے کی چیٹرٹن کا دل اجازت نہ دیتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنا ہاتھ نیچے کر لیا ـــ ان مسکراتے ہوئے ہونٹوں نے انگریزی میں کہا۔

" خوش آمدید میرے پیارے دشمن ـ ہم تو سمجھے تھے کہ آج ملاقات نہ ہوگی۔ اب اس تمنچانہ کو جیب میں رکھ لو۔ اور تشریف لے آؤ نا۔" آخری الفاظ کے لہجہ میں ہلکی سی حکم کی جھلک تھی۔

چیٹرٹن رکا لیکن صرف ایک لمحہ کے لئے۔ اس لمحہ میں اپنے بچاؤ کے کل ممکنات کا خیال کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ کوشش بے کار ہے۔ اور آہستہ آہستہ پستول کو جیب میں ڈال کر اس دعوت نما حکم کی تعمیل کے ذرائع کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"کود جاؤ اور اس جنگلے کو پکڑ لو!"

آبدوز کی چھت چیٹرٹن سے نیچے تھی۔ اس نے چھلانگ ماری اور جنگلے کے سہارے سے اس پر پہنچ گیا۔ ایک ملاح نے جس کے ہاتھ میں پستول تھا آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ لیکن افسر نے اپنی زبان میں کچھ حکم دیا تو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور پستول کو چھپا لیا۔

"اس طرف" افسر نے کہا اور آہنی سیڑھی کی طرف اشارہ کیا جو چھت سے اوپر اس اونچے حصے کی طرف جاتی تھی جسے پل کہتے ہیں اور جہاں وہ کھڑا تھا۔

"آپ نے بہت ممنون فرمایا۔ اب اسے اپنا ہی گھر تصور کیجئے" کہ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ لیکن چیٹرٹن نے اس ہاتھ کی طرف توجہ نہ کی۔ کیونکہ وہ تازہ تازہ کالج سے نکل کر فوج میں ملازم ہوا تھا۔ اور اس کے خیال میں اس ہاتھ کی پاکیزگی جس نے اس کے سینکڑوں ہموطنوں کو ڈبو دیا تھا کچھ مشکوک سی تھی۔

جرمن کمانڈر نے غالباً اس حرکت کو بد اخلاقی پر محمول کیا۔ اور اپنے افسر دوم کو جو پیچھے کھڑا تھا کچھ احکام دے کر چیٹرٹن سے

کہا "اب آپ ان کے ساتھ نیچے چلے جائیے۔ لیکن میرے آنے تک براہ کرم ذرا خاموش رہیئے"۔

چیسٹرٹن نے پوچھا "میری مشین کا کیا ہوگا؟"

"اس کی آپ کو ضرورت نہ ہوگی۔ ابھی اس کے فلوٹ چند گولیوں سے چھیدنے کے بعد وہ بحفاظت سمندر کی تہ میں پہنچا دی جائے گی"۔

چیسٹرٹن کی زبان پر تھا کہ ہوائی جہاز کے زیریں حصے میں بم باندھے ہوئے ہیں۔ لیکن خیال آیا کہ اگر ان بموں سے کچھ نقصان ہو جائے تو زیادہ برائی نہ ہوگی اس لئے خاموش رہا۔

وہ فولادی زینے کے ذریعے سے آبدوز کے پیٹ میں اتر گیا۔ وہاں تین اور جرمن کھڑے اس کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ افسر نے کشتی کے عقبی حصہ میں دروازہ کھولا۔ چیسٹرٹن کو اشارہ سے اس کے اندر جانے کا حکم دیا اور دروازہ بند کرکے چلا گیا۔

چیسٹرٹن نے کمرے میں داخل ہوکر اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہ ایک چھوٹا سا مربع کمرہ تھا جو بعد میں معلوم ہوا خود کمانڈر کے رہنے کی جگہ تھی۔ چھت میں دو بجلی کے قمقمے روشن تھے اور اس انسان کے عجیب طرز زندگی پر روشنی ڈال رہے تھے جس نے تمام بحیرۂ شمالی میں تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور جس کا خیال تک بھی سخت نفرت حقارت اور خوف کے جذبات سے خالی نہ تھا۔ دوران جنگ میں ایک آبدوز کشتی کے اندر اس قدر سامان آسائش کا جمع ہونا تعجب خیز تھا۔ فرش پر دو عمدہ قالین ایک چھوٹی سی آہنی میز کے دونوں طرف جو فرش کے ساتھ پیچوں سے لگی ہوئی تھی۔ بچھے تھے۔ میز پوش نفیس بانات کا تھا۔ ایک عمدہ چھوٹا بکس نما گراموفون مع اس کی پلیٹوں کے جو البم میں تھیں دیوار میں لگی ہوئی الماری میں رکھا تھا۔ اور اس کے قریب ایک فوٹو کا جیبی کیمرا اور تین چار کتابیں پڑی تھیں جن کے مضامین کا جنگی یا سیاسی امور سے کچھ تعلق نہ تھا۔ ان تمام اشیاء کی نسبت یہ شبہ بھی نہ ہوسکتا تھا کہ جرمن صیغۂ بحری عین دوران جنگ میں اپنی آبدوزوں کے کمانڈروں کو مہیا کرتا ہوگا۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ بات تھی کہ کمانڈر کے چھت سے لٹکے ہوئے کرمچ کے پلنگ (hammock) پر چند قرینے سے رکھے ہوئے مختلف اخبارات کے اوپر ایک ماہ دسمبر کا تازہ انگریزی ماہوار رسالہ پڑا تھا۔ حالانکہ چیسٹرٹن کے ہیڈکوارٹر سکیپا فلو میں اس رسالہ کا ماہ نومبر کا پرچہ ابھی تک بار بار پڑھا جا رہا تھا۔ اس وقت تین چار رائفل کے فائر ہونے کی سی لیکن نہایت مدہم آواز سنائی دی اور وہ ابھی رسالے کو حیرت سے الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ کمانڈر دروازہ کھول کر اندر آیا۔ چیسٹرٹن کھڑا ہوگیا۔

"کہو دوست ہواباز۔ ارے بھئی کوٹ وغیرہ اتار دو نا۔ اور آرام سے بیٹھو۔ تمہیں بھوک بھی تو لگ رہی ہوگی۔ میں نے سنا ہے کہ ہوابازوں کو بھوک بہت لگتی ہے ــــ"

اس کی آنکھیں چیٹرٹن کی آنکھوں میں گڑی جاتی تھیں لیکن لبوں پر مسکراہٹ بدستور تھی۔ چیٹرٹن نے بھی مسکرا کر جواب دیا "اُس وقت تو اگر ابلیس بھی مجھے کوئی گرم گرم سی چیز کھانے کے لئے مدعو کرے تو میں انکار نہ کروں گا کیونکہ سردی سے جسم اکڑا جا رہا ہے۔"

بے شک ضرور آپ کو سردی لگ رہی ہوگی۔ غالباً آپ ہی تھے جو گھنٹہ بھر ہوا ہمارے سر پر منڈلا رہے تھے۔ لیکن اب کیا راستہ بھول گئے تھے؟"

چیٹرٹن نے جواب دیا " ہاں " لیکن جس چیز کی تلاش میں تھا وہ مجھے مل گئی"

"یعنی؟"

"یو ۳۷" یہ کہنے میں چیٹرٹن غور سے کمانڈر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے اُس چہرے کا رنگ بدلا۔ لیکن صرف ایک لمحے کے لئے۔ پھر وہی مسکراہٹ عود کر آئی۔ اور کمانڈر نے ٹیلیفون اٹھا کر کچھ حکم دیا جو غالباً کھانے کے متعلق تھا کیونکہ ایک آدمی نے اندر آکر میز پر کھانے کے برتن چننے شروع کر دیئے۔

آبدوز میں ایک قسم کی گونج اور نامعلوم سی حرکت محسوس ہونے لگی۔ جس سے چیٹرٹن نے اندازہ کیا کہ چلنے لگی ہے۔

دروازہ کھلا اور آبدوز کا افسر دوم اندر آیا۔ کمانڈر نے چیٹرٹن سے سوال کیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟"

"چیٹرٹن۔ جیمز چیٹرٹن۔"

"عہدہ؟"

"فلائٹ لفٹننٹ"

"مقام؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔"

کمانڈر نے جھک کر چیٹرٹن کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا "یہ امر صیغۂ راز میں ہے کیا؟ لیکن آپ شمال کی جانب سے آئے تھے اور اسی طرف واپس جا رہے تھے۔ میں نے سنا ہے اس طرف چند چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں ——؟"

چیٹرٹن حیرت سے گھبرا سا گیا اس لئے دھوکے میں آگیا اور جھنجلا کر کہنے لگا " جب آپ کو معلوم ہے تو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے"

"ہا! ہا!! ہا!!!" کمانڈر نے قہقہہ لگایا۔ "تو گویا میرا خیال صحیح تھا؟"

چیٹرٹن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور دل میں اپنے آپ کو سخت ملامت کی۔ لیکن آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو کمانڈر کے ہونٹوں پر وہی خوشگوار سی مسکراہٹ تھی۔

اس کے بعد تقریباً چھتیس گھنٹے تک چیٹرٹن کو اس عجیب شخص کی صحبت میں رہنا پڑا جو حکومت برطانیہ کی تمام بحری طاقت کے مقابلے میں سینہ سپر کئے اُس کے جہازوں کے لئے موت کا پیغام لے کر زیر آب سرنگوں سے بھرے ہوئے طوفانی بحیرۂ شمالی میں گھومتا پھرتا تھا اور اس کے باوجود ہونٹوں پر دائمی مسکراہٹ لئے ہوئے اس فولادی کمرے میں قالین بچھا کر گراموفون سے تفریح کرتا تھا۔ جس کے قبر بن جانے کا ہر لحظہ احتمال تھا۔

کمانڈر نے تھوڑی دیر کے بعد کہا "ایک اور بات میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ لوگوں کو یہ کس طرح علم ہوا کہ میں اس وقت اس علاقہ میں پھر رہا ہوں؟"

اس دفعہ چیٹرٹن ہوشیار تھا۔ اس نے جواب دیا "میں نہیں بتا سکتا"

"لیکن آپ کو معلوم تو ہے؟"

چیٹرٹن خاموش رہا۔

"اس دفعہ اندازہ لگانے کی بھی ضرورت نہیں۔ آج مجھے صرف تین جہازوں نے دیکھا ہے۔ جن میں سے ایک تو بھاگ کھڑا ہوا اس لئے سمندر کی تہ میں پہنچا دیا گیا —— مجھے بزدلوں سے نفرت ہے —— باقی دو غیر جانبدار تھے اور چپ چاپ کان لپیٹے ہوئے چلے گئے۔ لیکن اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ان دونوں میں سے کس نے لاسلکی سے آپ کو اطلاع دی تو خواہ مجھے دنیا کے دوسرے سرے تک جانا پڑے۔ جانبدار ہو یا غیر جانبدار۔ ایک دفعہ اس سے تو بھگت لوں"

"ہاں۔ اور اس اثنا میں اگر خود کسی کے ہتے چڑھ جاؤ تو؟"

کمانڈر حسبِ معمول مسکرایا "تو پھر کیا ہے۔ موت کو آخر آنا ہی ہے۔ اگر احسان کا بدلہ اتارنے کے دوران میں آجائے تو اور بھی اچھا ہے"۔

اس وقت دروازہ کھلا اور ایک ملاح ایک باریک سا کاغذ لئے ہوئے داخل ہوا۔ افسر دوم نے اسے لے کر دیکھا اور کمانڈر کو دے دیا۔ وہ اسے ایک نظر دیکھ کر پھر چیٹرٹن سے مخاطب ہوا۔

"لیکن ایک بات ہے۔ جب تک مجھے یہ کاغذ ملے جاتے ہیں اس وقت تک کوئی برطانوی جنگی جہاز مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتا"

چیٹرٹن نے خیال کیا کہ لاسلکی رپورٹ ہوگی۔ ملاح چلا گیا۔ دونوں افسروں نے آپس میں کچھ گفتگو کی۔ اس کے بعد کمانڈر نے چیٹرٹن سے کہا۔ "کھانا کھانے سے پہلے آپ براہِ نوازش ذرا باہر تشریف لے جائیں۔ ڈریسلر Dressler آپکے ہمراہ جائیں گے۔ مگر ہاں —— امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔ لیکن میں مشکور رہوں گا اگر آپ پہلے اپنی جیبوں میں سے تمام اشیاء معائنہ کے لئے عنایت فرما دیں گے"

چیسٹرٹن نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈالا جو پستول پر پڑا۔ اور وہ حیران رہ گیا کہ مجھے ابھی تک مسلح رہنے دیا گیا ہے —— اس نے اسے نکال کر دیکھا۔ کمانڈر کے چہرے کی طرف نگاہ اٹھائی —— اس پر وہی مسکراہٹ تھی۔ بدگمانی یا خوف کا نشان تک نہ تھا —— اس نے پستول سامنے میز پر رکھ دیا۔ پھر کوٹ کے بٹن کھول کر ہاتھ اٹھا دیئے اور کہا "بہتر ہوگا کہ آپ خود میری تلاشی لے لیں کمانڈر صاحب۔ اس صورت میں آپ کو یقین ہو جائے گا کہ باقی کچھ رہ نہیں گیا ہے"۔

"نہیں نہیں لفٹنٹ" جواب ملا "آپ کا صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ اور کچھ نہیں ہے۔ میں یہ بھی نہ کرتا لیکن قانوناً مجبور ہوں۔ ممکن ہے کوئی ایسی چیز نکل آئے جس سے ہمارے معلومات میں اضافہ ہو سکے۔ ہماری سلامتی —— اور اب تو ہمارے ساتھ آپ کی بھی —— ان ہی معلومات پر منحصر ہے"۔

ایک ایک کر کے چیسٹرٹن نے ہر ایک جیب میں جو کچھ تھا نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اور جیبوں کے استر کو باہر الٹ دیا۔

"ایک سوال اور ہے۔ کیا آپ جرمن زبان سمجھتے ہیں؟"

چیسٹرٹن نے کہا "نہیں"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب براہ کرم چند منٹ کے لئے باہر تشریف لے جائیے"۔

چند ہی منٹ گذرے تھے کہ وہ واپس کمرے میں بلا لیا گیا۔ میز پر سادہ قسم کا لیکن عمدہ کھانا کافی مقدار میں چنا ہوا تھا۔ تینوں افسر بیٹھ گئے اور چیسٹرٹن نے کہا۔

"میں نے تو سنا تھا کہ جرمنی میں سامان خوراک دستیاب نہیں ہوتا کمانڈر۔ اور فوج والے روز بروز اپنی پیٹیاں کستے جا رہے ہیں!"

کمانڈر نے سنجیدگی سے جواب دیا "بے شک دوست۔ وہاں لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔ لیکن جرمنی کا یہ چھوٹا سا حصہ جس میں آپ بیٹھے ہیں انگلستان کی ناکہ بندی سے آزاد ہے"۔

"تو کیا ہمارے بحری بیڑے کی آپ کچھ حقیقت ہی نہیں سمجھتے؟"

"حقیقت؟" صرف اسی قدر کہ ہمارے تجارتی جہازوں کا راستہ بند ہے۔ ورنہ دنیا بھر کے دور دور کے سمندروں تک میں انگریزی جہازوں کے افسروں اور مسافروں کے دل ہر وقت اس طرح دھڑکتے رہتے ہیں جس طرح ان جہازوں کے انجن والے کمرے۔ آپ کا بیڑا بہت ہوشیار رہے لیکن اس نے آج تک میرا کیا بگاڑ لیا۔ اگر میں چاہوں تو آپ کے ملک کے کم از کم تین مختلف ساحلی شہروں میں اپنے کھانے پینے کے سامان کا انگریز دکانداروں سے حساب کھول سکتا ہوں۔ اور تو اور آپ کی تمام بحری طاقت میرے اخبارات تک کو تو بند نہیں کر سکی" اور اس نے انگریزی رسالہ کی طرف اشارہ کیا جو پلنگ پر رکھا تھا۔

"یہی سہی۔ لیکن ہمیں روکھا سوکھا کھانے کو مل تو جاتا ہے۔ آپ کا ملک کب تک فاقہ مستی کر سکے گا؟"

"یہ مجبوری صرف اس وقت تک ہے جب تک میرے جیسے چند اور ــ اور پھر چند ایک اور تیار نہیں ہو جاتے ــ وہ وقت آ جانے دو۔ ہم انگلستان کو بھی دکھا دیں گے کہ فاقہ مستی میں کیا مزا ہوتا ہے"

"یہ وہ خوشگوار خواب ہے کمانڈر جو حقیقت کبھی نہ ہو گا۔ آپ کی آبدوز بوٹ اس تعداد میں بن بھی گئیں تو کھلے سمندر میں نکلیں گی کیسے؟"

"جس طرح میں نکل آیا۔ مانا کہ ہمارا بیڑا باہر نہیں آ سکتا۔ لیکن کافی تعداد میں چیونٹیاں بھی ہوں تو شیر کا ناک میں دم کر سکتی ہیں مسٹر چیسٹرٹن" کمانڈر نے اپنی خالی پلیٹ ایک طرف کو سرکا کر کھونٹی سے لٹکے ہوئے اوورکوٹ کی جیب میں سے سگار کیس نکالتے ہوئے کہا "آپ انگریز ہیں اور نوجوان۔ میں جرمن ہوں اور آپ سے عمر میں کچھ زیادہ۔ ہم دونوں اپنے اپنے ملک کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ آپ اور آپ کے ہموطن مجھے ایک بے رحم قاتل جانتے ہیں۔ آپ کے بے گناہ سپاہیوں اور تجارتی ملاحوں کا بے دریغ خون بہانے والا خیال کرتے ہیں۔ ہم جرمن آپ کے بحری بیڑے کی نسبت بھی "حسن ظن" رکھتے ہیں۔ صرف ہمارے آپ کے طریق کار میں فرق ہے۔ آپ ہمارے بے شمار ہم وطنوں کو آہستہ آہستہ فاقے سے مار رہے ہیں۔ ہم تھوڑے تھوڑے کر کے جلدی جلدی تارپیڈو کے ذریعے سے مار ڈالتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ ناکہ بندی سے جرمنی کے فوجی اور غیر فوجی باشندوں بوڑھوں عورتوں بچوں کی خوراک بند کر دیں۔ ہم سے جو کچھ اس کے جواب میں ہو سکتا ہے ہم کرتے ہیں اور آپ کے جتنے جہاز ممکن ہو ڈبو دیتے ہیں تاکہ آپ کو سامان اور رسد بہم نہ پہنچ سکے۔ میرے لئے ہر ایک تجارتی جہاز سوہانِ روح کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں وہ سامان بار ہوتا ہے جس سے انگلستان کی زندگی میں اضافہ اور جرمنی کی زندگی میں کمی ہوتی ہے۔ مجھے جہاز کی سواریوں کا خیال نہیں آتا۔ میں اس سامان کو ڈبونے کے لئے فائر کرتا ہوں۔ سواریاں بچ جائیں تو مجھے افسوس نہیں ہوتا۔ نہ بچیں تو ان کی قسمت ــ جنگ جنگ ہے میرے دوست ــ اس میں تمام معیار خواہ اخلاقی ہوں یا معاشرتی محض جنگی ہو کر رہ جاتے ہیں" کمانڈر نے یہ کہہ کر سگار کیس چیسٹرٹن کی طرف بڑھا دیا۔ اور خود بھی سگار جلا کر پینے لگا۔

"اچھا ایک بات تو بتاؤ کمانڈر" چیسٹرٹن نے پوچھا "آپ نے میرے کہنے پر یقین کیوں کر لیا کہ میں جرمن زبان نہیں جانتا۔ اگر میں نے جھوٹ کہا ہو ــ؟"

کمانڈر نے سگار کا ایک لمبا کش لے کر جواب دیا "مہربانِ من میری عمر کے کئی سال انگلستان میں گذرے ہیں۔ اور میں آپ کے سینکڑوں ہموطنوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لئے جب میں کسی انگریز سے کوئی سوال کرتا ہوں تو اس کی آنکھیں مجھے خود بخود بتا دیتی ہیں کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں۔ آپ کی قوم کو مکاری نہیں آتی ــ اسی لئے آپ کا بیڑا ہمارا کچھ نہیں

بگاڑ سکتا۔"

افسر دوم جواب تک خاموش بیٹھا تھا اور غالباً انگریزی زبان سے ناواقف تھا۔ اب اٹھ کر ٹیلیفون کے پاس گیا جس کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اور پیغام سن کر کمانڈر سے کچھ کہنے کے بعد دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

کمانڈر کے چہرے پر ایک تبدیلی سی آگئی گو اسے نرمی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا تاہم کچھ اسی قسم کا اثر تھا جو چیٹرٹن کی آنکھوں نے محسوس کیا۔ اور جب کمانڈر نے گفتگو شروع کی تو آواز اور لہجے میں بھی پہلے کی نسبت کچھ فرق معلوم ہوتا تھا۔

"خدا جانے اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے یا کیا۔ لیکن ہے معاملہ عجیب ——"

چیٹرٹن نے پوچھا "کیا بات ہے کمانڈر؟"

"یہ تصویر"۔ اس نے ایک چمڑے کے تہ ہونے والے کیس کو جیب سے نکال کر کھولا اور کہا "کیا یہ آپ کی والدہ کی ہے؟"

چیٹرٹن سن ہو گیا —— اس کی والدہ —— اور اس کی رخصت —— گذشتہ چند گھنٹے کے واقعات میں اسے اپنے ذاتی حالات پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اس کی والدہ انگلستان میں مرنے کے قریب تھی اور ڈاکٹر نے جس کے وہ زیر علاج تھی محکمۂ بحری میں خاص طور پر کوشش کر کے چیٹرٹن کو چھٹی دلائی تھی جس سے وہ مستفید ہونے والا تھا —— اور اب ——!

اس نے صرف سر ہلا کر جواب اثبات میں دیا ——

کمانڈر نے کہا "ٹھہرو لفٹننٹ۔ میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں"

چیٹرٹن کا سر گھوم رہا تھا اور دماغ میں خیالات کا ہیجان برپا تھا۔ کمانڈر نے ایک بکس کھول کر اس میں سے ایک اور تصویر نکالی اور دوسری تصویر کے برابر میز پر رکھ دی۔ میز پر بجلی کے لمپوں کی پوری روشنی پڑ رہی تھی۔ دونوں تصاویر کے چہروں میں کافی مشابہت پائی جاتی تھی —— وہی سفید بال۔ وہی ایک خاص وقار۔ وہی شرافت اور مروت بھری آنکھیں۔ اسی قسم کا سادہ لباس۔ گویا جو شخص اصل کو نہ جانتا تصاویر کو الگ الگ دیکھ کر یہی سمجھتا کہ دونوں ایک ہی عورت کی ہیں صرف بیٹھنے کا طریقہ مختلف ہے۔

"کیا یہ —— آپ کی والدہ ہیں کمانڈر؟"

"ہاں لفٹننٹ —— تھیں۔"

"تو کیا تھوڑا ہی عرصہ ہوا ——؟"

کمانڈر کی انگریزی زبان اس دفعہ پہلے کی طرح صاف نہ تھی جس سے اس کے دل کی حالت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس نے کہا "ہاں —— وہی ایک موقع تھا —— جب برطانوی بیڑا میرے لئے واقعی طاقتور ثابت ہوا۔" فقرے کے آخری حصے میں آواز قدرے

بھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور کمانڈر نے منہ پھیر لیا تھا۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد جب اس نے پھر چیٹرٹن کی طرف دیکھا تو چہرے پر کوئی غیر معمولی اثر نہ تھا۔

"یہ واقعہ آپ کو مفصل سنانے کو دل چاہتا ہے لفٹننٹ۔ شاید اس لئے کہ تصاویر کی مشابہت کی وجہ سے آپ صحیح اندازہ کر سکیں گے۔" یہ کہتے ہوئے کمانڈر نے چیٹرٹن کی جیبوں سے جو اشیا نکلی تھیں۔ سوائے پستول کے۔ اپنی جیب سے نکال کر اُسے واپس دے دیں۔ اس نے بغیر دیکھے انہیں اپنے کوٹ میں رکھ لیا۔ کمانڈر نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اس واقعہ کو تین مہینے کا عرصہ ہوا ہے۔ اِس یُو بوٹ کو لے کر بحیرۂ شمالی میں نکلنے سے پہلے میں نے ایک معزز دوست سے جو محکمہ بحری کے اعلیٰ افسروں میں سے ہے وعدہ لے لیا تھا کہ اگر میری والدہ کی جو بیمار تھیں حالت ابتر ہو جائے تو مجھے ——— جس طرح بھی ممکن ہو سکے۔ اطلاع دیدے۔ ان کو مجھ سے بہت محبّت تھی اور میں جانتا تھا کہ ان کی یہ خواہش ہو گی کہ میں آخری وقت میں ان کے پاس ہوں ———

"آپ کے بحری سرنگ انداز ہر رات کو میرے راستے پر تمام سمندر میں سرنگیں بچھا کر اسے ناقابلِ عبور کر دیتے تھے۔ صبح کے وقت ہمارے زیپلن ہوائی جہازوں کے آنے پر وہ بھاگ جاتے تھے۔ اور اپنے سرنگ ہٹانے والے جہازوں کے عقب میں مجھے اپنے محفوظ علاقہ میں پہنچنے یا وہاں سے نکل آنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ایک روز سمندر میں سخت طوفان ہونے کی وجہ سے میں اپنے صدر مقام سے بہت دور نکل گیا اور دیر تک تہ میں پڑا انتظار کرتا رہا۔ جب واپس چلا اور پہلا لاسلکی پیغام ملا تو وہ یہ تھا کہ مجھے اپنی والدہ کے پاس جانا چاہئے ——— میں پوری رفتار سے روانہ ہوا تاکہ دوسرے روز شام ہونے سے پہلے منزلِ مقصود تک رسائی ہو جائے لیکن تقدیر میرے خلاف تھی۔ سہ پہر کے قریب جب یہ امید ہونے لگی کہ محنت بیکار نہ جائے گی میں نے پانی میں سے سر اٹھایا تو یکلخت کیا دیکھتا ہوں کہ برطانیہ کا شاید نصف بحری بیڑا منہ کھولے کھڑا ہے۔ چنانچہ غوطہ لگا کر بھاگ نکلا۔ دو چار نے تعاقب کیا اور گہرے پانی میں چلنے والے بم بھی پھینکے لیکن صرف اس وجہ سے کہ میں نے انہیں پہلے دیکھا تھا میں ان کی زد سے بچ کر نکل گیا۔ اور دور کا چکر لے کر پھر لوٹا۔ اب مجھے ایک غیر جانبدار جہاز نے دیکھ لیا جسے میں نے محض اس لئے ڈبو دیا کہ ایسا نہ ہو کہ میرے متعلق لاسلکی سے کسی کو خبر دیدے۔ لیکن شام ہونے تک میں نہ پہنچ سکا اور سرنگ اندازوں نے راستہ بند کر دیا۔ رات بھر میں سمندر کی تہ میں پڑا رہا اور پیغام ملنے سے تیسرے دن صبح کو جب صدر مقام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جس سانحہ کا خوف تھا وہ وقوع پذیر ہو چکا ہے ——— یہ گویا برطانی بیڑے کی ایک عظیم الشان فتح تھی ——"
کمانڈر یہ کہہ کر ہنس دیا لیکن خلافِ معمول اس ہنسی میں مسرت نہ تھی۔ اور گفتگو کو جاری رکھا "لیکن ایسی فتح جس کی قیمت بھی اُسے بہت گراں دینا پڑے گی ———"

چیٹرٹن خاموش تھا۔ وہ ایک ایسے دشمن کو کیا جواب دے سکتا تھا جس کی کہانی واقعی بے حد دردناک تھی لیکن جس کے آخری

الفاظ میں اس کے ملک کے خلاف زبردست دھمکی نے اس کے منہ پر مہرِ سکوت لگا دی تھی۔

آخر اس محیر العقول جرمن شخصیت نے چیبرٹن کے اعصاب میں ایک ایسی بے چینی سی پیدا کر دی کہ اس نے گھبرا کر سوال کیا

"آپ نے یہ واقعہ مجھے کیوں سنایا کمانڈر؟"

"صرف اس لئے کہ آپ کی اور میری حالت میں اس قدر مشابہت ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ یہ اندازہ کرنے میں کہ میرے دل پر کیا گذری یہ اچھی طرح محسوس کر سکیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

"یعنی؟"

"مسٹر چیبرٹن"۔ کمانڈر نے آگے کو جھک کر کہا۔ اس کے چہرے سے کسی قسم کے احساس کا اظہار نہ ہوتا تھا" اپنے فرضِ منصبی کے سلسلہ میں میں نے آپ کی جیبوں سے نکلے ہوئے تمام کاغذات دیکھے ہیں۔ اگر بدنصیبی ——— اور میں ——— آپ کے راستے میں حائل نہ ہو جاتے تو آپ آج رخصت پر ہوتے ———"

"دیکھئے کمانڈر صاحب"، چیبرٹن کے دل کا جوش اس کی طاقتِ ضبط پر غالب آگیا اور اس نے کمانڈر کی بات ختم نہ ہونے دی۔ "میں آپ کے اختیار میں ہوں اور آپ میرے ساتھ جو چاہیں کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میرے دل کو وہی اذیت پہنچا کر جو آپ کے دل کو پہنچی ہے آپ کو برطانیہ سے کماحقہٗ بدلہ لینے کی طمانیت حاصل ہوگی تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے آپ سے یہی امید تھی ——— آپ جرمن ہیں"۔

کمانڈر کا چہرہ ان الفاظ کو سن کر سرخ ہو گیا لیکن وہ جسمانی تصادم جس کا چیبرٹن اس قومی تحقیر کی سزا میں متوقع تھا۔ اور جس کا دُو بدو جواب دینے کے لئے وہ تیار تھا خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو ——— واقع نہ ہُوا ——— کمانڈر نے منہ پھیر لیا اور صرف یہ کہہ کر دروازے سے باہر چلا گیا کہ "اب بہتر ہوگا کہ آپ میرے بستر پر آرام کر لیں۔ اس کی آپ کو ضرورت ہوگی۔ چار بجے ڈیوٹی ختم ہونے پر میں خود آکر آپ کو جگا دوں گا"

لیکن چیبرٹن کو جگانے والا کمانڈر نہ تھا۔ بلکہ ایک زور کا دھماکا تھا جس سے وہ چونک کر اٹھا۔ بجلی کے قمقمے ٹمٹما رہے تھے۔ ہوا بھاری اور تیل کی بدبو سے بسی ہوئی تھی۔ چیبرٹن کے سر میں گرانی محسوس ہو رہی تھی۔ اور یہ دل چاہتا تھا کہ پھر سو جائے۔ اس نے اُٹھنے کے ارادہ سے ایک ٹانگ پلنگ سے نیچے اتارنا چاہی لیکن یکلخت ایک جھٹکے سے خود بخود فرش پر جا پڑا ——— اب بائیں ہاتھ کی فولادی دیوار چھت بن گئی اور فرش جس پر وہ پڑا تھا دیوار کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میز کی ٹانگوں کو زور سے پکڑ لیا تا کہ گر نہ جائے ——— فرش سیدھا ہو کر دوسری طرف کو اُٹھنے لگا۔ آبدوز کی حرکت اس طرح تھی جیسے مچھلی کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں جانب مڑتی ہوئی کبھی پانی کی سطح سے قریب اور کبھی دور نہایت تیز رفتار سے جا رہی ہو۔ چیبرٹن نے فرش پر ہی پڑا رہنا مناسب سمجھا ——— ایک اور دھماکا ہوا لیکن پہلے سے زیادہ فاصلے پر کشتی پھر الٹی سیدھی ہوئی لیکن پہلے سے کم ——— پھر ایک اور ہوا۔ اس سے بھی دور

اس دفعہ آبدوز کی حرکت پر کچھ نمایاں اثر نہ ہوا — چیسٹرٹن نے کلائی پر کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ کمانڈر نے چار بجے آنے کو کہا تھا —

اس نے اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ کمرہ چاروں طرف گھومنے لگا۔ مجبوراً سر پکڑ کر بیٹھ گیا — غنودگی کے بادل میں تمام احساسات غائب ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد آنکھیں کھلیں تو کمانڈر دروازے میں کھڑا تھا۔ لیکن یہ وہ خوش مزاج بے فکر مسکراتا ہوا کمانڈر نہ تھا بلکہ وہ نڈر اور بہادر جنگجو تھا جس کے خیال سے اس کے دشمن کانپتے تھے۔ چہرے پر پسینہ بہ رہا تھا اور آنکھوں سے خون ٹپکتا معلوم ہوتا تھا۔ چیسٹرٹن کے حواس فوراً درست ہو گئے اور وہ کھڑا ہو گیا۔ کمانڈر نے کہا۔

”کہیئے ہوا باز صاحب آپ نے ہمارا مباحثہ سنا؟“ بات کرنے کے دوران میں اس کے چہرے کی حالت بتدریج تبدیل ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ چند ثانیہ میں چہرہ اپنی اصلی خوشگوار حالت پر آ گیا۔

چیسٹرٹن نے پوچھا ”کیا آبدوز کسی جنگی نقل و حرکت میں مصروف تھی؟“

”صرف اس حد تک کہ ہم بھاگ رہے تھے اور برطانوی محافظ جنگی جہاز اپنی بارود پھونک رہے تھے۔“

”تو نتیجہ کیا ہوا؟ ہم کہاں ہیں؟“

”ابھی اسی دنیا کے سمندر کی گہرائیوں میں محفوظ ہیں — بات یہ ہوئی کہ ذرا دم لینے اور چاند دیکھنے کے لئے باہر نکلے تھے۔ دیکھا تو دو آہن پوش ہمارے دونوں طرف آنکھیں پھاڑے کھڑے ہیں۔ ہم غوطہ لگا کر دوڑے لیکن ان میں سے ایک یا شاید دونوں ہمیں دیکھ چکے تھے۔ اسس پہلے عمیق پانی کے بم نے تو ہمیں لے ہی لیا ہوتا لیکن قسمت یاور تھی۔ غالباً وہی آپ کی نیند میں بھی خلل انداز ہوا۔ باقی دو بم جب پھٹے ہم ان کی زد سے دور نکل چکے تھے“۔ یہ کہہ کر کمانڈر باہر چلا گیا اور چیسٹرٹن کو خراب ہوا کا پھر احساس ہونے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر میں کمانڈر نے واپس آ کر کہا۔

یہاں ہوا ذرا خراب سی ہو گئی ہے۔ لیکن اب ہم تعاقب کرنے والوں سے بہت فاصلہ پر ہیں۔ اور ابھی صبح کی تازہ ہوا کھانے کے لئے باہر نکلیں گے۔

یہ سن کر چیسٹرٹن کو کچھ اطمینان ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے باہر جانے کی اجازت بھی ملے گی یا نہیں۔ آخر کمانڈر سے سوال کیا

”آپ کا میری نسبت کیا ارادہ ہے کمانڈر۔ مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟“

اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا ”ہم ایک خاص مقام کی طرف جا رہے ہیں۔ مجھے آپ کو خشکی پر اتار کر اور لوگوں کے حوالے کرنا ہے۔ یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا کہ کہاں“۔ کمانڈر کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ وہ دیوار پر لٹکے ہوئے ایک نقشے میں غور سے کچھ دیکھنے لگا۔

چیسٹرٹن کے دل میں اپنی بیمار والدہ کا خیال آنے سے سخت بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اگر اس کی زندگی کی امید ہوتی تو ڈاکٹر کبھی رخصت کے لئے کوشش نہ کرتا۔ اب وہ بے چاری بسترِ مرگ پر پڑی ضعف و نقاہت بھری آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہوگی کہ کب میرا لختِ جگر آتا ہے —— اسی انتظار میں زندہ ہوگی کہ آخری دفعہ اس کے پیارے چہرے پر نگاہ پڑ جاتے —— ہر آہٹ پہ چونک اٹھتی ہوگی —— ہر آنے والے کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوگی کہ شاید اس کے آنے کی خبر لایا ہو —— لیکن آنے کی تو کیا اب یہ بھی کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے —— اُس سے تو یہی کہیں گے کہ نہیں آسکتا۔ ملازمت کے فرائض سے مجبور ہے —— وہ مایوس ہو جائے گی ——

دروازہ کھلا۔ تازہ ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ افسر دوم نے اندر آکر کمانڈر سے کچھ کہا۔ اس نے چیسٹرٹن کو بھی آنے کا اشارہ کیا اور خود باہر چلا گیا۔

چیسٹرٹن آہنی زینہ پر چڑھ کر باہر نکلا تو ہوا نہایت خوشگوار معلوم ہوئی۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور صاف کھلے سمندر پر چاندنی بہار دکھا رہی تھی۔ تین چار سایہ نما انسانی شکلیں دوربینیں لگائے چاروں طرف افق کی جانب غور سے دیکھ رہی تھیں۔ چند منٹ تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد کمانڈر نے کچھ حکم دیا اور دو آدمی فوراً نیچے چلے گئے۔ آبدوز کے انجن کی آواز بند ہوگئی اور رفتار اس قدر دھیمی ہوگئی کہ محسوس نہ ہوتی۔ کمانڈر نے چیسٹرٹن سے کہا۔

"ایک جہاز آرہا ہے اور تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے سے گذرے گا۔ آپ چاہیں تو یہیں رہ کر تماشا دیکھیں"۔

"تو کیا آپ غوطہ نہیں لگائیں گے؟"

"یہ حالات پر منحصر ہے۔ چاند بلندی پر اور ہماری پشت کی جانب ہے اس لئے ہم اسے پہلے دیکھیں گے۔ اگر غیر جانبدار ہوا تو چپ چاپ چلا جائے گا۔ اور اگر اس نے تین پانچ کی تو ہم اس کا رخ بدل دیں گے —— سمندر کی تہ کی طرف"۔ کمانڈر نے پانی کی طرف اشارہ کیا ——

"اگر برطانوی ہوا تو؟"

"آپ کی خاطر سے میں خاموش رہوں گا۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ اس کا توپخانہ ہمیں دیکھتے ہی گفتگو شروع کر دیگا۔ اس حالت میں جواب دینا لازم ہوگا —— یا بھاگ جانا —— کہیے آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

چیسٹرٹن خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں دُور افق کی دھندلی گہرائیوں میں ایک سبز روشنی نظر آئی۔ چند منٹ کے بعد اس کے برابر ایک سرخ روشنی دکھائی دی۔ اب جہاز کے انجنوں کی خفیف سی آواز بھی سنائی دینے لگی جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی جاتی تھی۔ آبدوز کا رخ بدل گیا تھا اور جہاز سیدھا اس کی طرف آتا معلوم ہوتا تھا۔ کمانڈر نے کہا۔

"ناروے کا تجارتی جہاز ہے" — اور دوربین چیسٹرٹن کے ہاتھ میں دے دی۔ اس میں سے جہاز کے پہلو پر اس کے ملک کا نشان پہچانا جا سکتا تھا۔ جہاز آبدوز سے چند سو گز کے فاصلے پر گذر رہا تھا اور اب اس کی بائیں جانب پوری دکھائی دیتی تھی۔ یکلخت اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بہت سے بجلی کے لمپ روشن ہو گئے جو جہاز کے کناروں سے ہٹا کر لمبی لمبی آہنی بلیوں پر آویزاں کئے گئے تھے۔ تاکہ ان کی روشنی ملکی نشان کو صاف ظاہر کر سکے۔ گویا جہاز والوں نے سمندر پر ملک الموت کے اس چھوٹے سے سیاہ فام پیامبر کو تیرتے دیکھ لیا تھا اس لئے نہایت پھرتی سے اپنا پاسپورٹ نکال کر پیش کر دیا کہ مبادا کوئی غلط فہمی ہو جائے۔

صبح ہونے کو تھی۔ دونوں نیچے اپنے کمرے میں چلے آئے۔ کچھ ناشتہ کرنے کے بعد کمانڈر چیسٹرٹن سے اس کے سامنے آرام کرنے کے لئے معذرت کر کے پلنگ پر سو گیا۔ چیسٹرٹن تہ ہونے والی نواڑی آرام کرسی پر لیٹ کر انگریزی رسالے اور اپنے خیالات میں محو ہو گیا —— دوپہر کے قریب آبدوز کی مستقل ہموار حرکت میں فرق آنے لگا۔ رفتار ہلکی ہو گئی۔ انجن کی آواز آہستہ ہوتے ہوتے بند ہو گئی اور ایسا معلوم ہوا گویا آبدوز کسی ٹھوس جگہ پر بیٹھ گئی ہے —— افسر دوم بہت سے کاغذ ہاتھ میں لے کر اندر آیا۔ کمانڈر نے اٹھ کر انہیں دیکھا اور واپس کر دیا۔ پھر چیسٹرٹن سے کہا۔

"آیئے آپ کو کچھ دکھاؤں!" اور اسے لے جا کر پیرسکوپ (Periscope) کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جس کے آئینوں میں سے سمندر کی سطح دکھائی دیتی تھی۔

چیسٹرٹن نے اسے چاروں طرف گھما کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کے ایک طرف سمندر ہے لیکن بڑی بڑی لہریں کچھ فاصلے پر ہیں۔ گویا جہاں آبدوز کشتی ہے اس جگہ پانی کچھ زیادہ نہیں۔ دوسری طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر اونچی فلک شگاف چٹانیں دیوار کی طرح کھڑی ہیں۔ چیسٹرٹن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کمانڈر ہم کہاں ہیں؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا "سمندر کی ملکہ کی خوابگاہ میں۔ ہیروں کی سی صاف اور چمکدار ریت کے فرش پر۔ جہاں سمندر کا شور اور ساحل کے رہنے والوں کی باہمی کشمکش کی پریشان کن آوازیں نہیں پہنچ سکتیں۔ یہ میرا ایک محفوظ آشیانہ ہے جس کا علم سوائے آبی پرندوں کے اور کسی کو نہیں۔ یہاں سے ساحل پر جانا یا ساحل پر سے کسی کا پانی میں آنا ناممکن ہے۔"

یہ کہہ کر وہ چیسٹرٹن کو واپس اپنے کمرے میں لے آیا جہاں کھانا چنا ہوا تھا اور افسر دوم موجود تھا۔ کھانے کے بعد جب برتن اٹھا لئے گئے اور افسر دوم چلا گیا تو کمانڈر نے کہا "آج مجھے تاریکی ہونے تک یہیں پڑے رہنا ہے۔ ہر روز میں ایسا نہیں کرتا لیکن آج کسی خطرے میں پڑنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ کی حفاظت مدنظر ہے —— اب آپ پھر تھوڑی دیر کے لئے سو جائیے ——"

چیسٹرٹن کو سوتے ہوئے کافی وقت گذر گیا تھا کہ کمانڈر کی آواز نے جگا دیا۔

اُٹھیے لفٹنٹ صاحب! آپ تو گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے آوازیں دیتے دیتے گھنٹوں ہی نہیں شاید مہینوں ہوگئے ۔"

اس نے اٹھ کر دیکھا کہ میز پر گرم چائے کا پیالہ اور کچھ بسکٹ رکھے ہیں اور پوچھا "کیا یہ میرے لئے ہیں؟"

کمانڈر نے اشارے سے اثبات میں جواب دیا لیکن اس کی طرف نہایت غور سے دیکھتا رہا۔ چیٹرٹن نے حیران ہو کر پوچھا

"کیوں کمانڈر خیر تو ہے؟"

کمانڈر نے کچھ سوچ کر کہا "کیا مطلب خیر کیوں نہیں؟"

"آپ کسی فکر میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔"

"نہیں دوست فکر کچھ نہیں۔ صرف وہ وقت آگیا ہے جب مجھے اپنے مہمان سے خدا حافظ کہنا پڑیگا۔ اور ۔ اور ۔۔ میں قدرے مغموم ہوں۔"

احساس کا اظہار اس کہنہ مشق جنگجو کے لئے مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے چیٹرٹن نے فوراً کہا "آپ خیال نہ فرمائیں کمانڈر صاحب۔ مجھے گرفتار کرنا آپ کا فرض تھا۔ بلکہ میں تو خود بخود آپ کے سر پر آدھمکا تھا۔ ممکن تھا آپ اسی وقت مجھے مار دیتے۔ اور یہی توقع تھی اسی لئے میں نے پستول نکال لیا تھا۔ لیکن آپ نے مجھے مار نہ ڈالا تو اب اسیر کرا دینے میں کیا مضائقہ ہے۔ بہرحال آپ کو ان دونوں میں سے ایک بات کو عمل میں لانا تھا۔ زندگی شیریں ہے اور جنگ ہمیشہ تو نہ رہے گی۔"

کچھ دیر تک کمانڈر حسب معمول مسکراہٹ سے چیٹرٹن کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا "آپ کی اس بات سے میری فکر دور ہوگئی ہے اور مجھے امید ہوتی ہے کہ آپ میری درخواست منظور کرلیں گے۔"

"درخواست! یا حکم؟"

"حکم نہیں درخواست۔ اور اس کی چند وجوہ ہیں۔ میں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہوسکے آپ کی تکالیف میں اضافہ نہ ہو اور انتظام کر دیا ہے کہ جہاں آپ جا رہے ہیں وہاں آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے جیسا دوسرے قیدیوں کے ساتھ عام طور پہ نہیں کیا جاتا۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ ۔۔"

"ہاں ہاں۔ فرمائیے!"

"۔۔ بچ کر بھاگ جانے کی کوشش نہ کیجئے گا۔"

"اگر کروں بھی تو بالکل بے کار ہوگی۔"

"بے شک۔ اسی لئے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ کوشش ہی نہ کریں ۔ کیونکہ میں آپ کو تنہا ساحل تک بھیجنا چاہتا ہوں

جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"تنہا؟"

"ہاں۔ کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے یہاں سے بہت دور پہنچنا ہے اور ہر منٹ قیمتی ہے۔ بہت غور و خوض کے باوجود مجھے اس کے سوا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ آپ کو ایک کشتی دے کر اس بھروسے پر روانہ کر دیا جائے کہ آپ خواہ مخواہ آفت اور خطرے میں مبتلا ہو جانے سے محترز رہیں گے —— براہِ کرم پندرہ منٹ کے اندر تیار ہو جائیے"۔ یہ کہہ کر کمانڈر باہر چلا گیا۔

چیسٹرٹن چائے ختم کرنے اور کپڑے پہننے کی اثنا میں یہ سوچ رہا تھا کہ غالباً میرے سوتے ہی سوتے کسی طرح آبدوز بحری سرنگوں کے حلقے سے گذر کر جرمن سمندر میں پہنچ گئی ہے۔ لیکن کمانڈر کی ذہنیت کی ترکیب اور خصوصاً بغیر محافظ کے تنہا ساحل پر بھیجا جانے پر حیرت ہو رہی تھی جو سخت تحیّر کی صورت اختیار کر گئی جب اس نے ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور دیکھا کہ اس کا پستول بدستور بھرا ہوا اس میں رکھا ہے۔ حالانکہ گذشتہ رات جب وہ آبدوز سے باہر نکلا تھا تو پستول موجود نہ تھا۔ اتنے میں ایک چھوٹا افسر اندر آیا اور کہنے لگا "کمانڈر صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔"

چیسٹرٹن جب آبدوز کی چھت پر پہنچا تو دیکھا کہ کافی تاریکی ہے۔ چاند ابھی نہ نکلا تھا۔ وہ اس طرف چلا جدھر ایک بڑی سی سایہ نما صورت دکھائی دیتی تھی۔ قریب پہنچنے پر کمانڈر نے دھیمی آواز سے کہا" اب خدا حافظ۔ مسٹر چیسٹرٹن۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو خاص اس جگہ جہاں چاہتا تھا نہیں اتار سکا۔ لیکن میرا جلدی جانا ضروری ہے۔ اس لئے" اس نے آبدوز کے برابر ہی سمندر کی طرف اشارہ کیا" یہ کشتی موجود ہے۔ گو بہت مضبوط تو نہیں کیونکہ کرمچ کی بنی ہوئی ہے تاہم امید ہے آپ کو صحیح و سلامت کنارے تک پہنچا دے گی جو وہ سامنے دھندلا سا نظر آ رہا ہے ——"

"لیکن" —— چیسٹرٹن نے پوچھا" کیا واقعی مجھے اکیلا بھیج رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"لیکن میں جرمن زبان کا ایک لفظ نہیں جانتا کمانڈر۔ ساحل پر مسلح سپاہی ہوں گے۔ وہ ممکن ہے مجھے گولی مار دیں یا جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیں ——؟"

"میں نے سب انتظام کر دیا ہے آپ گھبرائیں نہیں۔ بے تار برقی سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک خط ہے یہ ان لوگوں کو دکھا دینے سے جن کے پاس آپ جا رہے ہیں تمام امور صاف ہو جائیں گے۔ پہرے کے گارڈ سے کسی نہ کسی طرح نبٹ لیجئے۔ نشے میں سرشار ہونے کا بہانہ کرنے سے وہ بھی غالباً گرفتار ہی کر لینے پر اکتفا کرے گا —— لو خدا حافظ!"

اس دفعہ چیبرٹن نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے بے اعتنائی ظاہر نہ کی اور مصافحہ کر کے کشتی میں اتر گیا۔ کشتی کو کسی چیز سے دھکیل دیا گیا اور وہ آہستہ آہستہ چپو چلاتا ہوا تاریک سمندر پر چل نکلا۔

تھوڑی دیر میں اس کے حواس مجتمع ہونے شروع ہوئے اور اس نے آسمان کی طرف ستاروں کا رُخ دیکھنے کے لئے نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ ساحل جدھر وہ جا رہا ہے شمال مغرب کی طرف ہے۔ شمال مغرب کی طرف کونسا جرمن ساحل ہو سکتا تھا —؟ کیا کوئی جزیرہ تھا —؟ آبدوز جرمن پانی میں بہت دور تک اندر چلی گئی تھی —! بچاؤ کی صورت! لیکن بھاگ کر کہاں جا سکتا تھا —؟ کمانڈر کے الفاظ — دشمن کا بھروسا — لیکن بھروسا —

انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تقریباً آدھ گھنٹے میں وہ کنارے کے قریب پہنچا جہاں پتھریلی چٹانیں تو تھیں لیکن زیادہ خطرناک نہ تھیں۔ وہ کشتی چھوڑ کر کمر تک پانی میں اتر گیا اور کچھ تیرتا کچھ چلتا۔ لہروں کے تھپیڑے کھاتا آخرکار خشکی پر پہنچ گیا۔

کچھ عرصہ دم لے کر۔ کیونکہ تھک گیا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے چٹان پر چڑھنے کی کوشش شروع کر دی جو کنارے سے بہت بلند اور ناہموار تھی — خدا جانے اس کا استقبال کس شان سے ہوگا —! کیا وہ تمام جرمن افسر بھی جن سے اُسے سابقہ پڑنے والا تھا ایسے ہی ہوں گے جیسا یو بوٹ کا کمانڈر تھا۔ وہ سفارشی خط؟ — کیا اس کا اثر ہوگا؟

وہ گرتا پڑتا آہستہ آہستہ چڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی ملی اور راستہ پہلے کی نسبت آسان ہو گیا لیکن اندھیرا اس قدر تھا کہ دو چار فٹ سے زیادہ فاصلہ نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے ہر چند قدم پر ٹٹول ٹٹول کر بڑھنا پڑتا تھا۔ خیالات کے ہجوم میں وقت کا احساس تک نہ رہا تھا۔ معلوم نہیں کب تک اس طرح چلتا رہا۔

یکلخت ٹھوکر لگی۔ گرا۔ اور خاردار تار کی بہت سی سوئیاں اس کے جسم کے مختلف حصوں میں چبھ گئیں۔ ساتھ ہی تحکم کے لہجے میں آواز آئی۔

"ہالٹ! ہُو کمز دیر؟" (Halt! Who Comes There?)

اب اگر اِس آہنی تار میں بجلی کی رو دوڑ جاتی تو شاید اسے اتنا صدمہ محسوس نہ ہوتا جتنا اس سوال سے ہوا۔ کیونکہ فقرہ صاف انگریزی زبان میں کہا گیا تھا اور لہجہ بالکل انگریزی تھا — حیرت سے اس کی زبان بند ہو گئی — آواز پھر آئی۔

"مَیں نے پوچھا تھا کون ہے؟ اگر فوراً جواب نہ دیا تو —"

"میں — میں ایک انگریز افسر ہوں۔" خطرے کے احساس نے اس کے منہ سے کہلوایا۔ "تم کون ہو؟"

"تمہیں اس سے کیا واسطہ۔ جہاں ہو وہیں کھڑے رہو! — گارڈ۔ ٹرن آوٹ!"

کہیں قریب سے رائفلوں کے اٹھانے کے ساتھ بھاری بوٹوں اور مختصر احکام کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی نے پوچھا۔

"کیا ہے والٹر؟"

"معلوم نہیں سارجنٹ۔ تار پر کوئی شخص ہے جو اپنے آپ کو انگریز افسر بتاتا ہے۔"

"کون ہے تار کے پاس؟" سارجنٹ کی آواز آئی

"میں ایک برطانوی افسر ہوں۔ خدا کے لئے بتاؤ تم کون لوگ ہو؟" چیٹرٹن نے تار کی الجھن میں سے نکل کر کھڑا ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو کاؤنٹر سائن (Countersign) کیا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو ابھی سمندر میں سے نکل کر آ رہا ہوں۔"

"اکیلے ہو؟"

"ہاں"

سارجنٹ نے کچھ سوچا۔ پھر کہا "بہت اچھا میرا فرض تمہیں گرفتار کر لینا ہے۔ وہاں خود جواب دے لینا۔"

اس نے ایک لکڑی کا تختہ تاروں کے اوپر سے بڑھا دیا۔ جس پر سے ہو کر چیٹرٹن دوسری طرف پہنچ گیا۔ یہاں فوراً دو سپاہیوں نے اس کے بازوؤں کو مضبوط پکڑ لیا۔ اور سارجنٹ کے پیچھے پیچھے ایک خیمے کی طرف لے چلے جو کچھ فاصلے پر لگا ہوا تھا۔

وہاں دو تین انگریز افسر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان پر یہ ثابت کر دینا چیٹرٹن کے لئے کچھ بہت زیادہ مشکل نہ تھا کہ وہ برطانوی ہوا باز ہے۔ لیکن موقع ملتے ہی ان سے پہلا سوال اس نے یہ کیا کہ میں کہاں ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ڈرہم میں انگلستان کے مشرقی ساحل پر۔ یہ سن کر احساسات کے ہجوم اور تکان کے غلبہ سے چیٹرٹن پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اور گرا چاہتا تھا کہ سارجنٹ نے اپنے ہاتھوں پر سنبھال لیا۔

افسروں نے شراب وغیرہ پلائی اور بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر بستر میں لٹا دیا۔ گھنٹے بھر کے بعد جب ہوش درست ہوئے تو چونکہ سب اس کی کہانی سننے کے بہت مشتاق تھے اس نے شروع سے لے کر آخر تک گذشتہ دو روز کے واقعات بیان کئے۔ جب ختم کر چکا تو ایک افسر نے پوچھا کہ وہ سفارشی خط کہاں ہے۔ چیٹرٹن نے کوٹ کی جیب میں سے لفافہ نکال کر دیا۔ دیکھا تو اس میں اعلیٰ افسر محکمۂ ہوا بازی کا وہ حکم ملفوف تھا جس میں چیٹرٹن کو اپنی بیمار والدہ کے پاس جانے کے لئے ایک ہفتہ کی رخصت بصورتِ خاص دی گئی تھی۔ افسر کے دستخط کے مقابل دوسرے کونے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

تصدیق نمودہ

آٹو فان سٹیکمین۔ کمانڈر یو ۷۳۔ امپیریل جرمن نیوی۔ مورخہ ۲۴ جنوری

پمپ — پمپ — پمپ۔ چیسٹرٹن کی رگوں میں سے آہستہ آہستہ خون نکل کر اس کے برابر لیٹے ہوئے جسم میں داخل ہو رہا تھا لیکن وہ اس چہرے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا جس کے سر پر ایک وقت بحری جرمن افسر کی سیاہ چھجے دار ٹوپی تھی۔ کمرے کی تیز روشنی اس چہرے کی زردی کو ہلکی سرخی میں تبدیل ہوتے صاف دکھا رہی تھی اور موت کے بجائے زندگی کا رنگ آتا ہوا معلوم ہو رہا تھا

کمزوری کی وجہ سے جب وہ آنکھیں کھلی نہ رکھ سکا تو ان کے سامنے ایک دوسرے چہرے کا تصور ہوا میں تیرتا ہوا نظر آنے لگا۔ ایک عورت کا چہرہ جس کے سر پر سفید بال تھے۔ جس کی محبت بھری آنکھوں نے چیسٹرٹن کو بچپن سے بتدریج جوان ہوتے دیکھا تھا۔ اور آخر اس کے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھیں — اس وقت سے تین روز بعد جب ایک جرمن نے دوران جنگ میں ایک انگریز کی رخصت کے حکم پر تصدیق کر کے اپنے دستخط ثبت کئے تھے۔

ڈاکٹر کریگ کی آواز آئی "بس کافی ہے۔ اب انشاء اللہ اس مریض کی جان کو کوئی خطرہ نہیں"۔ چیسٹرٹن نے آہستہ سے کہا "خدا کا شکر ہے"۔

عطاالرحمٰن

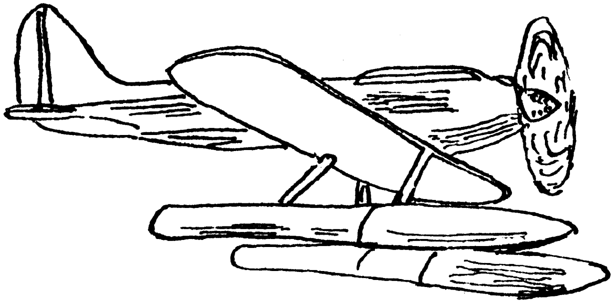

# مایا

ایک کمسن شہزادہ مرصّع اور قیمتی زیوروں میں لدا پھندا، نوکر چاکر کے حلقے میں محصور غریب بچوں کو آزادی سے فرشِ خاک پر لوٹتے، اور بے فکری سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہتا ہے:-

(۱)

اے مادرِ گیتی! اپنی شاہی لے لے — اے کج روش! اپنی کج کلاہی لے لے
لے لے مری موتیوں کی مالا لے لے — میں چاند نہیں ہوں، اپنا ہالہ لے لے
ناچا کروں تال سم پہ آخر کب تک — الجھاؤ یہ ہر قدم پہ آخر کب تک
زیور سے مری گلو خلاصی کر دے — پیمانۂ جسم سادگی سے بھر دے
لے کر قالین، مرگ چھالا دے دے — کمبل مجھے ایک کالا کالا کر دے
دل کیوں نہ جلے گا قاقم و دیبا سے — ملنے دیتے نہیں غریبوں سے مجھے
پیراہنِ کبر چاک ہو جانے دے — مجھ خاک منش کو خاک ہو جانے دے

جوہر مرا، خاک میں چمک جائے گا،
پودا یہ زمین میں بھبک جائے گا۔

## راوی

افلاس نے زحمتِ موت آسان کر دی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
آرام سے سونا بھی بڑی دولت ہے

ایک غریب لڑکی، اپنے جہیز کی فکر میں اپنے غریب باپ کو پریشان دیکھ کر کہتی ہے :-

### (۲)

پیارے ابّا تم مجھے زیور نہ دو    غم سے فارغ سر کو، دردِ سر نہ دو
کیا سنوں گی اُن کی اس جھنکار میں    فرق آجائے گا اس سے پیار میں
پیارے ابّا! میری سنتے ہو اگر    بے تکلف بھیج دو شوہر کے گھر
پیارے ابّا تم مجھے زیور نہ دو
میں، یہیں سے گر سنورتی جاؤں گی    اُن کو پھر خاطر میں کیا میں لاؤں گی
زیوروں میں خود سری مستور ہے    مجھ کو تو اُن کی خوشی منظور ہے
ہاتھ خالی جا کے واں کچھ پاؤں گی    جامۂ اصلی میں ہی میں جاؤں گی
سادگی سے حُسن کی تعریف ہے    زیور و زر موجبِ تکلیف ہے
پیارے ابّا تم مجھے زیور نہ دو

سیّد احمد حسین امجد

# میرے بچے

آہ! وہ کون تھا جس نے تمہارا کُرتہ رنگ دیا میرے بچے اور تمہارے خوبصورت اعضا کو اس لال لبوس سے ڈھانپ دیا۔

صبح سویرے تم صحن میں کھیلنے کے لئے نکل آئے ہو اور خوب گرتے پڑتے دوڑ رہے ہو۔ لیکن وہ کون تھا جس نے تمہارا یہ ننھا کُرتہ رنگ دیا میرے بچے؟

وہ کیا شے ہے جو تمہیں یوں ہنسا رہی ہے اے میری زندگی کی کلی۔

ماں دہلیز پر کھڑی ہوئی تم پر مسکراتی ہے۔ وہ تالیاں بجاتی ہے تو اُس کی چوڑیاں چھن چھن کرتی ہیں اور تم اپنی بانس کی چھڑی لے کر ایک ننھے مُنّے گڈریے کی طرح ناچتے ہو۔ لیکن وہ کیا شے جو تمہیں ہنساتی ہے اے میری زندگی کی کلی۔

اے بھکاری تم کیا مانگتے ہو؟ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی ماں کے گلے سے چمٹے ہوئے ——
او ننھے گدا گر تم کیا مانگتے ہو؟

ہوا تمہاری پازیب کے گھنگروؤں کی جھنکار کو خوشی میں اڑائے لئے جاتی ہے۔

سورج مسکراتا ہے اور تمہارا سنگار دیکھتا ہے۔

آسمان تمہاری نگہبانی کرتا ہے جب تم اپنی ماں کے پہلو میں سو رہے ہوتے ہو اور صبح دبے پاؤں تمہارے پلنگ کے پاس آ کر تمہیں چومتی ہے۔

ہوا تمہاری پازیب کے گھنگروؤں کی جھنکار کو خوشی میں اڑائے لئے جاتی ہے۔

خواب کی پری شفق کی رنگین روشنی میں سے اڑتی ہوئی تمہاری طرف آ رہی ہے۔

دھرتی ماتا تمہارے قریب اپنی نشست بنا لیتی ہے۔ تمہاری ماں کے دل کے اندر! اور وہ جو اپنا نغمہ تاروں کو سناتا ہے تمہارے دریچے کے پاس کھڑا ہے اپنی بانسری لئے ہوئے۔

اور خواب کی پری شفق کی رنگین شعاعوں میں سے اڑتی ہوئی تمہاری طرف آ رہی ہے!

(ترجمہ) بشیرا احمد بیگم

# ہیچ میرزی

افسوس اک شجر بھی نہیں سایہ دار میں　　سایہ فگن نہیں ہوں سرِ رہگذار میں
اِس اپنی نیستی سے بہت شرمسار ہوں　　ہستی کی آرزو میں ہوں زار و نزار میں
یہ زندگی گلے کا مرے ہار ہو گئی،　　بے وجہ یونہی اس کے گلے کا ہوں ہار میں
آنسو بھی اک نہیں کہ مژہ سے ٹپک پڑوں　　دریائے درد و غم کا ہوں آئینہ دار میں
وہ ناؤ بھی نہیں ہوں کہ دریا کو چیر کر　　لے جاؤں رہ نورد کو دریا کے پار میں
طائر بھی میں نہیں کہ ہوا میں اُڑا کروں　　بن جاؤں اس طرح سے خلا کی بہار میں
تارا نہیں کہ بن کے مسافر کا رہنما　　اپنی ضیا کو راہ میں کر دوں نثار میں
روشن جہاں میں جس سے کسی کا مزار ہو　　وا حسرتا نہیں ہوں وہ شمعِ مزار میں
میں شاخِ خشک تک نہیں جلنے کے کام کی　　کیوں اپنی بے کسی پہ نہ ہُوں سوگوار میں
وہ خار ہوں جو اپنے ہی دل میں چُبھا کرے　　جو گُل کا ہم نشیں ہو نہیں ہوں وہ خار میں

جینا مرا جہاں میں کسی کام کا نہیں،
یہ خار گلستاں میں کسی کام کا نہیں،

ح۔ب

# ہٹلر

امن اچھا ہے لیکن صرف اس حالت میں جب ایک شخص باعزت زندگی بسر کرسکتا ہو۔ جب اسے سب حقوق حاصل ہوں، ایسی حالت میں امن پسندی اور انسانی ہمدردی کا وعظ جائز ہے ورنہ جنگ کے بغیر امن بے معنی ہے +

ہمارا مدعائے زندگی یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ایک نظامِ حکومت کو برقرار رکھیں بلکہ یہ کہ ہماری قومیت مٹنے نہ پائے کیونکہ انسانی حقوق حکومت کے حقوق سے افضل ہیں، اگر انسانی حقوق کی جنگ میں ایک قوم کو نیچا دیکھنا پڑے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں رہنے کے قابل نہیں،

دنیا میں بزدل اور کمزور قوموں کے لئے کوئی جگہ نہیں!

ہٹلر

* * *

جنگ مذموم ہے، قومیت کا تعصب تباہ کن ہے، دُنیا کو امن اور بین الاقوامی نظام کی ضرورت ہے +

آین سٹاین

* * *

جنگ جرمن قوم کی فطرت کا لازمی عنصر ہے، جرمن ادب، شاعری، مصوری اور فنِ تعمیر اس قومی وصف کے آئینہ دار ہیں۔ جرمن فلسفہ جنگ کو قومی زندگی کا واحد ثبوت قرار دیتا ہے، نٹشے (Nietzsche) اور ٹریچشے (Trietschhe) اسے مرد کے لئے مدعا، حیات سمجھتے ہیں، جرمنی میں اس شخص کو مرد نہیں سمجھتے جو مردِ میدان نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ تمام ارکینِ حکومت فوجی ملازم رہ چکے ہیں، صدرِ جمہوریہ پال فان ہنڈن برگ جنگِ عظیم میں جرمن فوجوں کا افسرِ اعلےٰ تھا، وزارتِ خارجہ کا قلمدان کپتان گرنگ (GORING) کے ہاتھ میں ہے جو ہوائی بیڑے کی کمان کرتا تھا، اور چانسلر کے عہدہ پر ایسا شخص فائز ہے، جسے دنیا جنگ کا زندہ مجسّمہ سمجھتی ہے، ہر اڈالف ہٹلر جس کے ایک اشارے پر امنِ عالم برہم ہوسکتا ہے، ان دنوں جرمنی کی قسمت کا مالک ہے +

ہٹلر کا نام یہود دشمنی کا مترادف ہے اور یہ تعجب کا مقام نہیں بلکہ یہی جرمن فطرت کا تقاضا ہے جرمن پیدائشی سپاہی ہے اور یہودی پیدائشی سود خوار، سپاہی کی خوشی صرف جنگ میں ہے اور سود خوار صرف امن کے دنوں میں دولت جمع کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جرمن جنگ جُو ہیں اور یہودی امن پسند +

جرمن اور یہودی میں ایک اور فرق ان کا سیاسی نقطۂ نظر ہے، جرمن اپنے وطن میں صدیوں سے آباد ہیں اور اپنے آبائی وطن کی حفاظت کیلئے کٹ مرنے کو تیار ہیں، اس لئے ان میں قومیت کا جذبہ زوروں پر ہے۔ یہودی دو ہزار سال سے غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس لئے ان کی محبت کسی خاص ملک سے نہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ "ہر ملک مُلکِ ماست کہ مُلک خدائے ماست"، اِن کا احاطۂ نظر جرمنوں سے زیادہ وسیع ہے، وہ بین الاقوامی نظام کو قومیت پرستی پر ترجیح دیتے ہیں اور اسی میں اِن کی بہتری ہے، کیونکہ تجارت، صنعت اور حرفت کو خارجی اور اندرونی امن وامان ہی سے فروغ ہوتا ہے، بین الاقوامی نظام سے تمام دُنیا کی تجارت یہودیوں کے ہاتھ میں آجائے گی ؞

یہودی جرمن کو وحشی اور تنگ دِل قوم پرست سمجھتا ہے اور جرمن یہودی کو پُرامن لٹیرا اور ذلیل سازشی کہتا ہے۔ جرمنی میں نسلی منافرت کی تحریک نئی نہیں، صدیوں سے اِن دو قوموں میں کشمکش چلی آئی ہے، جیسا چیمبرلین[1] کا خیال ہے یہودیوں کو جرمنی کا ازلی دشمن سمجھا جاتا تھا، فریڈرک وِم نے یہودی معلموں کو سیاسیات کا درس دینے سے منع کر دیا تھا اور انہیں حقوقِ شہریت سے محروم رکھا تھا۔ بسمارک کہا کرتا تھا کہ یہودیوں سے جرمن قوم کو فائدہ پہنچنے کی اُمید فضول ہے، یہودی غیر ہیں اور ہمیشہ غیر رہیں گے، وہ سلطنت کے اندر سلطنت قائم کرنا چاہتے ہیں ؞

ہٹلر ہمیشہ یہودیوں کو سنگِ راہ خیال کرتا رہا ہے، اسے ابتدا ہی میں یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہودی اس کے رستہ میں کانٹے بچھا رہے ہیں اور اس کے سامنے ایسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی کرنا چاہتے ہیں جو اس کے مدعائے زندگی کو باطل کر دے اور اس کے عزمِ راسخ کو شکست دے ؞

ہٹلر کا مدعائے زندگی کیا ہے؟ اس کی تعیین اس حیرت انگیز امر سے ہو سکتی ہے کہ اس کی پیدائش آسٹریا میں ہوئی اور اس کا ستارۂ اقبال جرمنی میں چمکا، اس کی رگوں میں جرمن خون دوڑ رہا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ قدرت نے اسے جرمنی اور آسٹریا کو متحد کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، وہ ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہے کہ ایک دن جرمن آسٹریا جرمنی کا ایک حصہ بن جائیگا لیکن اس اتحاد کا باعث اقتصادی مفاد نہیں ہوگا، خواہ جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد مالی لحاظ سے فضول ہی نہیں نقصان دِہ ہی کیوں نہ ہو لیکن ایک دن ہم ضرور اپنے بچھڑے بھائی بندوں کو اپنے ساتھ ملا لیں گے، سلطنت کے لئے کسی خاص اقتصادی نظام کی ضرورت نہیں، قوم سوداگروں کی جماعت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک قبیلہ ہے جس کا مقصد یکجہتی اور اتفاق سے منشائے قدرت پورا کرنا ہے ؞

پہلے پہل یہ خواہش اس وقت ہٹلر کے دِل میں پیدا ہوئی جب وہ وی آنا میں معمار کا کام کر رہا تھا، آسٹریا کے دارالحکومت میں اسے سیاسیات کے مطالعہ کا اچھا موقع ملا، وہ شاہی عمارتوں کی ساخت پر غور کر رہا تھا جب اسے یہ احساس ہوا کہ

---

[1] "انیسویں صدی کی سیاسیات" ؞

وہ جرمن فنِ تعمیر کے اثرات سے قطعاً عاری ہیں۔ زیک اور سروی معماروں نے انہیں اپنے حسب منشا، بنایا تھا، اس لئے روز بروز وی آنا ایک غیر جرمن شہر بنتا جاتا تھا +

وی آنا کے اخبارات بھی جرمن تہذیب کی تخریب میں کوئی کمی نہ کرتے تھے۔ ان کا رویہ حد درجہ قابلِ اعتراض تھا، وہ ولیم ثانی قیصرِ جرمنی پر پھبتیاں کہتے تھے، ان کے یہودی مالک اور مدیر جرمن قوم کی تباہی پر تُلے ہوئے تھے اور رائے عامہ کو اپنے اس ناپاک ارادہ کی تکمیل کے لئے حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے، ہر جرمن چیز اُن کی نظر میں مذموم اور قبیح تھی۔ اِن کی تعریف صرف یہودی مصنفین اور فرانسیسی مدبرین کے لئے مخصوص تھی +

آسٹریا کا شاہی خاندان ہیپسبرگ صرف برائے نام جرمن تھا۔ ورنہ جرمن قوم کے مفاد کی پامالی میں شاہی خاندان کے رُکن پیش پیش نظر آتے تھے، رعایا کے غیر جرمن طبقہ میں ہر دلعزیز بننے کے لئے وہ جرمنوں کے جائز مطالبات کی بھی پروا نہ کرتے تھے، پارلیمان میں اکثریت غیر جرمن طبقہ کی تھی اور وزارت پر بھی کئی غیر جرمن متمکن تھے، ملک کا سیاہ و سفید یہودیوں کے ہاتھوں میں تھا +

جرمنوں نے اس ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن کسی نے ان کی فریاد پر کان نہ دھرا۔ ڈاکٹر کارل لوگر ( DR. KARL LUEGER ) جرمن رہنما نے اپنے حقوق کے تحفظ اور یہودیوں کے اقتدار کو کم کرنے کے لئے کرسچن سوشلسٹ پارٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی لیکن مکار یہودیوں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی، اپنے ماتھے پر پانی کے چند قطرے گرا کر عیسائیوں کو دھوکا دینا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ وہ بے تکلف بپتسمہ لے کر عیسائیوں کی صف میں شامل ہو جاتے تھے اور اندر اندر ان کی جڑیں کاٹتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ڈاکٹر لوگر ( LUEGER ) کی تحریک کو کامیاب نہ ہونے دیا اور وہ بیچارہ نامرادی کا داغ سینہ پر لئے قبر میں جا لیٹا +

آسٹروی جرمنوں کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہوگئی، وہ سلطنت جس کی بنیادوں میں ان کے آبا کا خون جما تھا جس کی حفاظت کے لئے وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں کُود پڑتے تھے، جس کے ناموس کے لئے وہ دعائیں مانگا کرتے تھے اغیار کے رحم پر تھی زیک سلافی، کروٹ اور یہودی جن کے دلوں میں ہاپسبرگ خاندان کے خلاف کینہ بھرا ہوا تھا وہی بادشاہ اور ولیعہد کے منظورِ نظر تھے۔ ہاپسبرگ خاندان کی تباہی یقینی تھی +

جولائی ۱۹۱۴ء میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے نہ صرف ہاپسبرگ کا ایوان متزلزل ہو گیا بلکہ تمام دنیا کے سکون میں اس کے جھٹکے سے خلل آگیا۔ آسٹریا کا ولیعہد آرچ ڈیوک فرڈیننڈ جو سلافی تحریک کا سرپرست تھا ایک سروی کی گولی کا نشانہ بنا اور کیفرِ کردار کو پہنچ گیا لیکن یہ نہیں کہ اپنے عملوں کی سزا صرف اسے ملی بلکہ اس کی غلطی کا خمیازہ آسٹریا کی سلطنت کو بھگتنا پڑا، وہ

عظیم الشان طاقت جو رومتہ الکبریٰ کی جانشین تھی اس طرح برباد ہوئی کہ دشمن بھی اس کی حالت دیکھ کر افسوس کرنے لگے +

جب شہزادہ فرڈیننڈ قتل ہؤا تو ہٹلر جرمن فوج میں کام کر رہا تھا، میونک میں اسے یہ خبر ملی تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہؤا کہ کسی جرمن قوم پرست نے شہزادے کا خاتمہ کیا ہوگا مگر جرمن وطنیت کے اس دشمن کی موت سے ایک ایسی بلا جرمن قوم پر نازل ہوئی جس کا منحوس سایہ اب تک جرمنی کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ دُنیا مہیب ترین جنگ کے مصائب سے دوچار ہوئی +

ادھر میدانِ جنگ میں جرمنی کی موت و حیات کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ ادھر برلن اور دوسرے شہروں میں یہودی سازش کا جال بچھا رہے تھے، وہ دفتروں میں، کارخانوں میں، دُکانوں میں جہاں کہیں انہیں موقع ملتا تھا سلطنت کا تختہ اُلٹنے کی تدبیریں سوچتے تھے، اور اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح جرمن قوم ضروریاتِ زندگی کے لئے بھی ان کی محتاج ہو جائے۔ تین سال کی متواتر جدوجہد سے جرمنی کے تجارتی اور دفتری شعبے یہودیوں کے قبضہ میں آ گئے، اب یہودیوں کے بغیر جرمنوں کا گزارا ناممکن تھا۔ یہودیوں نے اس صورتِ حالات سے فایدہ اُٹھانا چاہا اور جرمنی کو بے دست و پا کرنے کی یہ تجویز کی کہ امن پسندی اور اجتماعیت کا وعظ کرنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ جرمنوں کے لئے بہت خوفناک ثابت ہؤا، سنہ ۱۹۱۷ء کے موسمِ سرما میں جب اتحادی پے در پے شکستوں سے بددل ہو گئے تھے، روس ہتھیار ڈال چکا تھا اور قریب تھا کہ فاتح جرمن فوجیں فرانس اور انگریزی عساکر کو سمندر میں دھکیل دیں، اتحادیوں کی قسمت نے یاوری کی، جرمن فوجوں کو فیصلہ کُن حملے کا حکم مِل چکا تھا کہ جرمن بارُود خانوں میں ہڑتال ہو گئی اور جرمن فوجیں جو پیرس کی طرف فاتحانہ پیش قدمی کر رہی تھیں بارود کی کمی سے مجبور ہو کر واپس ہونے لگیں +

جرمنی کی آخری شکست میں بھی یہودیوں کا ہاتھ تھا۔ فوج میں بغاوت کا بیج بونے والے وُہی تھے، جب بحری بیڑہ نے سپہ سالار لیوڈنڈارف کی درخواست کر ٹھکرا کر برطانیہ سے لڑنے سے انکار کر دیا تو فوج کی کمر ٹوٹ گئی، جرمنی کے لئے شکست تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن اگر اس نازک موقع پر اندرونی حالات تشویش ناک نہ ہوتے تو صلح کی شرائط اتنی کڑی اور شرمناک نہ ہوتیں۔ بدقسمتی سے اِن حالات پر قابُو پانا مشکل تھا۔ قیصر ولیم کو دھوکے سے معزول کیا گیا، سپہ سالار لیوڈنڈارف کو فوج کی کمان سے ہٹایا گیا اور اجتماعی جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا +

قیصر ولیم اور لیوڈنڈارف جرمنی کی عسکری شوکت کے نشان تھے، اشتراکیوں نے انہیں اس بہانہ سے ملک بدر کر دیا کہ اِس طرح اتحادی صلح کی شرائط پیش کرنے میں نرمی سے کام لیں گے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ عہدنامہ ورسائی پر جرمنوں سے بنوکِ سنگین دستخط کرائے گئے اور جرمنی کی ذلّت میں کوئی کسر نہ رہی +

عہدنامۂ ورسائی کے بعد ہٹلر میونک میں انقلابی سرگرمیوں کی تحقیقات پر مقرّر ہؤا۔ پھر وہ فوج میں افسرِ تعلیم بنایا گیا، تاکہ وہ سپاہیوں کو پُرامن شہریت کی تعلیم دے، اس طرح اسے تقریر کرنے کا موقع ملا اور اس کا بہترین جوہر جو برسوں تک مخفی تھا

ظاہر ہؤا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے "مزدوروں کی انجمن" کی سرگرمیوں کی تفتیش کا حکم مِلا، انجمن کے صرف چھ رُکن تھے اور اس کا اثر انہی تک محدود تھا لیکن ہٹلر اس کے ایک پُر جوش رکن گاٹفریڈ فیڈر (Gottfried Feder) کی لسّانی سے اس قدر متاثر ہؤا کہ خود بھی تحریک میں شامل ہو گیا +

جرمنی میں اب اشتراکیوں کی حکومت تھی اور یہودیوں کا اقتدار روز بروز بڑھتا جاتا تھا، ہٹلر کی نظر میں یہودیوں اور اشتراکیوں میں کوئی فرق نہ تھا، جرمنی کی تباہی دونوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی، اسے یقین کامل تھا کہ اجتماعیت خالص یہودی تحریک ہے اس کا مقصد فرد کی قابلیت کو نظر انداز کر کے تمام طاقت اکثریت کے ہاتھوں میں دے دینا ہے اور یہودی اپنی دولت کے طفیل اکثریت کو آسانی سے ورغلا سکتا ہے +

اکثریت کبھی فرد کی نعم البدل نہیں ہو سکتی، سو بیوقوفوں میں ایک دانا جتنی قابلیت نہیں ہوتی +

اجتماعی جمہوریت جب تک قائم رہی ہٹلر کے حملے جاری رہے تا آنکہ ۱۹۲۳ء میں مزدوروں کی انجمن جس میں کبھی صرف چھ ممبر تھے جرمنی میں سب سے طاقتور پارٹی سمجھی جانے لگی، اور چھ لاکھ مرد ہر وقت اس کی خدمت کے لئے مستعد نظر آنے لگے، روہروادی کے بااثر تاجرِ آہن تھیسن نے اپنی تھیلیوں کے مُنہ نازی تحریک کو فروغ دینے کے لئے کھول دیئے۔ ہٹلر کی مقبولیت اتنی زیادہ ہو گئی کہ صدرِ جمہوریہ کا بیٹا اور شہزادے بھی اس کی حمایت پر کھڑے ہو گئے اور وہ چانسلر بنایا گیا۔ ہٹلر اپنے "جہاد" میں کامیاب ہو گیا +

ہٹلر نے برسرِ اقتدار ہوتے ہی اپنے تعمیری پروگرام پر عمل کرنا شروع کیا، اس نے ہر مرد کے لئے کام اور ہر عورت کے لئے قابل شوہر مہیا کرنے کا وعدہ کیا تھا، اب اس نے یہ وعدہ پورا کرنے کے لئے ذرائع ڈھونڈنے شروع کئے اور ایک حد تک اسے کامیابی بھی ہوئی، ساٹھ لاکھ بیکاروں کی تعداد گھٹتے گھٹتے ایک تہائی رہ گئی لیکن اقتصادی مہم سے زیادہ اہم معاملات اس کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے، اس نے اعلان کیا کہ ہماری تحریک کی بدولت وہ وقت قریب آ رہا ہے جب ہر شخص ضروریاتِ زندگی کی فکر سے فارغ ہو جائے گا لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ آدمی صرف مادّی خوشی کے لئے زندہ نہیں رہتا +

اسے جرمن قوم کی تنظیم مادّی خوشی سے زیادہ عزیز ہے، وہ جرمن فطرت کے اوصافِ حمیدہ سے بخوبی واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ جرمنوں کی ذہانت، شجاعت اور جفاکشی کی مثال بہت کم قوموں میں ملتی ہے، لیکن اگر ان اوصاف کو برقرار رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو وہ دِن دُور نہیں جب تقدیر جرمنی کی تباہی پر مُہر ثبت کر دے گی، جرمن قوم اسی حالت میں زندہ رہ سکتی ہے جب ادنیٰ قوموں کا خون اس میں نہ مِلنے پائے (ادنیٰ قوموں سے ہٹلر کی مراد یہودی اور اِن کے بھائی بند ہیں) تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی جرمن قوم دوسری قوموں میں خلط ملط ہوئی ہے اس کا نتیجہ جرمن تہذیب اور اقتدار کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہؤا، شمالی امریکہ جہاں خالص جرمن

نسل کے لوگ آباد ہیں جنوبی امریکہ سے جہاں مخلوط نسل کے آدمی رہتے ہیں بہت بہتر حالت میں ہے +

ہٹلر کے نزدیک یہ امر کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ ایرین نسل جس سے جرمن قوم کا تعلق ہے یہودی نسل سے طبعاً افضل ہے، تمام وہ چیزیں جن کی ہم قدر کرتے ہیں، سائنس، آرٹ، ایجادات یہ سب گنتی کی چند قوموں کے دماغ سے نکلی ہیں، یہ تمام قومیں ایک ہی نسل سے ہیں اور جرمن قوم ان میں سے ایک ہے، اگر یہ قومیں تباہ ہو جائیں تو دنیا کی تمام رونق ختم ہو جائے، تخلیق اور تخیل صرف ایرین نسل کا حصہ ہے +

شادیاں صرف ایرین نسل کے افراد سے ہونی چاہئیں، قومی حکومت کا پہلا فرض یہ ہے کہ شادی کو ایک مقدس درجہ دے۔ اس کا معیار اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ آئندہ نسل تندرست ہو، بے جوڑ شادیوں کا نتیجہ ڈراؤنی شکل والے بچوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو آدھے بندر ہوتے ہیں اور آدھے انسان +

قومی حکومت کا دوسرا فرض یہ ہے کہ بچوں کی تربیت اس طرح کرے کہ بڑے ہو کر وہ قابل باپ بن سکیں، تعلیم کا طریقہ ایسا ہونا چاہیئے کہ لڑکا فرصت کا تمام وقت اپنے جسم کی تربیت میں صرف کرے، اسے زمانۂ تعلیم میں بازاروں اور سینما میں وقت ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں ہے مطالعہ کے بعد اسے اپنے جسم کو فولاد کی طرح سخت بنانا چاہیئے تاکہ آئندہ زندگی میں جنگ کی صعوبتیں اس کی کمر نہ جھکا دیں، جنگ کی تیاری تعلیم کا اصلی مقصد ہے، لڑکوں کے دل سے یہ خیال دور کر دینا چاہیئے کہ ان کی صحت کا تعلق صرف انہیں سے ہے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی صحت معصیت کی نذر کر دے کیونکہ آئندہ نسل اس سے اس کا جواب طلب کرے گی +

درسی کتب میں نسلی مسئلہ کو خاص اہمیت دینی چاہیئے تاریخ میں جرمن نسل کے کارناموں پر زور دینا چاہیئے، سائنس میں جرمن موجدوں کی طرف خاص توجہ مبذول کرنی چاہیئے اور صنعتی تعلیم میں یہودیوں کی خود پرستی اور مکاری کو بے نقاب کر کے یہ دکھانا چاہیئے کہ مادی ترقی سے اپنی قوم کی خدمت مستحسن ہے +

تعلیم اور جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ روح کو برے خیالات کے زہر سے بچانے کی تدبیر کرنی چاہیئے، موجودہ زمانہ میں معاشرت کا رجحان نفسانی جذبات کو مشتعل کرنے کی طرف ہے، تھئیٹر، سینما اور رقص و سرود کی محفلوں میں نوجوانوں کی زندگی برباد ہو رہی ہے +

ہٹلر طلبہ کے اخلاق ہی کو نہیں بلکہ تمام جرمن قوم کے اخلاق کو دورِ حاضرہ کی حیا سوز تحریروں سے بچانا چاہتا ہے، اس نے محکمۂ احتساب کو تمام مخرب اخلاق کتابیں سر بازار آگ میں ڈال دینے کا حکم دیا ہے، فرائڈ، ایڈلر اور ہرشفیلڈ کی نوعی تصانیف بھی اس حکم کی نذر ہو گئی ہیں، یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس قانون کا شکار بھی زیادہ تر یہودی مصنفین ہیں +

نازی تحریک نے یہودیوں کی سیاسی اہمیت کا خاتمہ کر دیا ہے، ادبی اور تجارتی حلقوں میں بھی ہٹلر کی سخت گیری نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے! اندرونی طور پر جرمن تہذیب کو یہودیت پر کامل فتح حاصل ہوئی ہے، جرمنی اب صرف جرمنوں کیلئے ہے لیکن جرمن نسل کا ایک طبقہ اب بھی جرمنی کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے، اس پر ہر سال جرمنی کی آبادی میں نو لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے، جرمن نسل کی مشکلات کا واحد حل یورپ میں سلطنت کی توسیع ہے اور جرمنی کا پہلا قدم آسٹروی جرمنوں پر اپنی سیادت قائم کرنا ہوگا، جرمن قوم اضطراب سے اُس دن کا انتظار کر رہی ہے جب ان کے آسٹروی بھائی بند پھر ان سے آملیں گے +

اس دن ہٹلر کے "جہاد" کا مقصد پورا ہو جائے گا +

عطاء اللہ کلیم

# عیشِ شبانہ

رات آگئی ہے عیشِ شبانہ لئے ہوئے
سازِ طرب کا مست ترانہ لئے ہوئے

ٹھنڈی ہوا کی نرم و سُبک سیر رو کے ساتھ
جنّت کا بھُولا بسرا فسانہ لئے ہوئے

تاروں کے جاں فروز و حسَیں جلوہ زار میں
چھوٹا سا خوش خرام زمانہ لئے ہوئے

نیندوں کے کیَف بخش و طرب ناک دُور میں
موسیقیوں کا ایک خزانہ لئے ہوئے

پیدا ہوئے ہیں ذہن میں دھندلے سے کچھ نقوش،
ماضی کا جاں گداز فسانہ لئے ہوئے

آنکھوں میں پھر رہے ہیں گزشتہ دنوں کے خواب
رنگیں فراغتوں کا فسانہ لئے ہوئے

کیا جلد زُود باز جوانی گزر گئی،
میری مسرّتوں کا خزانہ لئے ہوئے

عدم

# کسان

نومبر آگیا۔

رینے الکس نے کہا "آج رات غضب کی سردی ہے۔ برنیڈو! ذرا آتش دان میں اور لکڑیاں جھونک دو"۔

اس علاقے میں ایندھن کی افراط تو تھی ہی برنیڈو نے فوراً اٹھ کر ارشاد کی تعمیل کردی۔

میز پر لکڑی کی ایک نئی چاٹی پڑی تھی۔ وہ دودھ بلو کر اُس میں سے اپنی بیوی کے لئے مکھن نکال رہا تھا۔ بچہ جھولے میں گہری نیند سویا پڑا تھا اور خواب میں مسکرا رہا تھا۔ مارگٹ چرخا کات رہی تھی۔ رینے الکس آگ کے قریب بیٹھی لمبی لمبی سلائیوں سے کچھ بُن رہی تھی اور اپنے کام میں اس قدر مصروف تھی کہ اپنے پوتے یا اُس سوتے بچے کو کبھی ایک نظر دیکھ لینے کے سوا شائد ہی وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہوتی۔ گھر کا چھوٹا سا کواڑ بند تھا۔ حضرت مسیح کی صلیبی تصویر کے نیچے ایک مٹی کے برتن میں گلاب کے پھولوں کا ایک پودا لگا تھا۔ جس کی ہری بھری شاخوں میں چند خوشنما پھول بہار دکھا رہے تھے۔ برنیڈو کی بانسری ایک طرف الماری میں پڑی تھی۔ جب سے جنگ کی خبر آئی تھی اس کا دل اس قسم کی تمام تفریحوں سے اچاٹ ہوگیا تھا۔

یکایک باہر شور و شغب اور چیخ پکار سنائی دی، اور پھر نہایت درد و کرب سے سسکیاں لے لے کر رونے کی صدائیں آنے لگیں۔

برنیڈو نے اُٹھ کر بندوق ہاتھ میں لی اور دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ تمام لوگ گھروں سے نکل کر گلی میں آگئے تھے۔ خوف و ہراس کی ماری عورتیں اپنے بچوں کو سینوں سے چمٹائے نہایت بلند آواز سے آہ و زاری کر رہی تھیں۔

مشرق کی طرف افق کے قریب سرخ رنگ کی ایک مہیب روشنی دکھائی دے رہی تھی اور ہوا میں دور سے چیخوں کی دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔

برنیڈ نے باہر آکر پوچھا "کیا ہوگیا ہے"؟

جواب میں یک دم بیسیوں آوازیں سنائی دیں۔ "جرمن آگئے! جرمن! وہ دیکھو سُرخ سُرخ روشنی! —— شہر جل رہا ہے!!"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے سب پر سناٹا طاری ہوگیا ایسا سناٹا جو اُن کے نالہ و شیون سے بھی کہیں زیادہ بھیانک تھا۔

رینے الکس اپنے پوتے کے قریب آ کھڑی ہوئی اور پھر اپنی حلیم اور سنجیدہ آواز سے کہنے لگی "اگر ہمیں بہر حال مرنا ہے تو آؤ کیوں نہ یہیں مریں"؟

برنیڈو نے جواب میں اُس کے ہاتھ کو آہستہ سے ایک بوسہ دیا۔ سوال کتنا بڑا تھا! اور جواب کس قدر مختصر!! . . . . اور وہ اس سے مطمئن ہو چکی تھی۔

مارگٹ بھی اپنے بچے کو سینے سے لگائے سہم کر اُن کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھوڑی ہی دیر پہلے اس کے چہرے کا رنگ کس قدر شگفتہ تھا۔ اور اب زرد۔ پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولی "وہ اب کیا کریں گے"؟

برنیڈو اُس کے سوال پر ذرا مسکرا کر کہنے لگا "خدا جانے وہ کیا کریں لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، مارگٹ پیاری عورتوں اور بچوں کو شاید ہی وہ موت کے گھاٹ اتاریں"۔

گروہ میں سے ایک آواز آئی "اتاریں گے! ضرور اتاریں گے! کیوں نہیں اتاریں گے"؟

عجیب سناٹے کا عالم تھا۔ سب چُپ چاپ کھڑے تھے ہر طرف سکوت اور تاریکی ہی تاریکی اور دُور بہت دُور مشرق میں چکا چوند کرنے والی تیز روشنی کا ایک سمندر موج زن تھا۔ اب بھی ہوا میں چیخوں کی ہلکی ہلکی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ جیسے بھوک کے مارے بھیڑیئے غرا رہے ہوں جنگ کی تباہی اور آگ نے کس قدر ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔

آخر ایک آدمی نے اس مہرِ سکوت کو توڑا اور بہ آواز بلند کہنے لگا "کیا شہد کی مکھیوں کی طرح اپنے چھتوں سے چمٹے رہو گے؟ کیا تمہیں دھواں دے کر نکالا جائیگا؟ —— چلو بھاگیں!"

لیکن رینے الکس نے اپنی پُروقار آواز سے اُسے خوب ہی ملامت کی اور کہا "خرگوش کی طرح اگر شکاری کتوں سے ڈر کر بھاگتے ہو تو جاؤ بھاگ جاؤ لیکن میں اور میرا کنبہ ایک قدم بھی اپنی بستی سے پرے جانے کے لئے تیار نہیں!

ایک دفعہ تو یہ سب جوانمرد خوب ہی شرمندہ ہوئے۔ ایک عورت! عورت کیا نوّے برس کی ایک ضعیف بڑھیا جوانمردی میں اُن سے سبقت لے گئی تھی . . . . اور اب کوئی بھاگنے کا ذکر تک نہ کرتا تھا۔ ہوا کے سرد جھونکوں میں تمام رات انہوں نے ٹھٹھرتے ٹھٹھرتے گزار دی۔ بچے ماؤں کی گود میں سمٹ کر پڑے کانپتے رہے اور لوگ نہایت بے دلی سے اُفق کی تاریکی میں آگ کے شعلے دیکھتے رہے۔ آسمان پر ایک ستارہ تک نظر نہ آتا تھا ہر طرف سکوت اور ظلمت چھا گئی تھی۔

دن نکل آیا —— کچھ دھندلا سا اُداس اور بہت سرد۔

بوڑھا ماتھورن بڑبڑا کر کہنے لگا "آنے دو جی اُنہیں! صلح صفائی کر لیں گے۔ بھئی ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ بچاؤ کی تو کوئی تدبیر ہی نہیں۔ نہ سپاہی ہیں نہ ہتھیار اور بارود بھی شائد ہی ہو"۔

اس کے جواب میں برنیڈو خاموش رہا اور یکا یک اپنے لمبے لمبے اور متناسب اعضا کو سیدھا کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نیلی نیلی مایوس آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی تھی۔

رینے الکس اپنے چھوٹے سے مکان کے دروازے میں بیٹھی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "تمہارے ہاتھ بے آزار ہیں۔ تمہارے دل پاک ہیں اور تمہارا ایمان روشن ہے۔ ضرورت آپڑے تو موت سے مت ڈریو۔"

یہ سُن کر وہ نیچی نظر کر کے ذرا مسکرانے لگا۔ چند ہی آدمی وہاں باقی رہ گئے تھے کیونکہ بہت سے تو بوڑھے تھے اور باقی نوعمر لڑکے۔ وہی چند آدمی جلدی سے ایک جگہ اکٹھے ہو کر صلاح مشورہ کرنے لگے۔ بوڑھے ماتھورن پسنہارے اور مے فروشوں نے مل کر متفقہ فیصلہ کر لیا کہ آنے والی مصیبت سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ خیر اسی میں ہے کہ ہمارے پاس جو بھی اسلحہ وغیرہ اور کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں کہیں چھپا دیں۔ اور اپنا گھر بار بلا حیل و حجت اپنے خونخوار دشمن کو سونپ دیں۔ اگر ہم نے کچھ اور کیا تو بس سمجھو قتل عام ہو جائیگا۔ اس چھوٹی سی نگری میں توپ تلوار اور آگ کے مقابلے کی تاب کہاں ہے؟

تمام بستی میں صرف برنیڈو ہی ایک ایسا آدمی نکلا جس نے اُن کی سختی سے مخالفت کی اور کہا "کیا . . . ؟ کیا ہم اپنے گھر اپنے بچے اور بیویاں یونہی اُن کے حوالے کر دیں اور مدافعت میں انہیں ایک ضرب تک نہ پہنچائیں؟ نہیں! اگر ہم نے ایسا کیا تو مجھے ڈر ہے کہ ہم مارے شرم کے کہیں ڈوب نہ مریں! ہمیں کون انسان کہے گا؟ آؤ دشمن پر ثابت کر دیں کہ فرانس میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جنہیں موت کا ڈر نہیں۔ آؤ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ تو کریں! قصہ مختصر یہ کہ بہادری کی موت مریں۔ اگر فرانس کا ہر فرد مادرِ وطن کی ہر امکانی مدد کے لئے خواہ وہ کتنی ہی بے حقیقت ہو، تیار ہو جائے تو یہی حقیر سی مدد دشمن کو بھگا دینے کے لئے کافی ہے۔"

ماتھورن اور دوسرے لوگوں نے برنیڈو کا خوب ہی مضحکہ اڑایا اور اس کی باتوں پر غل مچایا اور کہا "تم بے وقوف ہو! کل کے بچے ہو! اپنے ساتھ ہم سب کو بھی تباہ کر دو گے۔ تمہیں کیا خبر ہے کہ ادھر بندوق کا ایک فیر ہوا! نہیں فیر تو کجا کہیں کوئی بندوق تک پائی گئی اور اُدھر دشمن نے سارے کے سارے گاؤں کو پھونک کر رکھ دیا۔"

برنیڈو نے اپنا جوش برقرار رکھا دلیلیں دیں تدبیریں لڑائیں اور آدھی رات تک اس کشمکش کو جاری رکھا۔ اس کے گالوں پر نمکین آنسو بھی بہ رہے تھے۔ بجا غصے اور نفرت و حقارت کے جذبے کے اظہار کے لئے اس کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ اس کے لبوں سے آج پہلی مرتبہ ایک بے باک سادہ پُر اثر اور دلسوز تقریر سُنی گئی تھی لیکن اس کے ساتھیوں پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے سونے کے تمام زیور چھتوں کی کڑیوں میں چھپا دیئے تھے۔ تھوڑی بہت دبلی پتلی بھیڑیں جو باقی رہ گئی تھیں باڑوں میں بھوکی مر رہی تھیں اور وہ خود سب کے سب بھوک کے مارے افسردہ دل اور مصیبت زدہ . . . . روز روز کے خطروں نے انہیں بالکل ہی مردہ کر دیا تھا۔ مال و متاع کی قدر تو انہیں تھی ہی لیکن ایک چیز انہیں اس سے زیادہ عزیز تھی۔ یہ چیز ان کی جانیں تھیں جنہیں وہ کسی طرح ضائع نہ کرنا چاہتے تھے پس وہ اُسے پاگل پاگل کہہ کر پکارنے لگے اور کہنے لگے "توبہ تھوڑا ہی عرصہ پہلے ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی شخص ہمارا قاتل ہوگا۔"

رینے الکس نے جو پاس ہی خاموش کھڑی تھی اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور اس کے کان میں کہنے لگی "میرے بچے تم

ٹھیک کہہ رہے ہو اور وہ غلط لیکن اپنے بھائیوں سے اتنی کشمکش کرنی بھی اچھی نہیں ۔ برنیڈو تم اپنی زندگی جس کام میں لانا چاہتے ہو لاؤ، یہ تمہاری ملکیت ہے، لیکن انہیں انہی کی مرضی پر چھوڑ دو ۔ جو چاہتے ہیں کریں ۔ گیدڑوں کو شیر بنانا تمہاری طاقت میں نہیں"۔

برنیڈو کا سر سینے پر جُھک گیا ۔

اور پھر اپنے ساتھیوں سے بڑبڑا کر کہنے لگا "اچھا تم جو چاہتے ہو کرو! تمہاری مرضی" ۔ ۔ ۔ یکایک وہ اس پر جھپٹ پڑے اور اس کی بندوق چھین کر رات کی سیاہی میں اُس چھوٹے سے گرجے کی سمت غائب ہو گئے جو گھنے جنگل میں ایک پہاڑی پر واقع تھا ۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے بندوق اور باقی سب ہتھیار اُس قربان گاہ کے نیچے دفن کر دیئے جہاں مصلوب یسوع کا مرمریں مجسمہ کھڑا تھا ۔

اب ماتھورن بصد اطمینان مے فروشوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا "جان بچی لاکھوں پائے! اب ہمیں کوئی کھٹکا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی شکر کرو شکر! ہم اس پاگل کی باتوں میں نہیں آئے اگر ہم وہ کرتے جو وہ کہہ رہا تھا تو بس سمجھ لو کہ ہم سب کے سب ۔ ۔ ۔ ۔"

برنیڈو کے پاس اب مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا ۔ اب اگر اس کے پاس کوئی چیز باقی رہ گئی تھی ۔ تو وہ خود اس کی زندگی تھی ۔ وہ بالکل چپ چاپ اور بے حس و حرکت کھڑا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تمام خواہشات مردہ ہو گئی ہیں وہ اپنے وطن کی خاطر ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن سے مقابلہ کرتا لیکن افسوس انہوں نے تو اسے اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا ۔ اب وہ کھڑا تھا تن تنہا مایوس اور بے دست و پا ۔

آخر آپ ہی آپ کہنے لگا "انتظار کرنے کے سوا اب اور کچھ باقی نہیں رہا" ۔

* * *

اندھیرا ہو گیا ۔ خزاں کا دن ختم ہو گیا تھا ۔ برنیڈو بازو میز پر ٹکائے اور اُن پر اپنا غمگین سر جھکائے بیٹھا تھا ۔ مارگٹ بچے کو بہلا رہی تھی اور رینے الکس شاید دعا مانگ رہی تھی ۔

یکایک باہر گلی میں عورتوں کی چیخ پکار اور گھوڑوں کی ٹاپ اور فوجیوں کی کرخت آوازیں سنائی دیں ۔ اندھیرے میں تلواریں بجلی کی طرح چمک جاتی تھیں اور فوجی سوار ندی میں چھینٹے اڑاتے جھپٹتے چلے آ رہے تھے ۔

برنیڈو اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس کا رنگ زرد اور اُس کی نیلی آنکھیں رات کی طرح تاریک ہو گئی تھیں ۔

اُس نے پھر آہستہ سے کہا "وہ آ گئے ہیں" ۔ اس لئے نہیں کہ اُسے یکایک کوئی خطرہ یا دہشت محسوس ہوئی تھی بلکہ اس لئے کہ اس وقت اس کی رُوح میں اپنے وطن اور اپنی قوم کی محبت سرایت کر چکی تھی ۔ وہ دونوں کی حفاظت کے لئے آخری دم تک کشمکش کرتے ہوئے مرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا!

اس نے نہایت بے باکی سے گھر کا دروازہ کھولا اور دہلیز پر دشمن کے رُوبرو کھڑا ہو گیا گلی سپاہیوں سے بھر چکی تھی ——

کچھ سوار تھے اور کچھ پیادہ۔ اُن کے گروہ کے گروہ جنگل میں اور سڑک پر اس طرح امنڈے چلے آتے تھے جیسے مردار پر گدھ۔

یہ ایک چھوٹی اور حقیر سی جگہ ہی تو تھی اسے یونہی امن سے رہنے دیتے۔

کسی کی جرأت تھی کہ اُن کے سامنے آئے!

گاؤں کے لوگ نہایت بیچارگی کی حالت میں کھڑے تھے مصیبت نے اُن کے آنسو تک خشک کر دیئے تھے۔ خانگی زندگی کا معمولی سامان ہی اُن کی دولت تھا اور وہی اُن کی نظروں کے سامنے ہمیشہ کے لئے لُٹ رہا تھا۔ اب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ خدا جانے یہی اسلحہ اور آگ جو اس وقت ہمارے گھروں کو پھونک رہے ہیں، رات ختم ہونے سے پہلے پہلے ہمارا کیا حشر کریں گے۔

جھونپڑی کی ڈیوڑھی کے نیچے انجیر کے درختوں کے ساتھ لگ کر دو عورتیں خاموش اور بے حس وحرکت کھڑی دیکھ رہی تھیں ـــ برنیڈو کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ سیدھا کھڑا تھا حقارت کے غضبناک جذبے سے اُس کی آنکھیں جل اُٹھی تھیں۔ مارگٹ اپنے پھول سے خوبصورت بچے کو گود میں لئے بے حس وحرکت کھڑی تھی کیونکہ برنیڈو کی یہی مرضی تھی۔ ریبنے الکس اپنے چہرے پر ایک صبر آزما دہشت کے تاثرات لئے ذرا سیدھی ہو کر کھڑی ہوگئی تھی اور اُس نے اپنے سینے سے ایک صلیب لگا رکھی تھی۔

دفعۃً مسلح گروہ میں سے ایک آواز آئی۔ "پکڑ لاؤ اس کسان کو ادھر!"

یکایک برنیڈو پر بہت سے ہاتھ آن پڑے اور فوجی اُسے اُس کے دروازے سے زبردستی دھکیل دھکیل کر اس جگہ لے گئے۔ جہاں نیزہ برداروں کا سردار ایک بڑے سے سفید گھوڑے پر بیٹھا تھا اس کا گھوڑا تھک کر لڑکھڑا رہا تھا اور اس کے نتھنوں سے شاید خون بہ رہا تھا۔

برنیڈو نے اپنے آپ کو اجنبیوں کی گرفت سے جھٹک کر چھڑا لیا اور دشمن کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔ اب اس کا چہرہ زرد نہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب روشنی پیدا ہوگئی تھی جس سے اس کا عزم و استقلال ظاہر ہو رہا تھا۔

جرمن کمانڈر کہنے لگا "اچھا؟ باقی گدھوں سے تم ذرا کم بیوقوف معلوم ہوتے ہو! کیا تم اپنے ملک سے اچھی طرح واقف ہو؟

"اچھی طرح!"

"تمہارے پاس ہتھیار ہیں"؟

"تھے!!"

"پھر کہاں رکھے تم نے"؟

"اگر مجھے اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو تم خود اُن کی موجودگی محسوس کر لیتے۔ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی"۔

جرمن سردار نے اس کی طرف نہایت پُرشوق نگاہوں سے دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کے بہادرانہ جواب کی

واد دے کر کہنے لگا" کیا تم بتا دو گے ہتھیار کہاں ہیں"؟

"نہیں"!

"تم جانتے ہو کہ اسلحہ چھپانے کی سزا موت ہے"؟

"ہاں ——— تمہارا قانون یہی ہے"۔

"ہاں ہمارا قانون یہی ہے اور جرمنوں کی مرضی ہی فرانس کا قانون ہے تم ایک بہادر آدمی ہو اور تمہاری قدر واقعی موت ہی کر سکتی ہے لیکن اب میں پھر تم سے پوچھتا ہوں کہ تم اس ملک سے اچھی طرح واقف ہو؟

برنیڈو مسکرا پڑا جیسے ایک ماں مسکرائے جسے کوئی سادہ لوح یہ پوچھے کہ تمہیں اپنے مرحوم بچے کی شکل یاد ہے؟

"اگر تم اس سے خوب واقف ہو تو میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں۔ میری رکاب کا چمڑا پکڑ لو اور اس کے ساتھ چمٹے رہو اور جیسے کوّا ایک ہی سیدھ میں اُڑتا ہے اُسی طرح مجھے سیدھا اُسی جگہ لے چلو جہاں ہتھیار چھپائے گئے ہیں۔ اگر تم نے بتا دیا تو تمہاری جان بخشی کر دی جائے گی اور اگر تم نے ———"

"ہاں اگر میں نے نہ بتایا تو"؟

"پھر تم گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے"۔

برنیڈو خاموش تھا۔ سپاہیوں کے جمگھٹے میں سے اُسے سامنے کے درختوں کے نیچے اپنی جھونپڑی نظر آئی۔ مارگٹ اور رینے اُسے نہایت بیتابی سے تلاش کر رہی تھیں کہ انہیں کہیں برنیڈو دکھائی دے لیکن سپاہی ہر مرتبہ انہیں پیچھے دھکیل دیتے تھے متحرک شعلوں کی ہلتی ہوئی روشنی میں نہ تو وہ اسے دیکھ سکتی تھیں اور نہ اس ہنگامے میں کچھ سن سکتی تھیں ——— یہ دیکھ کر برنیڈو نے خدا کا شکر ادا کیا۔

ایک لمحے کے بعد فوجی لیڈر نے نہایت بے صبری سے پوچھا" اچھا پھر بتاؤ تم نے اپنے لئے کیا انتخاب کیا ہے"؟

برنیڈو کے ہونٹ سفید پڑ گئے تھے لیکن جب اس نے جواب میں یہ الفاظ کہے کہ "میں غدار نہیں ہوں" تو وہ اس وقت کانپ نہیں رہے تھے۔ اس وقت اس کی نگاہیں آہستہ آہستہ اس چھوٹی سی ڈیوڑھی کی طرف اُٹھ گئیں جہاں اب بھی آتشدان میں آگ چمک رہی تھی اور ——— جہاں اس نے اپنے عزیز ترین رشتہ داروں میں بیٹھ کر مسرت کے کئی سال گزارے تھے۔ آہ کہیں قسمت مجھے ہمیشہ کے لئے وہاں جانے سے روک نہ دے!

جرمن کمانڈر نے اُسے ذرا گھورا اور پھر کڑک کر کہنے لگا" شیخی بگھار رہا ہے یا تیرے بیان میں کچھ حقیقت بھی ہے"؟

برنیڈو نے بس ایک نعرہ اور جواب دیا "میں غدار نہیں ہوں"۔

جرمن سردار نے اشارہ کیا۔ یکایک ایک دھماکا ہوا۔ برنیڈو زمین پر مردہ پڑا تھا۔ ایک گولی اس کے دماغ سے ہوتی ہوئی نکل گئی اور دوسری پھیپھڑوں میں پیوست ہو گئی۔ سپاہیوں نے اس کے کانپتے ہوئے گرم جسم کو پاؤں کی ایک ٹھوکر لگا کر پرے پھینک دیا۔

انہوں نے صرف ایک کسان کو مار ڈالا تھا!

(اڈیٹڈ)

**مہدی علی خاں کرم آباد**

# شہریارِ صحرا

جب شیرِ عریں دہاڑتا ہے　　　پردے کانوں کے پھاڑتا ہے
اوتادِ زمیں اُکھاڑتا ہے　　　بنیادِ خرد بگاڑتا ہے
چیتل کو کہیں لتاڑتا ہے　　　سانبھر کو کہیں پچھاڑتا ہے
کرتا نہیں یہ کسے زیر
یہ زور یہ شور واہ رے شیر

ہے شیر کی شوکتِ جمالی　　　زینت وہِ منظرِ جلالی
شان اِس کی ہر اک سے ہے نرالی　　　آن اس کی نہیں اثر سے خالی
ہے دل میں جو خوفِ گوشمالی　　　لرزاں ہیں اہالی و موالی
خاموش ادب سے تیندوا ہے
چیتے کا بھی سر جھکا ہوا ہے

جرأت پہ ہیں اس کی سب کے سب غش　　　کیونکر ہو رعیّت اُس کی سرکش
کیا دشت کی لُو سے ہو مشوّش　　　غیظ اس کا فروغ بخشِ آتش
کرتا نہیں کون اس پہ عش عش　　　یہ جسم یہ کسوتِ منقّش
قدرت سے جو داد اُس نے چاہی
دی اُس نے قبائے پادشاہی

ناموں پہ ہے اس کے عقل ششدر　　　ضیغم، ضرغام، اسد، غضنفر،

ڈالوں نظر اس کی کس ادا پر    ہر شان ہے امتیاز پرور
طغیانیٔ آب کا یہ منظر!    جاتا ہے یہ پھر بھی تیر بن کر
دلکش شانِ شناوری ہے
غواصِ یم دلاوری ہے
اوصاف سے اس کے ہو کے آگاہ    کہتا نہیں کون واہ وا واہ
تیور سے نمود عزت و جاہ    اجلال و شکوہ اس کے ہمراہ
آواز میں رُعب، رُخ ادب خواہ    خوددار بہت ہے، قصہ کوتاہ
خُوش، رنج سے "شہریار صحرا"
پھُول اس کیلئے ہیں خارِ صحرا
شیر اپنا جواب آپ ہی ہے    کیا طاقت اسے خدا نے دی ہے
اس ڈھب کا بھی جانور کوئی ہے    جس نے کہ بغاوت اس سے کی ہے
مانی ہوئی اس کی خُسروی ہے    سُلطانِ "قلمروِ خودی" ہے
سنتا ہُوں میں شیر کی زبانی
کیفیّتِ مطلق العنانی
ناداں نہیں، ذی شعور ہے شیر    بے صبر نہیں، صبُور ہے شیر
بے شُبہ بہت غیُور ہے شیر    ذلت کی حدوں سے دُور ہے شیر
خودسر، خودبیں، ضرور ہے شیر    نشہ میں خودی کے چُور ہے شیر
اوروں میں کہاں یہ بانکپن ہے
کچھ اور ہی شیر کا چلن ہے

علی منظور حیدرآبادی

# دکن میں آریاؤں کا داخلہ

ہندوؤں کی قدیم روایات اور مذہبی کتب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ویدی زمانہ ہی سے اکّے دُکّے برہمن رشی گیان دھیان اور تپ جپ کے لئے گوشۂ تنہائی کی تلاش میں ڈنڈکارن کے گھنے جنگلوں میں آیا کرتے تھے اور کسی ندی کے کنارے اپنا آشرم قائم کر لیتے تھے مگر یہاں بھی ان کو چین اور عافیت نصیب نہ ہوئی کیونکہ یہاں کے وحشی اور جنگلی باشندے اُن کے مذہبی رسوم کی ادائی میں خلل انداز ہوتے تھے لیکن بمرورِ زمانہ برہمن رشیوں کے اعلیٰ کردار اور اُن کے تجرّد و تقدّس کی زندگی سے وحشی اقوام کے چند سردار بہت متاثر ہوئے اور اُن کے عقیدت مند بن گئے۔ ان رشیوں میں سب سے زبردست ہستی اگستیا مُنی کی تھی۔

برہمنوں کے بعد چند چھتری سورما بھی یا تو خانہ جنگیوں کے باعث ترک وطن کر کے یا محض اپنے شاندار مہمّاتی کارناموں کی نمائش کے لئے دکن میں آئے اور یہاں کی وحشی قوموں سے مصروف پیکار ہوئے لیکن ان کو دکن کی مہذب اور زبردست دراوڑی ریاستوں میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی بلکہ اُن کی ساری تگ و دو صرف صحرائی علاقوں تک محدود رہی۔ یہ بیانات ہندوؤں کی رزمیہ کتابوں، افسانوں اور روایتوں پر مبنی ہیں جن میں تاریخی عنصر تقریباً مفقود ہے۔ اگر انہیں صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو برہمن رشیوں اور چھتری سورماؤں کی تعداد دریا میں قطرہ کی سی تھی۔ وہ دراوڑی ممالک پر کوئی نمایاں اثر نہ ڈال سکے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ملکِ دکن میں آریاؤں کی کثیر تعداد کب داخل ہوئی؟ اُن کی آمد فاتحانہ حیثیت سے تھی یا دوستانہ طریقے سے؟ دکن کے باشندوں پر اُن کا کیا اثر پڑا؟ ان امور کی دریافت کے لئے ہمارے پاس کوئی راست معتبر تاریخی شہادت موجود نہیں ہے البتہ مسٹر بھنڈارکر نے آریاؤں کے دکن میں داخل ہونے کا زمانہ دریافت کرنے میں بڑی تحقیق و تلاش سے کام لیا ہے چنانچہ اُن کا بیان ہے کہ مشہور سنسکرت قواعد نویس پانی نی نے نحوی اصول و قواعد کی توضیح و تشریح کے ضمن میں اپنی وسیع جغرافی معلومات کا اظہار کیا ہے لیکن اُس نے جتنے ملکوں، دریاؤں یا پہاڑوں کے نام لئے ہیں وہ سب کے سب شمالی ہند میں واقع ہیں۔ اگر اس نے کسی جنوبی ملک کا نام لیا ہے تو وہ کلنگا (موجودہ شمالی سرکار) ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پانی نی کے زمانے تک آریہ دکن اور جنوبی ہند کے جغرافیہ سے ناآشنا تھے۔ اس میں شک نہیں کہ جزیرہ نمائے ہند کے اکثر مقامات کا ذکر رامائن اور مہابھارت میں موجود ہے۔ اس کے متعلق علما نے دو قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں اول یہ کہ ان رزمیہ کتابوں میں مقامات کی تفصیل زمانہ مابعد میں داخل کی گئی کیونکہ رامائن اور مہابھارت

کسی خاص زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ مختلف ازمنہ میں ان میں ترمیم و اضافہ ہوا کیا ہے اور بقول مسٹر ونسنٹ اسمتھ ہر دو رزمیہ نظموں نے دوسری صدی عیسوی میں اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ رامائن اور مہابھارت محض افسانوی کتابیں ہیں جن کو کوئی تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ان میں جتنے مقامات کے نام درج ہیں وہ محض فرضی ہیں عمران و آبادی میں ترقی ہونے پر جو نئے نئے مقامات بسائے گئے ان کے نام مذہبی تقدیس و تبریک کی بنا پر رزمیہ کتب سے اخذ کر لئے گئے اور فرضی مقامات کے ساتھ جو واقعات وابستہ تھے وہ نوآباد مقامات سے منسوب کر دیئے گئے۔ واقعات میں ربط و تسلسل پیدا کرنے کے لئے آس پاس کے پہاڑوں اور دریاؤں کے نام بھی وہی رکھ دیئے گئے جو رامائن اور مہابھارت میں درج تھے۔ بایں ہمہ آج بھی دکن اور جنوبی ہند کے متعلق ان رزمیہ کتب میں ایسے مقامات کے نام بھرے پڑے ہیں جو محض فرضی ہیں اور جن کی نشان دہی ناممکن ہے۔ الغرض پانی نی کے زمانے میں شمالی ہند کے آریا بندھیاچل پہاڑ کے جنوب میں جو ممالک واقع ہیں ان سے ناواقف تھے! البتہ وہ کلنگا دیس یعنی شمالی سرکار تک پہنچ گئے تھے۔

پانی نی کے کئی صدیوں کے بعد ایک دوسرا قواعد نویس کتیانا یا کوتیلیا پیدا ہوا جس نے "ارتھ شاستر" تصنیف کی جو پانی نی کی کتاب کی بسیط شرح ہے۔ کتیانا نے اپنی کہاوتوں میں جو "وارتیکا" کہلاتی ہیں اکثر جگہ مہشمت (وادی نربدا) چولا۔ چیرا۔ پانڈیا۔ کنتالا وغیرہ کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شمالی ہند کے آریا پانی نی کے زمانے میں جزیرہ نمائے ہند کے جغرافیہ سے لاعلم تھے لیکن کتیانا کے زمانے میں واقف ہو گئے تھے! اس لئے آریا ان دو قواعد نویسوں کے درمیانی زمانہ میں دکن میں آ کر آباد ہوئے ہونگے۔

اب ان دونوں قواعد نویسوں کا زمانہ تعین طلب ہے۔ کتیانا کی "ارتھ شاستر" کے خاتمہ پر مرقوم ہے کہ "یہ شاستر ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جس نے دھرم علوم و فنون اور کتبِ مقدسہ کو ملحد نندا راجہ کی تباہ کاریوں سے بچا لیا۔ یہ زمانے کا افسوسناک انقلاب ہے کہ زمین کی حکومت ایک ایسے ناپاک راجہ کے قبضہ میں آ گئی ہے جو سچے دیوتائی دھرم کی توہین کرتا ہے" چونکہ نندا خاندان کے راجہ جین مت کے پیرو تھے۔ برہمنی مذہب کے دیوتاؤں کو نہیں مانتے تھے! اور برہمنوں کی حمایت و سرپرستی بھی نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کتیانا نے اپنے معاصر نندا راجہ کو ملحد و بے دین کہا ہے۔ پرانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ "سیسوناگ" خاندان کے زوال کے بعد مہاپدم نند اگدھ تخت پر قابض ہو گیا۔ نندا خاندان میں نو راجہ گزرے جنہوں نے اکانوے سال تک حکومت کی۔ آخری نندا راجہ کو چندر گپت نے قتل کر کے حکومت چھین لی اور موریا خاندان کی داغ بیل ڈالی۔ معتبر تاریخی وثائق سے چندر گپت کی تخت نشینی کا سال ۳۲۲ ق م ثابت ہے۔ اس حساب سے سیسوناگ خاندان کا خاتمہ اس سے ۹۱ سال پیشتر یعنی ۴۱۳ ق م میں ہوا ہوگا۔ چونکہ کتیانا کسی نندا راجہ کا معاصر تھا اس لئے اس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح قرار دیا گیا ہے۔ رہی پانی نی کے زمانے کی دریافت تو اس کے لئے کوئی تاریخی وثیقہ موجود نہیں ہے اس لئے ہمیں صرف لسانی شہادتوں پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ واضح رہے کہ کتیانا کے بعد ایک مشہور قواعد نویس پتنجلی گزرا ہے جو مگدھ کے سنگا خاندان کے بانی پوشیامتر کا ہمعصر تھا۔ پوشیامتر کا ۱۸۵ ق م سے ۱۴۹ ق م تک حکومت کرنا معتبر تاریخی وثائق سے ثابت ہے۔ چنانچہ یونانی مصنفین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۵۵ ق م باختریہ کے یونانی فرمانروا یوکرے ٹائیڈس کے ایک رشتہ دار میناندر نے جو وادیٔ کابل کا والی تھا ہندوستان پر حملہ کیا۔ دو سال تک پوشیامتر اور میناندر کے درمیان سخت معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔ ابتدا کئی معرکوں میں میناندر ظفریاب رہا لیکن ۱۵۳ ق م میں پوشیامتر

نے مینانڈر کو شکست دے کر اسے ملک سے نکال باہر کیا۔ پھر یونانیوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اسی اثنا میں پوشیامتر کے فرزند اگنی مترنے جو مالوہ کا حاکم تھا اور جس کا پایۂ تخت بھیلسا تھا ویدآربھا (برار) کے راجہ پر فتح حاصل کی۔ ان کامیابیوں کی وجہ سے پوشیامتر کو چھتر پتی اور چکرورتن بننے کا شوق ہوا اس لئے اُس نے بڑی دھوم دھام سے ۱۵۰ ق م میں "اسوامیدھ" (قربانیٔ اسپ) کی قدیم ویدی رسم ادا کی۔ پتنجلی نے اپنی تصنیف میں ان واقعات کو ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسوآمیدھ کی شاندار تقریب کا عینی شاہد اور پوشیامتر اور مینانڈر کا ہمعصر تھا لہٰذا پتنجلی کا زمانہ دوسری صدی قبل مسیح کا وسط قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حساب سے کتیانا اور پتنجلی کے زمانوں میں ڈھائی صدیوں کا فصل پایا جاتا ہے۔

بہ انقضائے زمانہ ہر زبان میں تغیر و تبدل واقع ہوتا رہتا ہے۔ سنسکرت زبان کے ماہروں کا بیان ہے کہ پانی نی کے زمانے کی سنسکرت اور کتیانا کی استعمال کردہ سنسکرت میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ بہت سے الفاظ جو پانی نی کے زمانے میں مروج تھے کتیانا کے زمانے میں متروک ہو گئے تھے۔ نحوی ترکیب۔ محاورات اور اسلوب بیان میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ اسی قسم کا یا اس سے کچھ کم تفاوت کتیانا اور پتنجلی کی زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ ان دونوں قواعد نویسوں کے درمیان ڈھائی صدیوں کا فصل ہے اس لئے پانی نی اور کتیانا کے درمیان اس سے کچھ زیادہ لسانی تبدیلیاں کم سے کم تین صدیوں میں واقع ہوئی ہونگی۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ کتیانا کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح تھا۔ اس لئے پانی نی کا ظہور اس سے تین صدیاں پیشتر یعنی ساتویں صدی قبل مسیح میں ہُوا ہوگا۔ پروفیسر گولڈاسٹکر نے دوسری لسانی شہادتوں کی بنا پر بھی پانی نی کا زمانہ ساتویں صدی قبل مسیح قرار دیا ہے۔ الغرض مذکورہ بالا بحث و تمحیص سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دکن میں آریاؤں کا باقاعدہ داخلہ ساتویں اور چوتھی صدی قبل مسیح کے درمیانی دور میں ہُوا ہوگا۔

لیکن یہ دریافت کہ ساتویں اور چوتھی صدیوں کی وسیع درمیانی مدت میں کسی نہ کسی وقت آریا یہاں آئے ہونگے کچھ زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے ابھی صحیح زمانے کی تعئین و تحدید کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ ڈاکٹر بوہلر نے اس تخصیص میں ایک دلیل پیش کی ہے جو اگرچہ منطقی نہیں ہے تاہم قابلِ تسلیم ضرور ہے۔ اُن کا استدلال ہے کہ جنوبی ہند کے دراوڑوں (ڈراویڈین) نے آٹھویں صدی قبل مسیح میں جبکہ ان کے کالدیہ، آسوریہ، بابل، نینوا، مصر وغیرہ سے تجارتی تعلقات قائم تھے شامی ابجد اور شامی طرز تحریر سیکھ لی تھی تحقیقِ جدیدہ سے ثابت ہے کہ قدیم دراوڑ ایک عظیم الشان قوم تھے جو اُس وقت کے تمام مہذب اقوام کے ساتھ میل جول رکھتے تھے اور دور دراز ملکوں کی سیاحت بھی کرتے تھے۔ بہرحال مہذب دراوڑ آٹھویں صدی قبل مسیح ہی میں فن تحریر سے واقف ہو چکے تھے۔ لیکن شمالی ہند کے آریاؤں کے ہاں پانچویں صدی قبل مسیح میں ایرانیوں کے توسط سے خروستی ابجد کی اشاعت ہوئی۔ اگرچہ خروستی ابجد کو بھی شامی ابجد سے دور کا رشتہ تھا لیکن اس میں ترمیم و اضافہ کر کے اسے مکمل اور سہل التحریر بنا لیا گیا تھا۔ الغرض خروستی ابجد اور طرز تحریر کو شامی ابجد اور طریقۂ تحریر پر کئی اعتبار سے برتری حاصل تھی۔ پانچویں صدی عیسوی میں دراوڑوں کو شامی ابجد سیکھے ہوئے صرف تین صدیاں گزری تھیں اس لئے اُس وقت تک تامل طرز تحریر نے جو شامی ابجد پر مبنی تھی ایسی مستقل ہیئت اختیار نہیں کی تھی کہ اس میں تبدیلی ممکن نہ ہو۔ اگر شمالی ہند کے خروستی ابجد سے واقف کار آریا پانچویں صدی قبل مسیح کے بعد جزیرہ نمائے ہند میں وارد ہوتے تو وہ یقیناً اپنے ساتھ خروسطی ابجد بھی لیتے آتے اور اس مکمل و سہل التحریر ابجد سے تامل ابجد ضرور متاثر

ہوتی لیکن تامل ابجد کی سادگی ادھورے پن اور اشکال سے صاف عیاں ہے کہ اس پر خروستی طرز تحریر کا مطلق اثر نہیں پڑا ہے اگر یہ فرض کیا جائے کہ دراوڑوں کی خودداری اور قدامت پسندی نے تامل طرز تحریر میں کسی قسم کی ترمیم یا مداخلت گوارا نہ کی تو بھی نووارد آریاؤں کا تو خروستی ابجد سے واقف ہونا لازمی امر تھا لیکن جزیرہ نمائے ہند میں آج تک کوئی قدیم کتبہ خروستی ابجد میں لکھا ہوا نہیں پایا گیا ہے۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ آریاؤں نے پانچویں صدی قبل مسیح میں ایرانیوں سے خروستی طرز تحریر سیکھا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایران کے خاندان اشکانیاں کا نامور شہنشاہ دارا ابن گشتاسب ۵۲۱ ق م سے ۴۸۵ ق م تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ ۵۱۶ ق م میں اس نے ایک زبردست فوج وادیٔ سندھ کی تسخیر کے لئے روانہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شورہ زار سے سمندر تک کا سارا علاقہ ایرانی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ یہ علاقہ سلطنتِ ایران کی بیسویں اقلیم قرار پایا جس کی آمدنی تمام اقالیم سے زیادہ تھی۔ اس اقلیم میں سندھ، خیر پور، بہاولپور کے علاوہ راجپوتانہ اور پنجاب کا بھی بڑا حصہ شامل تھا مسٹر ونسنٹ اسمتھ کا بیان ہے کہ اس وقت راجپوتانہ کے ریگستانی علاقے بھی بڑے شاداب اور آباد تھے۔ بہر حال اس زمانے میں اہل ہند اور اہل ایران کے درمیان گہرے تعلقات قائم تھے اس لئے اول الذکر نے مؤخر الذکر سے خروستی ابجد سیکھی ۔

ملک دکن اور جنوبی ہند میں خرودستی کتبہ کی عدم موجودگی اس امر کی شاہد ہے کہ آریاؤں کا وہ گروہ جو دکشناپاٹھ میں آکر آباد ہوا۔ خرودستی طرز تحریر سے ناواقف تھا بلکہ لکھنا جانتا ہی نہ تھا۔ جزیرہ نمائے ہند میں آکر نووارد آریاؤں نے دراوڑوں سے لکھنا سیکھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آریا پانچویں صدی قبل مسیح سے پیشتر ہی یہاں آئے ہونگے جبکہ اُن کے ہاں خرودستی طرزِ تحریر کا رواج ہی نہ ہوا تھا۔ اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ آریا ملک دکن میں پانی نی کے زمانے یعنی ساتویں صدی قبل مسیح کے بعد آئے تھے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ شمالی ہند کے آریا ساتویں صدی قبل مسیح کے بعد اور پانچویں صدی قبل مسیح کے پیشتر یعنی چھٹی صدی قبل مسیح میں جوق کے جوق ملک دکن میں وارد ہوئے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو خیال ہو کہ جب آریا پانچویں صدی قبل مسیح تک لکھنا جانتے ہی نہ تھے تو وہ کس طرح اتنے عظیم الشان سنسکرت لٹریچر کے حامل تھے؟ بات یہ ہے کہ برہمنوں کی مذہبی سرگرمی محیر العقول تھی۔ وید اور دوسرے علوم ان کو زبانی یاد تھے۔ یہ مقدس مذہبی ذخیرہ نسلاً بعد نسلٍ برہمنوں میں زبانی طور پر منتقل ہوتا رہا۔ برہمنوں کا سینہ تمام مذہبی علوم و معارف کا گنجینہ تھا سینکڑوں سال کے بعد یہ گنجینہ سینہ سے سفینہ میں منتقل ہوا۔ طرز تحریر سے آشنا ہونے پر بھی برہمن بہت مدت تک اپنے مقدس و پُر اسرار مذہبی لٹریچر کو ضبط تحریر میں لانا پسند نہیں کرتے تھے تاکہ عوام کی نگاہ سے وہ مخفی رہے اور اس طرح ان کا (برہمنوں کا) اقتدار قائم رہے ۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آریا کس راستے سے دکن میں داخل ہوئے۔ کہاں آباد ہوئے اور وہاں کے لوگوں پر اُن کا کیا اثر پڑا؟ یہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ آریا کوہِ بندھیاچل کو عبور کر کے نہیں آئے ہونگے کیونکہ اس طرف کوہ بندھیاچل کے علاوہ کوہ ست پڑا، دریائے نربدا یا دریائے تاپتی اور گھنے جنگل ان کی راہ میں مانع و مزاحم تھے۔ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ پانی نی ہی کے زمانے میں آریا کلنگا دیس یعنی شمالی سرکار تک پہنچ گئے تھے۔ اسی راستے سے وہ آہستہ آہستہ مغرب کی طرف بڑھے اور پہلے ویدار بھا (برار) پہنچے جہاں کی زمین نہایت زرخیز اور آباد تھی وہاں کے باشندوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ ڈنڈکارن کو صاف کر کے وہاں رہنے سہنے لگے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ

دکن کے دراوڑوں نے بغیر جنگ و جدل کے آریاؤں کو دکن میں کیوں آنے دیا اور کسی قسم کی مزاحمت کیوں نہ پیش کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آریا چونکہ دکن میں فاتح کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض دوستانہ حیثیت سے بود و باش اختیار کرنے کے لئے آئے تھے اس لئے لڑائی بھڑائی کی ضرورت نہ تھی۔

علاوہ بریں اب آریاؤں اور دراوڑوں میں ویدی زمانے کی طرح مغائرت و معاندت باقی نہ رہی تھی۔ ویدی زمانے میں یہ دونوں قومیں رنگ و نسل، مذہب و معاشرت، رسم و رواج وغیرہ کے لحاظ سے متغائر تھیں۔ دونوں میں حد درجہ کی منافرت تھی۔ آئے دن معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ چنانچہ رگ وید میں اکثر جگہ "داسیو" (دراوڑوں) کی ہلاکت و بربادی کے لئے دعائیں کی گئی ہیں لیکن بمرورِ زمانہ ان کی مغائرت و اجنبیت مفقود ہو گئی۔ مدت تک ایک ساتھ رہنے سہنے سے اُن کے باہمی بغض و عناد کا جذبہ جاتا رہا۔ مرز بوم اور آب و ہوا کی یکسانی نے انہیں ایک ہی قسم کے لباس و غذا استعمال کرنے پر مجبور کیا۔ دونوں قومیں ایک دوسرے سے شادی بیاہ بھی کرنے لگیں جس سے ان کا رنگ روپ بھی یکساں ہو گیا۔ مہابھارت میں مرقوم ہے کہ پہلے آریاؤں کا رنگ کافور کی طرح سفید تھا۔ پھر کندن کی طرح زرد ہوا اور بالآخر سانولا ہو گیا۔ رنگ کی یہ تبدیلی سیاہ فام دراوڑوں اور سفید فام آریاؤں کے نسلی اختلاط کی وجہ سے تھی۔ ویدی زمانہ کے آریا نوامیسِ فطرت اور قوائے قدرت کے پرستار تھے لیکن رزمیہ زمانے میں ان کی دیومالا میں بہت سے غیر آریائی دیوتا شامل ہو گئے جن میں کوبیرا، گنیش، لکشمی، درگا، شیو، ناگ، شیش وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

الغرض چھٹی صدی قبل مسیح میں جو آریا شمالی ہند سے دکن میں آئے وہ خالص آریائی نسل کے نہ تھے بلکہ ان کی رگوں میں آریائی اور دراوڑی دونوں قسم کا خون رواں تھا۔ انہیں محض تمدنی لحاظ سے آریا کہا گیا ہے کیونکہ ان کے مذہب و تمدن پر آریائی رنگ غالب تھا لیکن اس وقت تک دکن کا تمدن خالص دراوڑی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بہرحال چونکہ یہ آریا ویدی آریاؤں کی طرح دراوڑوں کے دشمن نہ تھے بلکہ کئی اعتبار سے ان کے مشابہ تھے اس لئے انہوں نے زیادہ مزاحمت پیش نہ کی۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شمالی ہند سے آریا کلنگا ہوتے ہوئے پہلے ویدربھا پہنچے اور پھر صحرائی علاقوں کو صاف کر کے وہاں آباد ہوئے۔ جن علاقوں میں انہوں نے بود و باش اختیار کی ان میں سے صرف ویدربھا کا ملک پہلے سے آباد تھا اس لئے اس کو "جن استھان" بھی کہتے ہیں۔ ویدربھا کے باشندے ابتدا ہی سے آریہ رشیوں اور منیوں کے معتقد تھے چنانچہ ایک روایت ہے کہ اگستھیا منی نے اپنی کرامت سے ایک حسین لڑکی پیدا کر کے اسے ویدربھا کے راجہ کی زوجیت میں دے دیا تھا۔ الغرض ویدربھا کے راجہ نے اپنی قدیم عقیدت مندی کی بنا پر آریاؤں کا خیر مقدم کیا اور ان کو اپنے ملک میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت دے دی۔ وہاں سے آریا ڈنڈکارن میں پھیلے۔ آریا نوآبادکارانہ حیثیت سے یہاں آئے تھے اس لئے انہوں نے ڈنڈکارن کو صاف کر کے وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ ڈنڈکارن میں بہت سی وحشی قومیں بھی رہتی تھیں جن میں بعضوں کو تو آریاؤں نے مار بھگایا لیکن بہتوں کو اپنی سماج میں جذب کر لیا اور ان میں اپنی زبان، مذہب اور رسم و رواج کو جاری کیا جس طرح شمالی ہند کے باشندوں پر آریائی اثر غالب ہو گیا تھا اسی طرح ویدربھا اور ڈنڈکارن کے باشندوں پر آریائی مذہب و تمدن غالب آیا۔ جب ڈنڈکارن کا بڑا حصہ جنگلوں سے پاک و صاف ہو کر آباد ہو گیا تو آگے چل کر اس کا نام پراکرت میں "مراسٹیکا" اور سنسکرت میں "مہاراشٹر" پڑا۔ یہاں آریائی و غیر آریائی اقوام کے اتصال و آمیزش سے جو زبان وجود پذیر ہوئی وہ "مرہٹی زبان" کہلاتی ہے۔ اس پر سنسکرت

کا رنگ غالب ہے اور اس کا شمار ہندوستان کی آریائی زبانوں میں ہوتا ہے۔ غرض آریاؤں کی دکن میں آمد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ویداربھا اور مہاراشٹر میں آریائی تہذیب، تمدن اور مذہب، زبان رائج ہوگئی۔ جب آریاؤں کی آبادی بہت بڑھ گئی تو اس نئے ماحول و فضا میں ان کا قدیم مجموعۂ قوانین "بدھیانا" اُن کی رہبری و ہدایت کے لئے ناکافی ثابت ہوا لہٰذا انہوں نے ایک ہی صدی کے بعد ایک جدید مجموعہ قوانین مرتب کیا جو "اپستمبا" کہلاتا ہے۔ کئی صدیوں کے بعد منو نے انہیں دو شاستروں یعنی "بدھیانا" اور "اپستمبا" کی مدد سے اپنی مشہور و معروف "دھرم شاستر" لکھی جو مجموعہ قوانین منو کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے۔

اول اول آریا ویداربھا اور مہاراشٹر میں آکر آباد ہوئے۔ اس کا سب سے زبردست ثبوت تو یہی ہے کہ ان علاقوں میں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے جس پر سنسکرت کا رنگ غالب ہے اور اس کا شمار آریائی السنہ میں ہوتا ہے۔ علاوہ بریں مرہٹوں کی تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج بھی دراوڑی السنہ مثلاً تلنگی، کنڑی، تامل اور ملایلم بولنے والی قوموں سے جداگانہ ہے۔ اب ہمیں پتہ لگانا ہے کہ فی الحقیقت مہاراشٹر ہی وہ علاقہ ہے یا نہیں جہاں پرانے زمانے میں ڈنڈکارن کے گھنے جنگل واقع تھے اور جنہیں صاف کرکے آریاؤں نے اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ نیز واضح ہو کہ ہندو تمام معاشرتی معاملات میں بالعموم اور مذہبی معاملات میں بالخصوص انتہا درجے کے قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ پوجاپاٹ کا جو طریقہ ان کے ہاں ہزاروں سال پیشتر رائج تھا وہ آج تک قائم ہے۔ ہندوؤں کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی مذہبی رسم کی ادائی کے وقت سب سے پہلے اس ملک کا نام لیتے ہیں جہاں وہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اور کچھ منتر جپتے ہیں۔ مہاراشٹر کے ہندو ہر مذہبی تقریب میں پوجاپاٹ کے وقت اپنے ملک کا نام "ڈنڈکارن" لیتے ہیں حالانکہ آج سے دو ڈھائی ہزار سال پہلے ہی ڈنڈکارن صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور اس کی جگہ انسانی آبادیاں قائم ہوگئی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مہاراشٹر کا نام پرانے زمانے میں ڈنڈکارن تھا یعنی آج کل جہاں مہاراشٹر کا علاقہ آباد ہے وہیں قدیم زمانے میں ڈنڈکارن کا مہیب گھنا جنگل واقع تھا جسے آریوں نے صاف کرکے اپنی نوآبادیاں قائم کی تھیں۔

اگرچہ ویداربھا (برار) اور مہاراشٹر کے باشندے آریائی رنگ میں ڈوب گئے لیکن ملک دکن کے مشرقی حصے میں جہاں اندھروں کی زبردست حکومت قائم کی تھی یا جنوبی ہند کی چولا، چیرا اور پانڈیا ریاستوں میں آریاؤں کی دال نہ گلی۔ وہاں دراوڑی تہذیب و تمدن ایسے اعلیٰ زینہ پر پہنچ گیا تھا اور معاشرتی ادارے ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم تھے کہ ہیئت اجتماعیہ کے نظام میں آریاؤں کی وجہ سے مطلق کسی قسم کا تغیر و تبدل واقع نہ ہوا۔ البتہ وہاں دونوں قوموں نے ایک دوسرے کے خیالات و تجربات سے استفادہ کرکے اپنی معلومات میں وسعت حاصل کی۔ اگر دراوڑوں نے آریاؤں سے کچھ سیکھا تو آریاؤں نے بھی دراوڑی نظامِ معاشرت سے سبق حاصل کئے۔ جو آریا مہذب دراوڑی ممالک میں جاکر آباد ہوئے وہ دراوڑوں ہی کی سماج میں ضم ہوگئے اور انہوں نے انہیں کی تہذیب و معاشرت اختیار کرلی۔

البتہ برہمنی دیو مالا کے دیوتاؤں کے کارنامے ایسے دلچسپ اور عجیب و غریب تھے کہ دراوڑی ممالک کے باشندے بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن آریائی مذہب کا اثر صرف قلیل التعداد تعلیم یافتہ طبقہ پر پڑا۔ جزیرہ نما کے کثیر التعداد عوام کا طبقہ ہمیشہ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قائم رہا کیا ہے۔ علما کا خیال ہے کہ دکن اور جنوبی ہند میں آج بھی شاندار برہمنی مذہب کی حیثیت محض ملمع کاری کی سی ہے جس کے نیچے دراوڑی عقائد و توہمات کی مضبوط دھات ہر قسم کی شکست و ریخت اور افسردگی سے محفوظ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک میں

بڑے بڑے منادر آریائی دیوتاؤں سے منسوب ہیں لیکن لوگ کسی خاص تہوار یا جاترا ہی کے موقع پر وہاں جاتے ہیں ورنہ روزانہ زندگی میں وہ اپنے آبائی رسوم و عقائد کے پابند ہیں اور ان کے مقامی دیہی دیوتا ان کی تمام حاجت برآریوں کے لئے کافی سمجھے جاتے ہیں۔ غضبناک دیہی دیوتاؤں پر قربانیاں دی جاتی ہیں تاکہ ان کا غصہ فرو ہو اور وہ چڑھاوے چڑھانے والوں کو تمام آفات و بلیات سے مامون و محفوظ رکھیں۔ بہر حال ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ دکن اور جنوبی ہند کے باشندوں پر آریائی مذہب کا محض خفیف سا اثر پڑا ہے۔

آریاؤں کا ایک مشہور و معروف ادارہ نظامِ ذات بندی بھی تھا۔ چنانچہ آریائی معاشرہ چار ذاتوں یعنی برہمن، چھتری، ویش اور شودر پر منقسم تھا۔ علاوہ بریں وہ وحشی لوگ جو آریائی سماج میں شامل نہیں ہوئے بلکہ دشت و جبل میں جا چھپے چنڈال یا خارج الذات سمجھے جاتے تھے۔ دراوڑوں پر اس نظام کا بھی زیادہ اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ آج بھی دراوڑوں کے ہاں چھتری ذات مفقود ہے۔ چند خاندانوں کے لوگ ویش ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر نہایت کمزور بنیاد پر۔ چونکہ برہمنوں کا طبقہ بہت اعلیٰ اور قابلِ احترام تھا اس لئے دراوڑوں کا بھی تعلیم یافتہ طبقہ برہمن بن بیٹھا۔ اس لئے دکن میں دراوڑ برہمن کثرت سے ہیں۔ زمانۂ مابعد میں جب یہاں بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئیں تو برہمنوں نے ازراہِ تملق انہیں چھتری قرار دیا اور اُن کے فرضی نسب نامے مرتب کر کے سورج یا چاند کو ان کا مورثِ اعلیٰ تسلیم کر لیا لیکن ہندوؤں کی حکومت ختم ہو جانے پر چھتری نسل کے دعویٰ داروں کا نام مٹ گیا۔ عوام کو شودر کا درجہ عطا کر دیا گیا تھا۔ کہیں کہیں "یاریا" بھی پائے جاتے ہیں جو شمالی ہند کے چنڈالوں کے سے حقیر اور ناپاک خیال کئے جاتے ہیں لیکن ان کی آبادی دریا میں قطرے کی سی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے جو مختلف ذاتیں پائی جاتی ہیں وہ زمانۂ مابعد کی پیداوار ہیں ان سب کا درجہ شودر کے مماثل ہے۔ غرضکہ دکن میں حقیقی طور پر صرف دو ذاتیں پائی جاتی ہیں برہمن اور غیر برہمن۔ آخر الذکر طبقے کے لوگ بھی آج کل زیورِ علم سے آراستہ ہو کر بڑی کامیابی کے ساتھ برہمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور مدت سے یہاں برہمن اور غیر برہمن کی جنگ جاری ہے۔ الحاصل دکن کے دراوڑوں پر آریائی نظامِ ذات بندی کا بھی بہت کم اثر پڑا۔

**محمد حسین ادیب**

# مساوات

ایک بڑی مچھلی نے ایک ننھی سی مچھلی کو پکڑ لیا اور اُسے نگل جانا چاہا۔

"ننھی مچھلی نے چلا کر کہا" "یہ سراسر بے انصافی ہے۔ میں بھی تمہاری طرح زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ قانون کی نظر میں ہم سب مچھلیاں یکساں ہیں۔"

بڑی مچھلی نے جواب دیا۔ "میں تم سے اس بات پر ہرگز بحث کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ہم سب ایک ایسے ہیں۔ اگر تم میرا شکار ہونا پسند نہیں کرتیں تو آؤ مجھے اپنا شکار بنا لو۔ آؤ نا! مجھے نگل لو۔ ڈرتی کاہے کو ہو۔"

چھوٹی مچھلی نے بڑی مچھلی کو نگلنے کے لئے منہ کھولا مگر بے سود۔

آخرکار تنگ آکر کہنے لگی "آؤ مجھے نگل لو۔"

(ترجمہ)

**سعادت حسن**

# راحت کدہ

## شام

دن ختم ہو چکا ہے اور شام ہو گئی ہے    ہنگامہ زارِ ہستی اب غرقِ خامشی ہے
غوغائے زندگانی خاموش ہو گیا ہے    آغوشِ شامِ غم میں خورشید سو گیا ہے
لرزش نہیں ہے کوئی اب سازِ زندگی میں    تحلیل ہو گیا ہے ہر نغمہ خامشی میں
بزمِ جہاں کے جلوے مغموم ہو گئے ہیں    تاریکیٔ الم میں معدوم ہو گئے ہیں
ہیں آسماں پر ابرِ آتش نشاں کے ٹکڑے    دامانِ یاس میں ہیں قلبِ طپاں کے ٹکڑے
وہ دامنِ شفق میں تارے چمک رہے ہیں    یا چشمِ ارغواں میں آنسو چھلک رہے ہیں
رہ رہ کے آج "راحت" تو یاد آ رہی ہے    میری فضائے دل پر غم بن کے چھا رہی ہے
بے اختیار میرے آنسو نکل پڑے ہیں    سوزِ غمِ نہاں کے چشمے ابل پڑے ہیں
سینے میں آہ! کیسا طوفانِ غم بپا ہے    آنکھوں میں اشکِ خوں ہے دل تھرتھرا رہا ہے

جب تیرا ذکر کرنا بے اختیار رونا
لے لے کے نام تیرا دیوانہ وار رونا

اثر صہبائی

# حُسنِ نسوانی کا ایک ادبی مصوّر

## گوئٹے

۷۲ - ۱۸۱۱ء

افسانہ نگار قارئین کے دل میں تین مختلف طریقوں سے اپنے منظوم یا منثور افسانوں کے نسوانی کرداروں کے حُسن کا احساس پیدا کرتے ہیں پہلا طریقہ یہ ہے کہ وہ سرے سے اُن کے حسن کے متعلق کوئی تفصیل پیش کرتے ہی نہیں بلکہ محض اُس اثر کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں جو دیکھنے والوں کے دل پر طاری ہوا چنانچہ ہومر ہیلین کی کوئی تصویر نہیں کھینچتا اور صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ جب وہ ٹرائے میں چلتی پھرتی تھی تو اُسے دیکھ کر بڑے بوڑھے بھی جو سرچشمہ شر جان کر اُسے کوستے تھے زیرلب یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے کہ اس کی صورت آسمانوں کی ملکہ کی طرح پیاری ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ افسانہ نگار بہ عجلت ایک سرسری سا خاکا کھینچ کر رکھ دیتے ہیں اور خال و خد کی طویل تفاصیل سے اجتناب کرتے ہیں۔ ٹینی سن نے لائنٹ کی یہ دلکش تصویر اسی انداز سے کھینچی ہے :-

وہ ایک عالی نسب دوشیزہ تھی،
اُس کی پیشانی بہار کا پھول تھی،
اُس کے رخسار سیب کے شگوفے،
اور اُس کی خوبصورت ناک میں پھول کی پتی کا سا نازک خم تھا۔

کلوپیٹرا کی تصویر بھی اُس نے اِسی طرح پیش کی ہے :-

میں نے پلٹ کر دیکھا کہ قرمزی شال کی کھلی ہوئی تہوں کے ایک گل نگار ڈھیر پر،
بہ صد تمکنت ایک ملکہ بیٹھی ہے :
سانولے گال اور بیباک سیاہ آنکھیں،
اور طلائے احمر کی طرح دہکتی ہوئی سرخ پیشانی۔

اگرچہ اس تصویر میں مقابلۃً زیادہ وضاحت ہے لیکن اس کے متعلق بہ آسانی یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ اسے اصل سے دُور کی نسبت بھی نہیں۔ یہ اشعار مصری حسن کا مُرقع ہیں حالانکہ کلوپیٹرا یونانی تھی۔ اس کی ہیلن سے مشابہت زیادہ قرینِ قیاس ہے —— سیمیں بر، متناسب الاعضا، بنفشی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی۔

ہم ابھی دیکھیں گے کہ گوتیئے نے کلوپیٹرا کی تصویر اس سے مختلف انداز میں کھینچی ہے۔

"ادبی مصوّری" کے تیسرے طریقے کا امتحان اب باقی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تفصیلی طور پر ایک ایسی واضح تصویر بنائی جائے جس میں وین آئک کی مصوری کی طرح ادنیٰ سے ادنیٰ اجزئیات پیش کی گئی ہوں۔ گوتیئے اس طریقے کا فریدِ روزگار استاد تھا۔ نہ صرف ایک جلیل المرتبت فن کار اور ایک زبردست ماہرِ لغت ہونے کے اعتبار سے بلکہ اپنے گوناگوں شاہکاروں کی بوقلمونی اور رنگارنگی کے لحاظ سے بھی وہ "ادبی مصوّری" کا استاذالاساتذہ تسلیم ہونے کے قابل ہے۔ اس قول میں مبالغے کا کوئی شائبہ نہیں کہ گوتیئے نے اپنے افسانوں میں اقوامِ عالم کے کم از کم نصف حصّے کے حسن کے مختلف نمونے اہلِ نگاہ کو نذر گزرانے ہیں۔

## وہ کلوپیٹرا کو کس طرح پیش کرتا ہے:

باغ کی روش کی آخری حد پر ایک کشادہ شاہی حمام ہے —— تیرنے کا ایک تالاب جس کے چاروں طرف سنگِ سماق کی براق سیڑھیاں بلوریں پانی میں ڈوبتی ہوئی پسے ہوئے سونے کے ریتے تک جا پہنچتی ہیں۔ کناروں کے گرد حسین عورتوں کے مجسّمے کھڑے ہوئے عطر کی پھوار سے تالاب کی آئینہ پوش سطح پر ایک نقرئی بارش کے ستارے ٹانک رہے ہیں۔ بالائی زینے پر کلوپیٹرا احساسِ حسن کے ناز و غرور میں استادہ ذرا سی آگے کو جھکی ہوئی، لولیٔ فلک کے اُس رمخوردہ مجسّمے کی طرح معلوم ہو رہی ہے جو اپنی چوکی سے اترا ہی چاہتا ہو۔ اس کے مصفّا رخساروں پر جوان کو چھپے تاثرات سے زرد منظر آتے ہیں اس وقت ہلکے گلابی رنگ کی ایک لہر دوڑ رہی ہے اور اُس کی عنبر کی سی سفید کنپٹی پر نیلگوں رگوں کا موہوم سا سراغ مل رہا ہے۔ قدیم مجسّموں کی طرح اس کی نیچی کشادہ اور روشن پیشانی ایک ادائے حسن کے ساتھ اُس کی چھوٹی سی خوبصورت ستواں ناک سے ملی ہوئی ہے اور اس کے نازک اور گلگوں نتھنے شیرنی کے نتھنوں کی طرح پھڑک رہے ہیں۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے تنگ ہیں اور ابروؤں کا بظاہر خطِ راست ایک خفیف سا خم دکھا رہا ہے۔ اس کے تنگ اور گول دہن کے بالائی لب کی خمیدگی سے ایک نفیس قوس پیدا ہو رہی ہے اور نیچے کا لال، رسیلا ہونٹ زندگی اور اس کی مسرّتوں کی ایک ایسی آتشیں لذت شناسی کی جھلک دکھا رہا ہے جو الفاظ کی شرمندۂ احسان نہیں ہو سکتی۔ اُس کے بال سمندر کی دیبیوں کی طرح نرسل کی شاخوں اور کنول کے پھولوں سے گندھے ہوئے ہیں اور سفید پیراہن اُس کی نازک کمر کے طلائی پٹکے سے گزرتا ہوا برف کے سفید گالوں کی طرح نیچے گر کر اس کے قدم لے رہا ہے۔

وہ اپنے پاؤں کی ایک گلابی ایڑی سے پانی کو جانچنے کے لئے چھو رہی ہے۔

اب مقابلے کے لئے گوتیئے کے پیش کردہ خالص انگریزی حسن کا ایک نمونہ (میوزیڈورا) بھی ملاحظہ کیجئے۔ اس تصویر کا عقبی منظر ایک عظیم الشان

ایوانِ ضیافت ہے۔ اس کی سیاہ بلوطی دیواریں جن پر چوبی مورتیں کھُدی ہیں ٹشین کی رنگارنگ تصاویر سے جھکا جھک ہو رہی ہیں۔ ایک طرف بڑی بڑی نقرئی مچھلیاں پشت پر برتنوں کی ایک جھمجھماتی ہوئی وسیع کشتی اٹھائے ہوئے ہیں اور دوسری طرف میز پر بلوریں ظروف ـــ قرابے، طشت، ساغر، جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ یہاں میوزیڈورا کسل آمیز اور خواب آگیں محبوبیت کے ہالے میں گھری ہوئی بیٹھی ہے اور ایک کمسن حبشی غلام اُس کی نشست کے پیچھے کھڑا ہے۔

میوزیڈورا اٹھارہ سال کی نوخیز حسینہ ہے۔ اُس کی اُبھری آنکھیں سمندر کے پانیوں کی یاد دلاتی ہیں کسی شاعر کا تخیّل کبھی آسمانی حُسن کا اتنا صحیح تصوّر پیش نہیں کر سکا۔ اُس کا ملکوتی بدن جس پر پکے ہوئے پھل کی طرح اپنی ہی گدراہٹ کا روپ چھا رہا ہے نورِ باطن سے بھی منوّر نظر آتا ہے۔ اُس کے خوبصورت ریشمیں بال جو اس قدر باریک ہیں کہ ہوا کے خفیف سے جھونکے میں بھی لہرانے لگتے ہیں، سنہرے مرغولوں کا ایک جھرنا بن کر موتیوں کے تاج سے نیچے گرتے ہوئے اُس کے شانوں کی بلائیں لے رہے ہیں۔ ہلکا سبز لباس اُس کی گردن اور بانہوں کی سفیدی کو اجاگر کر رہا ہے اور اُس کی مرمر فام کلائی میں زبرجد کا ایک ننھا سا سانپ جس کی دونوں آنکھوں میں لعل دمک رہے ہیں چوڑی کی طرح لپٹا ہے۔ اس کے تنگ دہن پر معصومیت اور دلگیری کی باہم آمیزی نے نیکی کے ایک ایسے مرمریں مجسمے کی طرح ملال کی جھلک پیدا کر دی ہے جو سیاہ کار دنیا سے دوچار ہو رہا ہو۔

لیکن زیادہ باریک نظر اُس کے چہرے میں اِس قدسیت سے فروتر ایک چیز بھی دیکھ سکتی ہے۔ ان مضمحل آنکھوں میں جن کی پتلیوں میں زرد ڈورے جھلک رہے ہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو انہیں کسی ڈلیلہ کی شیریں اور جفاکیش آنکھوں سے مشابہ بنا رہی ہے۔ اس کے گلاب کی پتی کے سے نازک اور نفیس کنجِ لب پر رہ رہ کر بیچارہ جوئی یا تندخوئی کی تلملاہٹ سے ایک اینٹھن سی پیدا ہوتی ہے جس میں ایک اڑتی ہوئی ناگن کے دنبالے کی تڑپ پیچ و تاب کھا رہی ہے اس کی نگاہ بے مقصد اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہے اور اس کے سرخ لب کھلے ہیں۔

وہ سامنے پڑے ہوئے ساغر سے بے پروا، جنت سے نکلے ہوئے کسی فرشتے کی طرح دنیا سے بیزار بیٹھی ہے۔

یہ اُس ہزار پہلو نگار خانے کی صرف دو تصاویر کے نمونے ہیں جسے اِس حیرت کار فرانسیسی فنّان کے خوابِ حسن کی دلآویز آفرینش نے فردوسِ خیال بنا رکھا ہے۔

حامد علی خاں

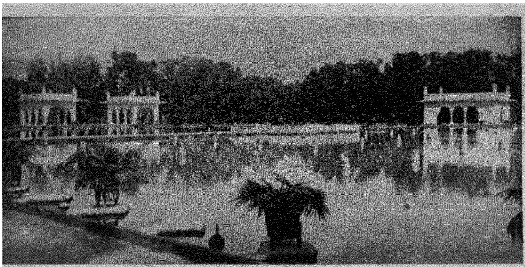

شالامار باغ لاہور

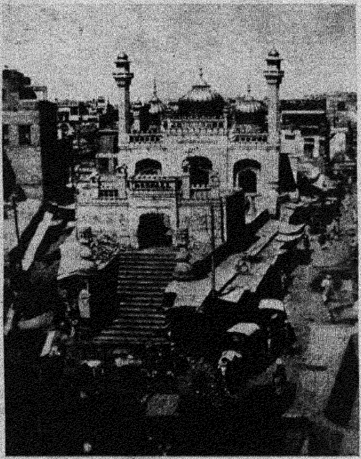

سنہری مسجد (ڈبی بازار لاہور)

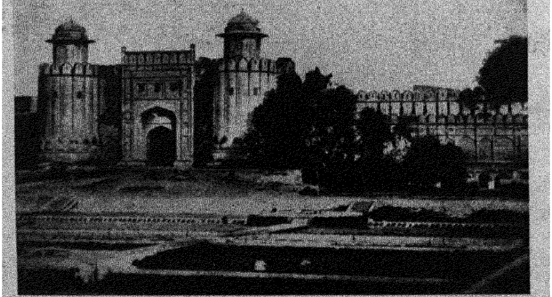

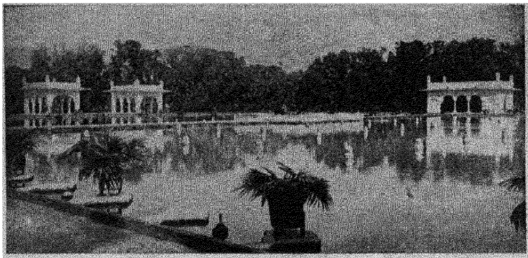

شالامار باغ لاہور

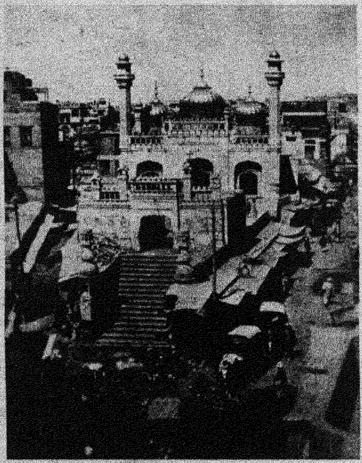

سنہری مسجد (ڈبی بازار لاہور)

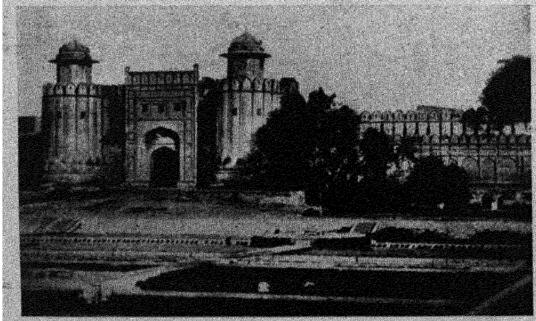

قلعۂ لاہور

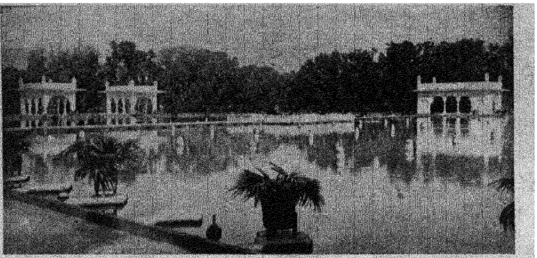

شالامار باغ لاہور

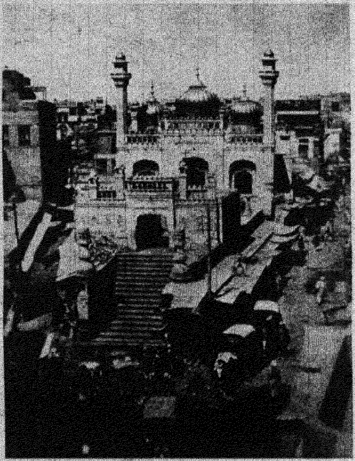

سنہری مسجد (ڈبی بازار لاہور)

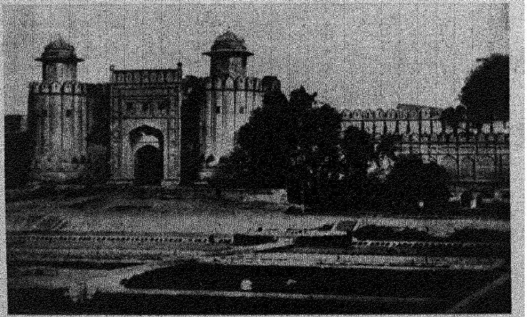

قلعۂ لاہور

# سُودَھا

کانتی جوان تھا، تاہم اس نے اپنی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کرنے کا ارادہ نہ کیا اور اپنی زندگی کے باقی ایام سیر و شکار میں گزارنے پر تیار ہو گیا۔ اس کا قد طویل اور سڈول تھا اس کی نظر بہت تیز تھی اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ دہقانی لباس پہنتا تھا اور اس کے حلقۂ احباب میں پہلوان ہیرا سنگھ، چکن لال، خان صاحب گویّے، میاں صاحب اور کئی اور لوگ شامل تھے۔ اس کے لئے بیکار آدمیوں کا کال نہ تھا۔

ایک بار کانتی، نئی دکھی کے کنارے اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔ وہ سب لوگ کشتیوں میں گئے تھے، ان کے ملازموں کی ایک کثیر جماعت ساتھ تھی جس کی وجہ سے گھاٹ پر ہجوم سا ہو گیا تھا اور اب دیہاتی عورتوں کے لئے وہاں نہانا یا پانی بھرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ تمام دن بندوقوں کی آواز سے زمین اور سطحِ آب لرزہ براندام رہتی، اور رات کو گانے بجانے کے شور کی وجہ سے نیند حرام ہو جاتی۔

ایک صبح کانتی کشتی میں بیٹھا ہوا اپنی بندوق صاف کر رہا تھا کہ یکایک وہ ایک آواز پر چونک پڑا۔ یہ کسی جنگلی بطخ کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ سر اُٹھاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ ایک دیہاتی لڑکی دو بطخ کے بچوں کو چھاتی سے چمٹائے ہوئے پانی کے کنارے کی طرف آ رہی ہے۔ ندی کا پانی بالکل ٹھہرا ہوا تھا اور آبی گھاس کی وجہ سے ندی کی روانی بند ہو گئی تھی، لڑکی نے بچوں کو پانی میں ڈال دیا۔ شکاریوں کی موجودگی کی وجہ سے، وہ ان کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئی تھی۔

لڑکی کے حسن میں بلا کی جاذبیت اور معصومیت تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ قدرت نے اس کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے، اس کی عمر کا اندازہ لگانا ذرا دشوار تھا۔ اس کا قد و قامت تقریباً ایک جوان عورت کے برابر تھا لیکن اس کے چہرے پر معصومیت اور طفلانہ پن اس درجہ تھا کہ دنیا کے انقلابات کا اس پر ذرا بھی اثر نہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس امر سے محض ناواقف تھی کہ اب وہ گہوارۂ طفلی سے نکل کر، دنیائے شباب میں قدم رکھ چکی ہے۔

کانتی تھوڑی دیر کے لئے بندوق صاف کرنا بھول گیا۔ وہ مسحور ہو گیا۔ اس کو بالکل توقع نہ تھی کہ ایسے مقام پر وہ ایک ایسا حسین پیکر دیکھ سکے گا۔ تاہم اس کا حُسن کسی شاہی قصر میں ہونے کے بجائے یہاں زیادہ دلکش نظر آ رہا تھا۔ ایک کلی کسی سنہرے گلدان میں ہونے کی بجائے کسی شاخ میں لگی ہوئی زیادہ موہنی اور دلربا معلوم ہوتی ہے۔

جب اس نے اس دوشیزۂ صحرا کو گھور کر دیکھا تو وہ ڈر گئی۔ اور جلدی سے بطخوں کو لے کر ایک خوف زدہ چیخ مارتی ہوئی وہاں سے بھاگی اور ایک ہی لمحہ میں دریا کے کنارے سے بھاگ کر، بانس کے درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو گئی۔ سر اُٹھاتے ہوئے کانتی نے دیکھا کہ اس کا ایک دوست بطخوں کی طرف، ایک خالی بندوق سے نشانہ باندھ رہا ہے۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ اس سے بندوق چھین لی، اور اس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ متعجب ظریف اپنا مذاق بھول گیا۔ کانتی پھر بندوق صاف کرنے لگا۔

لیکن شوقِ جستجو، کانتی پر غالب آیا! اور وہ اُٹھ کر بانس کے جھنڈ کی طرف چلا جہاں وہ دوشیزۂ صحرا غائب ہو چکی تھی، جھاڑیوں میں سے گزر کر ایک مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ سامنے ایک مخروطی چھپر پڑا ہوا تھا اس سے متصل گائے کا تھان تھا جس کے سرے پر ایک جھاڑی تھی۔ اس جھاڑی کے

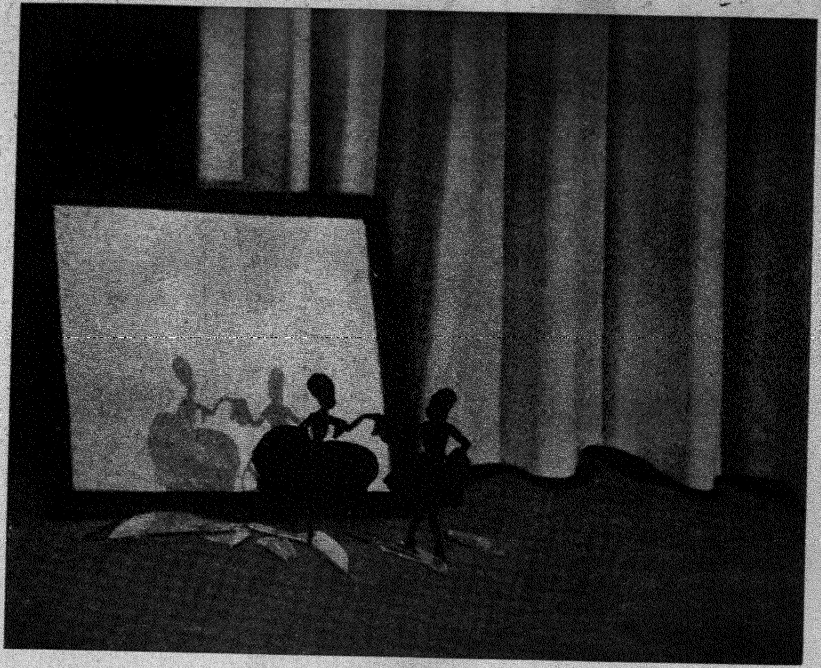

تصویر کا فرار

نیچے وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کو اُس نے صبح کے وقت دیکھا تھا وہ اس وقت ایک زخمی بطخ کو لئے ہوئے رو رہی تھی اور اُس کی زرد چونچ میں اپنی ساڑی کے بھیگے ہوئے پلّو سے پانی کے قطرے پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک بھوری بلّی جس کی اگلی ٹانگیں اس کے گھٹنے پر رکھی ہوئی تھیں بہت مضطربانہ انداز سے پرندے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کانتی کے دل و دماغ پر گھریلو زندگی کے اس ماحول نے بہت گہرا اثر کیا۔ پتوں میں سے گزر کر آنے والی روشنی کی شعاعیں لڑکی کی گود میں کھیل رہی تھیں۔ قریب ہی ایک گائے جگالی کر رہی تھی۔ اور سر اور دُم سے مکھیوں کو اُڑا رہی تھی، بانس کے جھنڈ میں شمالی ہوائیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ اور وہ لڑکی جو صبح کو دریا کے کنارے جنگل کی شہزادی معلوم ہو رہی تھی اس وقت دوپہر کو گھر کی ایک ذمہ دار خاتون کی قابل رحم حالت میں نظر آ رہی تھی۔

کانتی کا بندوق کندھے پر رکھ کر اس کی تلاش میں آنا اپنے اندر خجلت کا احساس رکھتا تھا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا کہ جیسے ایک بزدل چور کی طرح گرفتار کر لیا گیا ہو۔ وہ اس امر کی توجیہہ کرنے کی خواہش کرنے لگا کہ جس شخص نے اس کے بطخ کے بچّے کو زخمی کیا تھا وہ اور کوئی ہے ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ اس کے کانوں سے یہ آواز ٹکرائی "سودھا!" لڑکی کھڑی ہو گئی... "سودھا!" پھر گھر میں سے آواز آئی۔ اس نے اپنی بطخ کے بچوں کو اٹھایا اور اندر دوڑ گئی۔ "سودھا" کانتی نے سوچا، کس قدر موزوں اور پیارا نام ہے۔

کانتی کشتی میں واپس آ گیا۔ بندوق اپنے ملازم کو دے دی اور گھر کے سامنے کے دروازے کی طرف گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک ادھیڑ عمر کے برہمن کو دیکھا جس کی داڑھی اور مونچھیں منڈی تھیں اور جس کے چہرے سے اطمینان کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ سامنے ایک پتھر کے چبوترے پر بیٹھا ہوا کوئی مقدس کتاب پڑھ رہا تھا۔ کانتی نے اس کے چہرے میں اُسی رحمدلی کی کیفیت پائی جو لڑکی کے چہرے میں بھی موجود تھی۔

کانتی نے اس کو سلام کرتے ہوئے کہا "مہاراج کیا مجھے پانی مل سکتا ہے؟ میں پیاسا ہوں!"

بوڑھے آدمی نے انتہائی الطاف و اخلاق سے اس کا استقبال کیا اس کو چبوترے پر بیٹھنے کے لئے کہہ کر اندر گیا اور کچھ کھانے کے لئے اور پانی لے کر آیا۔ کانتی کے کھانے اور پینے کے بعد برہمن نے اس سے استدعا کی کہ وہ اپنا تعارف کرائے۔ کانتی نے اپنا اور اپنے والد کا نام اور اپنے گھر کا پتا بتایا اور پھر رسمًا کہا "جناب کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟ اگر میں اس قابل سمجھا جاؤں تو خود کو بہت خوش نصیب تصور کروں گا"۔

بوڑھے نے کہا "مجھے کسی خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک فکر دامنگیر ہے"۔

"مہاراج وہ کیا ہے؟"

"وہ میری لڑکی سودھا ہے جو اب سیانی ہو رہی ہے۔" (کانتی مسکرا دیا جب اُس نے اس کے طفلانہ چہرے کا تصور کیا) "اور جس کے لئے میں اب تک کوئی موزوں بر نہیں تلاش کر سکا۔ اگر میں اس کی شادی کو بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچا سکوں تو اس دنیا میں اپنے تمام فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں گا لیکن یہاں کوئی موزوں بر نہیں ہے اور میں اس مقام کو چھوڑ کر کہیں اور تلاش کرنے نہیں جا سکتا۔"

"اگر آپ میرے ساتھ میری کشتی میں چلیں۔ مہاراج۔ تو پھر ہم آپ کی لڑکی کی شادی کے متعلق گفتگو کریں۔" یہ کہہ کر اس نے سلام کیا اور چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے آدمیوں کو بھیج کر گاؤں میں دریافت کرایا تو اس کو برہمن کی لڑکی کی تعریف اور حُسن کے سوا اور کوئی جواب نہ ملا۔

جب دوسرے دن بوڑھا برہمن کانتی سے ملنے کشتی میں گیا تو کانتی نے جھک کر سلام کیا اور اس لڑکی سے خود شادی کرنے کی درخواست کی۔ برہمن اس خوش قسمتی سے ـــ کیونکہ کانتی نہ صرف ایک اعلیٰ خاندان کا رکن تھا۔ بلکہ جائداد اور دولت کا بھی مالک تھا ـــ اس قدر خوش ہوا کہ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی

نہ نکل سکا۔ اس نے سوچا کہ شاید کوئی غلطی ہوگئی ہے چنانچہ اُس نے مکرر سوال کیا: "کیا آپ میری لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

کانتی نے جواب دیا "ہاں اگر آپ مجھ سے اس کا بیاہ کرنا پسند کریں۔"

اُس نے مکرر سوال کیا: "آپ کا مطلب سودھا سے ہے؟"

کانتی نے اثبات میں جواب دیا۔

"لیکن بہتر یہ ہے کہ پہلے آپ اس کو دیکھ لیں اور اس سے گفتگو بھی کر لیں۔"

"کانتی نے بہانہ کرتے ہوئے کہ جیسے نہیں دیکھا۔ کہا: "ابھی اس کی کیا ضرورت ہے۔ ہم "جلوے" کے وقت دیکھ لیں گے۔"

جذباتِ مسرت سے لبریز لہجہ میں بوڑھے برہمن نے کہا: "میری سودھا بیشک ایک نیک و سلیقہ شعار لڑکی ہے چونکہ اس کو آپ خود منتخب کر رہے ہیں اس لئے پرماتما سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ آپ کو شاد رکھے"

مزندار کی عالیشان عمارت شادی کے لئے مستعار لی گئی۔ کانتی کے کہنے کے مطابق شادی آئندہ ماگھ کے مہینے میں ہونے والی تھی۔ بوقتِ مقرر پر نوشہ ہاتھی پر بارات کے ساتھ آیا۔ باجا وغیرہ اور روشنی کے قمقمے بھی ساتھ تھے۔ نوشہ کے پہنچنے پر رسمیں شروع ہوگئیں۔

جب دولہا اور دولھن کو ایک جگہ بٹھا کر "جلوے" کی رسم ادا کرنے کے لئے سرخ چادر اڑھادی گئی تو کانتی نے اپنی عروسِ نو کا "جلوہ" دیکھا۔ اس کا شرمیلا جھکا ہوا چہرہ جس پر شادی کا تاج رکھا ہوا تھا اور صندل کے ٹیکے لگے ہوئے تھے دیکھ کر وہ پہچان نہ سکا کہ آیا یہ وہی دیہاتی لڑکی ہے جو اس کے تخیل میں بسی ہوئی تھی اور اس کے تصورات میں ہیجان و ہنگامہ برپا کر رہی تھی۔ وفورِ جذبات سے اس کی آنکھوں پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا۔

رسم "جلوہ" کے ختم ہونے کے بعد عورتیں حجلۂ عروسی میں جمع ہوئیں۔ گاؤں کی ایک بوڑھی عورت نے اس امر پر زور دیا کہ کانتی خود اپنی بیوی کے چہرے پر سے نقابِ عروسی ہٹائے۔ چنانچہ اُس نے نقاب اٹھائی! اور حیرت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ یہ وہ لڑکی نہ تھی۔

ایک اضطرابِ بے پایاں اس کے قلب میں نمودار ہوا اور اس کی لہریں اس کے دماغ سے جا کر ٹکرانے لگیں۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ لیمپ کی روشنی دھندلی ہوگئی ہے اور تاریکی اس کی دولہن کے چہرے کو بگاڑے دے رہی ہے۔

پہلے تو وہ دل ہی دل میں اپنے خسر پر برہم ہونے لگا کہ اس نے ایک لڑکی دکھا کر دوسری سے شادی کر دی لیکن جب اُس نے ٹھنڈے دل سے غور کیا تو اس کو خیال آیا کہ بوڑھے برہمن نے کوئی لڑکی نہ دکھائی تھی اور یہ میرا ہی قصور ہے۔ اس نے اب یہی مناسب سمجھا کہ اپنی اس بیوقوفی کو دنیا پر ظاہر نہ ہونے دے اور پھر اپنی جگہ پر ظاہرا اطمینان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

وہ یہاں کے شور و غل اور لوگوں کے اظہارِ مسرت کو برداشت نہ کر سکتا تھا، وہ خود سے بھی سخت ناراض تھا اور ہر شخص سے بیحد برہم۔ یکایک اس نے دلہن کو، جو اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، ایک دردناک ہلکی سی چیخ مارتے ہوئے سنا، ہوا یہ کہ ایک خرگوش کا بچہ کمرے میں دوڑتا ہوا اس کے پاؤں کو چھو کر گزر گیا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ لڑکی بھی دوڑتی ہوئی آئی جس کو اُس نے پہلے دیکھا تھا۔ اس نے خرگوش کے بچے کو پکڑ لیا اور اُسے پیار اور ترحم کے انداز سے تھپکانے لگی۔

"اونھ۔ پاگل لڑکی!" عورتوں نے ایک ساتھ اس کو دیکھ کر غصہ سے کہا اور اُس کو اشارہ کیا کہ کمرے سے چلی جائے لیکن اس نے اشاروں کی پروا نہ کی اور کر شادی شدہ جوڑے کے سامنے بیٹھ گئی اور ایک طفلانہ ادا سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ جب ایک خادمہ آئی اور اس کا بازو پکڑ کر لے جانے لگی تو کانتی بول اٹھا [illegible]

اُس نے لڑکی سے پوچھا۔ "تمہارا کیا نام ہے؟"

لڑکی نے اِدھر اُدھر حرکت کی اور کوئی جواب نہ دیا۔ کمرے کی عورتیں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ کانتی نے دوسرا سوال کیا۔ "کیا تمہارے بطخ کے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔؟"

لڑکی نے پہلے کی طرح بے معنی انداز سے اس کو گھور کر دیکھا۔

متعجب و متحیر کانتی نے پھر ہمت کی اور زخمی بطخ کے بچے کے متعلق نرمی سے دریافت کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کمرے کے بڑھتے ہوئے قہقہوں نے ایک پُرلطف مذاق پیدا کر دیا تھا۔

آخرکار کانتی اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمسائے کے تمام پرندوں اور جانوروں کی رفیقہ ایک گونگی اور بہری لڑکی ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ ایک موقع پر سودھا پکارنے پر کھڑی ہو گئی تھی۔

کانتی کے دل پر ایک اور چوٹ لگی۔ اس کی آنکھوں پر سے ایک سیاہ پردہ اُٹھ گیا۔ انتہائی اطمینان کی سانس لیتے ہوئے جیسے وہ ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ گیا ہو اس نے اپنی دلہن کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اب یقیناً یہ سچا "جلوہ" تھا۔ اس کے دل کی روشنی اور چراغوں کی شعاعیں دلہن کے حیا آمیز اور معصوم اور خوبصورت چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ کانتی نے اُس کے حُسن کی حقیقی تجلّیوں میں دیکھا کہ بوڑھے برہمن کی پُرخلوص دعائیں ضرور قبول ہونگی۔

(ٹیگور کا آزاد ترجمہ)

محشر عابدی بی۔ اے

# شراب اور شیطان

علی الصباح ایک غریب کسان رومال میں کھانے کے لئے کچھ باندھے کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ کھیت میں پہنچ کر اُس نے روٹی چادر میں لپیٹ کر ایک جھاڑی تلے رکھ دی اور ہل چلانے میں مشغول ہو گیا۔ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اُس کو بھوک محسوس ہوئی تو بیلوں کو ہل سے جُدا کر کے وہ جھاڑی کی طرف چل پڑا۔

اُس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے چادر اُٹھا کر دیکھا کہ روٹی غائب ہے۔ مزید اطمینان کے لئے اُس نے چادر کو دوبارہ جھاڑ کر دیکھا۔ مگر روٹی غائب تھی۔ کسان کی عقل اس معمے کو حل کرنے سے قاصر تھی۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے اس گرد و نواح میں کسی شخص کو نہیں دیکھا لیکن روٹی چرائی ضرور گئی ہے"

یہ سب حرکت ایک خُرد سال شیطان کی تھی جو اُس وقت جھاڑی کے پیچھے بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ کسان روٹی کو اس طرح کھو کر مغلظات سنائے اور شیطان کو بُرا بھلا کہے۔

کسان اپنے کھانے کی گمشدگی پر افسردہ ضرور تھا مگر اُس نے تحمل کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کسان نے اپنے دل میں کہا۔ "مجبوری ہے کسی کو بُرا بھلا کیوں کہوں۔ بھوک سے مر تو نہ جاؤنگا۔ شاید جو شخص یہ روٹی لے گیا ہے مجھ سے زیادہ بھوکا ہو۔ خدا اس کا بھلا کرے۔"

کسان کو گناہ کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر خرد سال شیطان بہت سٹپٹایا اور اس واقعہ کو اپنے سال خوردہ سردار کے گوش گزار

کرنے گیا۔ بوڑھے شیطان کے پاس آکر اُس نے تمام واقعہ من وعن بیان کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ کسان نے روٹی کی گمشدگی پر بجائے اظہارِ خشم کے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا کہ خدا روٹی چرانے والے کا بھلا کرے۔

بوڑھا شیطان یہ سُنکر بہت رنجیدہ ہوا اور بولا "اگر تم کسان پر غالب نہیں آسکے تو اس کی تمام تر وجہ تمہاری کمزوری ہے۔ تم اپنے فرائض سے بالکل بے بہرہ ہو۔ اگر صورتِ حالات یہی رہی تو پھر ہماری خیر نہیں۔ جاؤ اس کمی کو جہاں تک ہو سکے پورا کرو۔ اگر تم تین سال کے عرصہ تک اس کسان کو گناہ کی طرف راغب نہ کر سکے تو یاد رکھو میں تمہیں متبرک پانی میں غرق کر دوں گا"

خُردسال شیطان یہ سنکر بہت خوفزدہ ہوا اور اپنے فرض کی انجام دہی کے لئے زمین پر اُتر آیا۔ کسان پر غالب آنے کے لئے بہت عرصے تک تدبیریں سوچتا رہا مگر کوئی قابلِ اطمینان نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد اُسے ایک تجویز سُوجھی۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُس نے ایک مزدور کا بہروپ بھر کر اُس کسان کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔

پہلے سال اُس نے کسان کو رائے دی کہ وہ دلدل میں بیج بوئے۔ کسان نے خردسال شیطان کے رائے پر عمل کرتے ہوئے دلدل میں بیج بو دیئے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اِس سال اس شدت کی گرمی پڑی کہ تمام کسانوں کی فصلیں جل کر راکھ ہو گئیں مگر گیلی زمین ہونے کے باعث اس کسان کی فصل خوب بار آور ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال کا خرچ نکال کر بھی کسان کے پاس بہت سا غلہ بچا۔

دوسرے سال خردسال شیطان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے کسان نے پہاڑی پر بیج بوئے۔ اس سال معمول سے بہت زیادہ مینہ برسا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اور کسانوں کی فصلیں تو بارش سے تباہ ہو گئیں مگر اس کسان کی فصل پر جو سطح زمین سے بہت اونچی اور ڈھلوان تھی بارش کا کوئی اثر نہ ہوا اور اُس نے پہلے سال سے بھی زیادہ غلہ پیدا کیا۔ اب کسان کے پاس اس قدر غلہ ہو گیا کہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کس طرح استعمال میں لائے۔

خردسال شیطان نے جو اسی موقع کی تلاش میں تھا کسان کو ایک طریقہ سمجھایا جس سے وہ باقی ماندہ غلے کو کام میں لا سکتا تھا — وہ طریقہ شراب کشید کرنے کا تھا۔

کسان نے خردسال شیطان کے حسب ہدایت اپنے باقی ماندہ اناج سے شراب کشید کی اور اپنے پینے کے علاوہ اپنے دوستوں کو بھی اُس کا طریقہ استعمال بتایا۔ اتنا کام کر کے خردسال شیطان اپنے سردار کے پاس دوڑا گیا اور یہ خبر کہہ سنائی کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ بوڑھا شیطان یہ سُن کر خوش تو بہت ہوا مگر وہ چاہتا تھا کہ اپنی آنکھوں سے اس بات کی تصدیق کرے۔ چنانچہ وہ دونوں کسان کے گھر آئے اور دیکھا کہ کسان نے اپنے دوستوں کو مدعو کر رکھا ہے جام پر جام چل رہا ہے، اور ساقی کے فرائض اُس کی بیوی انجام دے رہی ہے۔

ایک مہمان کو شراب کا پیالہ پکڑاتے وقت بدقسمتی سے وہ میز سے ٹکرا گئی جس پر پیالہ سے شراب اچھل پڑی۔ یہ دیکھ کر کسان آگ بھبوکا ہو گیا اور غضبناک لہجہ میں چلایا "او اندھی کھوپڑی! تم نے اس کو موری کا پانی سمجھ رکھا ہے کیا؟ جو اس طرح زمین پر گراتی پھرتی ہو — نابکار"

خردسال شیطان اپنی کامیابی پر خوش ہوا اور فاتحانہ انداز میں بولا "دیکھا استاد! یہ وہی شخص ہے جس نے آج سے کچھ عرصہ قبل اپنی روٹی کی گمشدگی پر اظہار افسردگی کرنے کے بجائے بھوکا رہنا قبول کیا تھا" کسان نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی بیوی سے صراحی لے لی اور شراب خود بانٹنی شروع کی۔ اسی اثنا میں ایک غریب مزدور دن بھر کی محنت سے چور اس خیال سے کہ شاید مجھے بھی ایک قطرہ نصیب ہو جائے اندر آ داخل ہوا۔ وہ بیچارا ناخواندہ

مہمان کی طرح ایک کونے میں بہت عرصے تک پانی بھرے منہ سے بیٹھا رہا مگر کسی شخص نے بھی اسے نہ پوچھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کسان نے بجائے کچھ دینے کے صرف اس قدر کہا "کوئی کارخانہ تھوڑا کھول رکھا ہے میں نے کہ ہر ایک کو شراب بانٹتا پھروں" یہ دیکھ کر بوڑھا شیطان بہت خوش ہوا مگر اس کے شاگرد نے کہا "ابھی آپ نے کیا دیکھا ہے۔ تھوڑا عرصہ اور ٹھہریئے اور دیکھئے کیا گل کھلا چاہتا ہے"۔

کسان اور اس کے مہمان خوب جی کھول کر پی رہے تھے ـــ اب سرور جو آیا تو لگے واہی تباہی بکنے۔

کسانوں کو اس طرح گفتگو کرتے دیکھ کر شیطان اور بھی خوش ہوا اور کہنے لگا "اگر شراب ایسے نتائج پیدا کر سکتی ہے تو وہ دن قریب ہے جب یہ سب لوگ ہمارے مطیع ہو جائیں گے"۔

خردسال شیطان نے فاتحانہ انداز میں کہا "ٹھہریئے استاد! ایک ایک پیالہ تو اور پی لینے دیجئے پھر دیکھئے کیا گل کھلتا ہے۔ اب تو یہ محض بیہودہ گوئی پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ایک اور پیالہ کے بعد یہ جنگلیوں کی طرح آپس میں لڑیں گے"۔

ایک اور دور کے بعد اُن کی یاوہ گوئی گالی گلوچ میں تبدیل ہو گئی اور گالی گلوچ لڑائی میں ـــ اب اُسی کمرے میں لڑائی جھگڑے کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی ـ میزبان نے بھی اس لڑائی میں حصہ لیا اور خوب پٹا۔

یہ دیکھ کر سردار نے اپنے شاگرد کو تھپکی دیتے ہوئے کہا "خوب ہے!!"

شاگرد نے پھر فخریہ لہجہ میں کہا "سب سے قابل دید حصہ ابھی باقی ہے ـــ تھوڑی سی اور پی لینے دیجئے انہیں اور پھر دیکھئے تماشا"

آخری دور کے اختتام پر اُن کی حالت وحشیوں سے بھی بدتر ہو گئی اور ان میں سے ہر ایک نشہ میں مست اپنی اپنی ہانکنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد مجلس برخاست ہوئی اور انھوں نے افتاں و خیزاں اپنے اپنے گھر کا رخ کیا۔ میزبان ان کو دروازے تک پہنچانے کے لیے اُٹھا کہ دہلیز پر منہ کے بل گر پڑا!! اور سؤر کی طرح وہیں لیٹا خر خر کرنے لگا۔

اس واقعہ کو دیکھ کر بوڑھا شیطان اور بھی خوش ہوا اور اپنے شاگرد سے کہنے لگا "خوش رہو میرے بچے! یہ شراب کی ایجاد خوب ہی۔ ہاں بتاؤ تو سہی اس میں کیا کیا ڈالا تم نے؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے یہ چیز وحشیوں اور درندوں کے خون سے تیار کی ہے۔ تبھی تو وہ پہلے وحشیوں کی طرح گفتگو کرتے تھے اور بعد ازاں لڑنے مرنے پر اتر آئے۔"

"نہیں استاد! اس میں درندوں وغیرہ کا خون نہیں۔ میرے لئے سب سے ضروری چیز یہ تھی کہ کسان کے پاس ضرورت سے زیادہ اناج ہو ـــ وحشیوں اور درندوں کا خون تو انسان میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ مگر جب اس کے پاس ضرورت سے زیادہ چیز ہو تو وہ خون اپنی اصلیت ظاہر کر دیتا ہے۔

"اب دیکھئے۔ پہلے کسان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی روٹی کی گمشدگی پر اظہارِ خشم نہ کیا۔ مگر جب اس کے پاس ضرورت سے زیادہ اناج ہوا تو اس نے چاہا کہ اس کے ذریعے سے عیش کرے ـــ چنانچہ عیش کا طریقہ میں نے بتایا۔

اور جب اُس نے اپنے عیش کی خاطر خدا کی بہترین نعمت کو بگاڑ کر شراب بنا لی تو درندوں اور وحشیوں کا خون جو اس میں پہلے سے موجود تھا اپنی اصلیت دکھانے لگا۔ اب یہ شراب پیتا رہا تو ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا۔"

بوڑھا شیطان یہ سن کر بہت شادماں ہوا اور اپنے شاگرد کی پہلی خطا کو معاف کر کے اُسے ایک اعلیٰ عہدہ پر ممتاز کر دیا۔

(ٹالسٹائے)

سعادت حسن

# رباعیات

وہ معرکہ ہے عمل مکافات ہے زیست
وہ مسئلہ ہے جس کا حل محالات ہے زیست
ممکن ہے نظر آئے یہاں ناممکن
وہ شے ہے یہ عین طلسمات ہے زیست

وہ شے ہے کہ موجود ہے معدوم ہے زیست
وہ شے ہے کہ مجہول ہے معلوم ہے زیست
خود راز ہے لیکن ہے کسی راز کا حل
دنیا ہے جو اظہار تو مفہوم ہے زیست

آیا نہ سمجھ میں کچھ کہ ہستی کیا ہے؟
کیسی ہے یہ آگہی یہ ہستی کیا ہے؟
کس طرح کا مجموعۂ اضداد ہے یہ؟
اثبات ہے یہ کیوں یہ خود یہ ہستی کیا ہے؟

مفقود ہے دنیا کا بھلائی، سب جھوٹ!
حق حق ہی یہاں؟ حق کی دہائی سب جھوٹ!
سچ بات کہو فلسفیو! بہرِ خدا!
معلوم ہوا رازِ خدائی؟ سب جھوٹ!

ب

# تیر و نشتر

ذوقِ نیرنگِ تماشا سے جو بیگانہ بنے
تیرا دل حُسنِ یگانہ کا جلوخانہ بنے

جذبِ کامل نظرِ پیرِ مغاں نے بخشا
آنکھ جس چیز پہ ڈالوں وہی پیمانہ بنے

آتشِ عشق سے دل ہو جو تجلّی گہِ دوست
طائرِ قدس بھی اس شمع کا پروانہ بنے

جوشِ وحشت نہ ہو ٹھنڈا ترے دیوانے کا
وسعتِ عرصۂ کونین جو ویرانہ بنے

اللہ اللہ کتاب ایک ہی۔ استاد بھی ایک
ہم سبق پھرتے دیوانہ و فرزانہ بنے

ظرف لاظرف۔ جو سنتا ہے مرا قصّۂ شوق
یہ وہ افسانہ ہے۔ جو سُن لے وہ دیوانہ بنے

رات دن کوثرِ رحمت کی ہو بارش اُس پہ
خاک جس رند کی خاکِ درِ مے خانہ بنے

غرقِ دریا ہوں آلہی۔ کہ ہوں پروردۂ موج
میرا مدفن بھی سرِ دامنِ صحرا نہ بنے

وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں کوئی اُن سے کہہ دے
سالہا سال اُسے ہو گئے افسانہ بنے

شورہ بختی کا ٹھکانا ہے کوئی اے نشترؔ
کہ میں جس شہر میں پہنچوں۔ وہی ویرانہ بنے

نشتر جالندھری

# ترکِ وفا کی قسمیں

توبہ ہے بس اب چاہ کا ارماں نہ کریں گے
دل لاکھ ابھارے ضررِ جاں نہ کریں گے
کہتے ہیں قسم کھا کے پریشانیٔ دل کی
سودا ترا اے زلفِ پریشاں نہ کریں گے
رکھ دیں گے گلا خنجرِ قاتل پہ خوشی سے
سینہ ہدفِ ناوکِ مژگاں نہ کریں گے
یوسف بھی ہو وہ بت تو خریدار نہ ہوں گے
دنیا کے لئے دین کا نقصاں نہ کریں گے
وہ حسن پہ مغرور تو ہم عشق پہ نازاں
القصّہ خوشامد کسی عنواں نہ کریں گے
اس کشمکشِ ضبط میں گو جان ہی جائے
عیسیٰ سے مگر خواہشِ درماں نہ کریں گے
بھولی نہ اگر وعدۂ امروز کی خفّت
فردا سے کبھی وصل کا ساماں نہ کریں گے
سر پھوڑیں گے پتھر سے مگر لوحِ جبیں کو
منّت کشِ سنگِ درِ جاناں نہ کریں گے
ہنس بول کے بہلائیں گے دل آج سے ہم بھی
اب شام و سحر گریۂ پنہاں نہ کریں گے
غیروں سے بھی ہے راہ تو ہم ربط سے گزرے
پھر ذکرِ وفا اے شہِ خوباں نہ کریں گے
اے وحشتِ دل موسمِ گل آئے کہ جائے
ہم اب کے برس چاکِ گریباں نہ کریں گے

## قطعہ

ہم نے تو یہ ٹھانی تھی کہ بس آج کے دن سے
بات اُس سے کبھی تا حدِ امکاں نہ کریں گے
لیکن وہی ملنے کو بڑھا آپ سے جس وقت
پھر کہہ نہ سکے یہ تو مری جاں نہ کریں گے
آزردگیٔ دل نہیں اے صدق گوارا
ہم اب سے کسی درد کا درماں نہ کریں گے

صدق جائسی

# غزل

کب تک مجھے یوں خوگرِ آزار کرو گے — کب تک مری اُلفت سے تم انکار کرو گے
کب تک رُخِ پُرنور سے محروم رکھو گے — کب تک نہ عطا لذتِ دیدار کرو گے
کب تک مجھے تم ہجر میں مغموم رکھو گے — کب تک نہ مئے وصل سے سرشار کرو گے
کب تک نہ اماں دو گے زمانے کی جفا سے — کب تک سپرِ طعنۂ اغیار کرو گے
اک روز اٹھاؤ گے حجابات کو آخر — اک روز وفا کا مری اقرار کرو گے
اک روز مجھے دو گے رہائی شبِ غم سے — سوئی ہوئی قسمت مری بیدار کرو گے
دامانِ نظر حُسن کے پھولوں سے بھرو گے — اُجڑے ہوئے گلشن کو چمن زار کرو گے

پامال جو اب بھی نہ کرو گے تو قسم ہے،
میرے لئے اس سر کو گرانبار کرو گے

ندیم

# غزل

نغمے کی تمنا ہے نہ الحاں سے غرض ہے
گر ہے تو نواہائے پریشاں سے غرض ہے
اے بے خودیٔ شوق مری خاک اڑا دے
اب جان سے مطلب نہیں جاناں سے غرض ہے
یہ کس نے سرِ بزم لیا نام تمہارا
اب مجھ کو گریباں سے نہ داماں سے غرض ہے
ناصح یہ ہے ایماں ترا وہ ہے مرا ایماں
تیری ہی طرح مجھ کو بھی ایماں سے غرض ہے
وہ سامنے بیٹھا ہے اب اے جذبِ تصور
نظارے کو کیا جنبشِ مژگاں سے غرض ہے
غربت میں نہ بیمار ترا جان سے گزرا
رحمت کو بھی کچھ شامِ غریباں سے غرض ہے

## قطعہ

ہر صبح تجھے دیکھ کے کہتا تھا کہ جب تک
نظارے کو اس کے رخِ تاباں سے غرض ہے
مرنے کی تمنا نہیں مجھ سوختہ جاں کو
جینے کی تمنائے فراواں سے غرض ہے
دیدار سے محروم ہوا اب تو شب و روز
خونِ جگر و دیدۂ حیراں سے غرض ہے
جینے سے وہ نفرت ہے کہ ہر دم ہے یہی فکر
جانے تنِ رنجور کو کیا جاں سے غرض ہے؟

وہ آپ سمجھ لیں گے یہ خط کس نے لکھا ہے
کچھ نام کی حاجت ہے نہ عنواں سے غرض ہے
اوراقِ پریشاں ہیں کیوں نذرِ صبا ہوں
کیا شوق کو شیرازۂ دیواں سے غرض ہے
حامد تمہیں تکمیلِ جنوں میں ہے اگر شک
لو جان کی بازی ہے تو کیا جاں سے غرض ہے

**حامد علی خاں**

# محفلِ ادب

## انکشاف

(سانیٹ)

شبِ تاریک کی خاموشیوں میں کون آتا ہے؟
مرے "خوابِ محبت" کی جواں تعبیر ہے شاید!
بہار و شعر کی اک گلفشاں تصویر ہے شاید!
یہ کیوں دل کو مرے ذوقِ پرستش گدگداتا ہے؟
مجھے یہ کون گہرے خواب سے آکر جگاتا ہے؟
سراپا ایک موجِ نکہت و تنویر ہے شاید!
وُہی ہے، یعنی میری حُورِ میری ہیر ہے شاید!
یہ کس کا جلوۂ جاں بخش ہے جو مسکراتا ہے؟

فروغِ حسن کی مے سے نگہ مدہوش ہے میری
نشاطِ بیکراں سے روح ہم آغوش ہے میری
جہانِ قدس کے جلوے اتر آئے ہیں دنیا میں!
محبت کے اُفق پر ہو رہی ہے روشنی پیدا
مرے جذبات میں ہونے کو ہے بالیدگی پیدا
جوانی آ رہی ہے میری افسردہ تمنا میں!

راشد وحیدی "لالۂ صحرا"

## شہر حیدرآباد کا آغاز

ڈاکٹر سید محی الدین قادری ایم اے (عثمانیہ) پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)

شہر حیدرآباد کی آبادی ابتدا میں ایک چھوٹے سے قریہ پر مشتمل تھی جس کا نام چچلم تھا۔ یہی وہ خوش قسمت موضع تھا جہاں تاریخِ دکن کی وہ مشہور و معروف اور چہیتی ہستی اقامت گزیں تھی جس کے عشق و محبت کے سلسلے میں اس کے چاہنے والے نے اس عظیم الشان شہر کو آباد کیا تھا۔

دنیا میں شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی بنیاد ایسی گہری رومانیت سے معمور ہو اور جس کی آغازی فضا اتنی زیادہ افسانوی ہو!

ایک جلیل القدر سلطان زادہ اور ایسی پرعظمت سلطنت کا ولی عہد جو اپنی بے انتہا دولت اور بے نظیر ہیروں کی وجہ سے نہ صرف تمام ہندوستان بلکہ اقصائے عالم میں مشہور ہو، ایک ایسی خوش قسمت مطربہ پر فریفتہ ہوجاتا ہے جس کے نام سے خوش بختی ٹپکتی ہے، اور جس کی خیر و عافیت معلوم کرنے کی فکر میں یہ من چلا عاشق بے چین ہوکر "رود موسیٰ" کی قیامت خیز طغیانی میں اپنا گھوڑا ڈال دیتا ہے!

اس خطرناک جرأت، اس والہانہ انہماک اور اس اٹل چاہت پر بادشاہ (ابراہیم قطب شاہ) کو تشویش ہوتی ہے وہ اس سے پہلے اپنی اور اپنے مشیروں کی ساری تدبیریں ختم کر چکا تھا کہ کسی طرح یہ ترکمان شہزادہ ایک تلنگن کے عشق سے باز آئے۔ مگر تمام کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ اس کا دل بہلانے، اس کو مائل کرنے اور اس کی چہیتی "بھاگ متی" کا خیال دور کرنے کے لئے نہ صرف تلنگانہ بلکہ کرناٹک اور گجرات سے بھی حسین سے حسین لڑکیاں اس محل میں جمع ہوگئیں اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ نوجوان شاہزادے کے سامنے اپنے حسن و ادا، ناز و انداز، بناؤ سنگھار، اور شوخی و ظرافت کی ساری قوتیں استعمال کر دیں، اور اس طرح بھاگ متی کے تصور کو اس کے دل سے دور کریں۔ ان خوبرویوں کی تعریف خود شہزادہ کے سوانح نگار کی زبان سے سنیئے۔ ممکن ہے اہل ذوق آج سے ساڑھے تین سو برس پہلے کے حیدر آباد کی رومانوی فضا میں پہنچ جائیں ؎

جو سہیلیاں وہ جھمکائیں مکھ نور کو ؛ دوانہ کریں چاند ہو، سور کو
(اگر وہ لڑکیاں اپنے چہرے کے نور کو چمکائیں۔ چاند اور سورج دیوانے ہو جائیں)

اگر دیکھتا جوت ان نور کا ؛ فرشتہ نہ کرتا صفت حور کا،
(اگر فرشتہ ان کے نور کی چمک دیکھ پائے تو حور کی تعریف نہ کرے)

جو آویں چمن میں سکیاں ساج سوں ؛ پھولاں غنچے ہو جائیں پھر لاج سوں
(اگر وہ لڑکیاں چمن میں بناؤ سنگار کر کے نکلیں تو پھول شرم کے مارے غنچے بن جائیں)

مجالس عجب شاہ عالی کئے ؛ کہ حوراں کو لا بہشت خالی کئے
(شاہ عالی نے عجیب مجلس سجائی کہ حوروں کو بلوایا جس کی وجہ سے بہشت خالی ہوگئی)

ان حوروں میں سے جو کوئی "ولی عہد" کے دل سے "بھاگ متی" کا خیال دور کرتی اس کے متعلق اس کے باپ براہیم قطب شاہ کا حکم تھا کہ:-

قطب شاہ کو جے کوئی ریجھائے گی ؛ بڑا مرتبہ سب میں وہ پائے گی،
(جو شیدا کرے گی)

بڑی نار وہ ہی جو بھلائے اسے ؛ کیسے بخت ہیں جو رجھائے اسے
(وہ) (کون ایسی خوش قسمت ہے جو اس کو اپنا شیدا کرے)

ان تمام خوبرویوں نے "بھاگ متی" سے بھاگ چھیننے کی بڑی بڑی کوششیں کیں جن کی تفصیل متذکرہ بالا اشعار کے سلسلہ میں ملک الشعرا نے نہایت دلچسپ طریقہ پر بیان کی ہے وہ کہتا ہے:-

کدہیں (کبھی) کوئی کھڑی رہتی آ سامنے ؛ کدہیں شہ اپر کرتی کوئی آ سنے
کدہیں سبد پکڑتی تھی کوئی نارسول ؛ کدہیں دور کوئی جھاڑتی سارسول
کدہیں کوئی کھلاتی اٹھی پان آ ؛ کدہیں کوئی پکڑتی تھی پیکدان آ
کدہیں گرد دینے کوئی آتی (رکھی) اٹھی ؛ کدہیں بندسوں کوئی جیولاتی اٹھی
کدہیں کوئی پیالہ پلانے کوں آئے ؛ کدہیں کوئی نقل (عشق) لیا کہ شہ کوں چکھائے
کدہیں پھول ستی تھی کوئی بہنے ؛ کدہیں کوئی لباتی (لالچ) اٹھی گھر منے
رڈالتی تھی) (جسم)

کدہیں کوئی دکھاتی سینہ کھول کر ؛ کدہیں کوئی رجھاتی بچن بول کر
(باتوں میں فریفتہ کرنی)

کدہیں کوئی دیوانی ہو پھرتی اتھی ؛ کدہیں کوئی بے سدھ ہو گرتی اتھی
(بے ہوش) (گرتی)

مگر شہزادہ پر اس تمام جادو کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور جب آخر کار فکر مند بادشاہ نے اپنے ولی عہد سے آکر دریافت کیا کہ ان لڑکیوں میں تمہیں کون سی پسند ہے تو شہزادہ ان سب کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے:-

# تصاویر

**سرورق** وال کرزنر کی مشہور تصویر "علم اور زمانہ" سے مزین ہے۔ بوڑھا آدمی جس کے سر پر تلوار بندھی ہے زمانہ ہے تلوار وقت کو کاٹ رہی ہے علم نوجوان عورت ہے جو زمانے کے انقضا کے ساتھ ساتھ معلومات کے پھولوں سے اپنا دامن بھر رہی ہے۔ زمانہ ان پھولوں کو دنیا پر برسا رہا ہے۔

**خزاں کے پیچھے بہار** (دائرنگ) یہ مغربی مصور زنسٹ رگ کی ایک خوبصورت تصویر ہے۔ ایک بڈھے آدمی (سردی) کو منزر لڑکیاں اور لڑکے (بہار) ہنسی کے ساتھ بھیڑ بکریاں اور پھول وغیرہ لیے رخصت کر رہے ہیں۔ مغربی ادب میں کبر سنی کو سرما سے اور جوانی کو بہار یا گرمی کے موسم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ بڈھے کے جانے کے ساتھ ہی جاڑے، برف، دھند اور کہر وغیرہ کا خاتمہ ہو رہا ہے اور زمین اپنے نباتی حسن کے خزانے اگل رہی ہے۔

**تھیوڈور ڈرائزر**
**برٹرینڈ رسل**
**آئن شٹائن**
یہ تین شہرۂ آفاق مغربی حکما کی تصویریں ہیں۔ ان کے متعلق اس پرچے میں ایڈیٹر کا مضمون "زندہ فلسفے" ملاحظہ فرمائیے۔

**تالاب کا خواب حسن** ایک جاپانی مصور کونوتے نے تالاب پر تیرتے ہوئے کنول کے پتوں سے ایک خوبصورت تصور پیدا کیا ہے۔ حسن آفرینی سے جاپانیوں کو جو فطری تعلق ہے یہ تصویر اس کا بیّن ثبوت ہے۔ پتوں پر شبنم کے قطروں نے ایک سیمیں جال بُن رکھا ہے۔

**ہمنوائی** جرمن مصور کارڈ کامول کی تصویر ہے۔ دو نوجوان جرمن لڑکیاں ایک گائکی کی کتاب ہاتھ میں لئے گا رہی ہیں۔ یہ تصویر خوبصورت ترین تصاویر میں شمار کی گئی ہے۔

**اجنبی**۔ اس کا مصور برٹرم پیگرم ہے۔ اصل تصویر پانچ فٹ چھ انچ بلند ہے۔ اجنبی (کیوپڈ) لڑکی کی زندگی میں در آیا ہے اور اس کا شانہ پکڑ کر بلا رہا ہے۔ کیوپڈ کا بشرہ قابل ملاحظہ ہے۔

**مس ایمی جانسن**۔ یہ پہلی ہوا باز خاتون ہے جس نے مئی سنہ ۱۹۳۰ء میں انگلستان سے آسٹریلیا تک (۹۹۶۰ میل) پرواز کی۔ یہ پرواز مسلسل نہ تھی اور اس میں انیس دن صرف ہوئے۔ نومبر سنہ ۱۹۳۲ء میں اس نے دوبارہ انگلستان سے راس امید تک (۶۲۰۰ میل) پرواز کی۔ اس میں چار دن چھ گھنٹے اور چھپن منٹ صرف ہوئے۔ پرواز بھی مسلسل نہ تھی۔ مس جانسن کی شادی مشہور ہوا باز مسٹر جے اے مالیسن سے ہوئی اور جولائی سنہ ۱۹۳۳ء میں ان دونوں نے مل کر کارمرتھن شائر سے برج پورٹ تک (۳۳۰۰ میل) ماورائے اٹلانٹک کی پرواز کی جس میں ۳۹ گھنٹے صرف ہوئے۔

**پرواز**۔ اڑتے ہوئے طیارے کی تصویر ہے۔ مس جانسن کی تصویر کے ساتھ اس کی مناسبت ظاہر ہے۔ زمین و آسمان کا طوفانی منظر اُن مشکلات پر روشنی ڈالتا ہے جو ہوا بازوں کو عموماً پیش آتی ہیں۔

**نپولین میدان جنگ میں** سنہ ۱۸۰۵ء میں اول نپولین نے اپنا شہنشاہی اقتدار قائم کیا لیکن فرانسیسی شہنشاہ نے یکے بعد دیگرے سنہ ۱۸۰۵ء میں آسٹریا سنہ ۱۸۰۶ء میں پرشیا اور سنہ ۱۸۰۷ء میں روس کو فاش شکستیں دے کر یورپ بھر میں اپنا سکہ بٹھا لیا۔ ان معرکوں کے سلسلے میں اس کی سب سے پہلی فتح الم کے مقام پر تھی جہاں ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۰۵ء کو آسٹریا کی فوج نے نپولین کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دئیے۔ موجودہ تصویر اسی منظر کی یاد دلاتی ہے۔ سورج جو کئی روز سے بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس شاندار فتح کے وقت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نکل آیا ہے اور اس کی کرنیں فاتح فرانسیسیوں پر پڑ رہی ہیں اور آسٹریا کی فوج پر اندھیرا چھا رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر تھکی ہوئی فرانسیسی فوج یک لخت مسرور و تازہ دم ہو جاتی ہے۔ فرانسیسی سپاہی جنہیں نپولین بسرعت فرانس کے میدانوں سے دور دراز دریائے ڈینوب کے قریب لا ڈالا تھا آپس میں کہتے ہیں کہ "ہمارے شہنشاہ نے لڑائی لڑنے کا ایک نیا طریقہ نکالا ہے۔ وہ اب ہمارے ہاتھوں کے ذریعے نہیں بلکہ ہماری ٹانگوں کے ذریعے سے جنگ کرتا ہے۔"

**شکاری**۔ ڈالمین کی یہ تصویر اس کے مصورانہ کمال کی مظہر اتم ہے۔ تصویر کے عقب میں غار سختی اور درشتی سے مترشح ہے اور شکاری کی وضع قطع اور اس کے جسم کے رگ و ریشے سے اس کے پیشہ کی بربریت نمایاں ہو رہی ہے۔ تصویر کی وحشیانہ فضا کی تکمیل ریچھ کے ظہور سے کی گئی ہے۔ جو خود شکاری کو اپنا شکار بنانا چاہتا ہے۔

**شالامار باغ لاہور کا ایک منظر**
**سنہری مسجد اور ڈبی بازار لاہور**
**قلعہ لاہور**
لاہور کے یہ تین مختلف مناظر حضرت روش صدیقی کی نظم "لاہور" کو مصور کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں حضرت روش کچھ عرصہ لاہور میں قیام پذیر رہے۔ اس نظم میں انہوں نے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے جو پنجاب کے دارالسلطنت نے اُن کے دل پر پیدا کئے۔

**تصویر کا فرار**۔ یہ تصویر ایک مغربی مصور ایف آئے ریگر کے انوکھے تصور کا نتیجہ ہے۔ تصویر کو سمجھنے کے لئے کچھ دیر تک انسان مخمصے میں پڑا رہتا ہے۔ مصور نے یہ عجیب خیال پیش کیا ہے کہ رات کی تنہائی میں دو تصویریں اپنے چوکھٹے کا شیشہ توڑ کر بھاگ نکلی ہیں۔ شیشے کے ٹکڑے مفرور تصاویر کے قدموں میں گرے ہیں۔

اردو شاعری کا عدیم النظیر معجزہ

# نغمۂ زندگی

یعنی

جناب صاحبزادہ ابو النعیم نشتر جالندھری کا حیات آفرین و غیر فانی کلام

## شائع ہو گیا

مصنف کی تصویر سے مجلد سلطان النثار پرواز مسطر ادب و شعر حضرت مولانا غلام رسول صاحب مہر بی اے مالک و ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور کا نادر الاسلوب، فاضلانہ اور بصیرت افروز مقدمہ زینت کتاب ہیں۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ سرورق دبیز و رنگین کاغذ اعلیٰ کتابت و طباعت نظر فریب قیمت ایک روپیہ (عہ/ر)۔ مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ/۸) (محصول ڈاک) فرمائشیں دھڑا دھڑ آ رہی ہیں۔ جلدی کیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا

المشتہر: مہتمم دفتر "نغمۂ زندگی" ۱۱۹ سرکلر روڈ لاہور

---

# پُر لطف زندگی

آپ اگر اپنی زندگی کو پُر لطف اور بہترین بنانا چاہتے ہیں تو آج ہی سے ہم زنانہ نصاب منگا کر اپنے گھر میں پڑھایئے۔ اس میں گھر کے کام کاج کے علاوہ سوسائٹی کے ادب آداب اور برتاؤ کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ یہ کتابیں حیدر آباد کے زنانہ مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ قیمت پہلی کتاب صرف ۲ر دوسری کتاب ۶ر آنے تیسری کتاب ۶ر آنے چوتھی کتاب ۱۲ر آنے۔ پانچویں کتاب ۱۵ر آنے چھٹی کتاب ایک روپیہ دو آنے۔ ساتویں کتاب ایک روپیہ پانچ آنے۔

سب کتابوں کو ایک ساتھ خریدنے والے اصحاب کو ایک آنہ فی روپیہ کمیشن دیا جائے گا۔ لائبریریوں اور سکولوں کو خاص عایت

ہر قسم کی کتابیں بارعایت سپلائی کرنے والے

## امپیریل بک ڈپو چوک ڈالگراں لاہور

---

Telegram: HAZIQ HIND

تار کا پتہ:- حاذق ہند - لاہور

بے نظیر خوبیوں والی [illegible] کتاب

# دواخانہ معین الشفا کشمیری بازار لاہور

مفت

صرف ایک کارڈ لکھ کر اردو یا انگریزی طلب کیجئے ......

طب یونانی کا فارماکوپیا حقیقی معنوں میں

مشاہیر ہند کے سرٹیفکیٹس ملاحظہ فرمایئے

اردو زبان میں ایسی جامع طبی کتاب کسی مصنف نے پیش نہیں کی

خط و کتابت لفافہ بصیغہ راز

۱- پانسو۵ سے زاید مشاہیر اطبائے سلف و خلف کے چیدہ مجربات
۲- جنتری سنہ ۱۹۳۴ء
۳- سرتاپا امراض کے اسباب و علامات و علاج
۴- طلباء کے لئے بہترین رہنما
۵- عوام کے لئے تجربہ کار طبیب

معالجہ کے لئے پتہ
مطب حکیم سید ظفر یاب علی صاحب حاذق الہند لاہور

# ضرور پڑھیں

## خوبصورت بننے کی واحد مسلّم اور اکسیر دوا

**انڈین بیوٹی رجسٹرڈ** خوبصورتی کی واحد دوا ہے اس کے استعمال سے چہرے کے ہر قسم کے داغ دھبے اور چھائیاں دور ہو کر چہرے کا رنگ صاف اور سرخ ہو جاتا ہے۔ اور کیل وغیرہ نہیں نکلتے اور اگر کیل نکل چکے ہوں تو بھی کافور ہو جاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں اور ہونٹ پھٹنے سے محفوظ رہتے ہیں غسل سے پہلے بدن پر مل کر غسل کرنے سے تمام بدن کی رنگت نکھر جاتی ہے۔ اور جسم ریشم کی طرح نرم ہو جاتا ہے۔ قیمت فی شیشی علاوہ محصول ڈاک عہ

## بالوں کو ہمیشہ سیاہ رکھنے بڑھانے اور اگانیوالا تیل

**شریف ہیئر آئل رجسٹرڈ** یہ تیل نہایت خوشبودار مفرح و مقوی دماغ ہے۔ اور بالوں کو سیاہ رکھنے بڑھانے اور اگانے میں نہایت موثر ہے اور بازاری مضر اشیاء سے بنے ہوئے تیلوں کی طرح نہیں ہے بلکہ نہایت خالص اور قیمتی اجزاء سے کیمیاوی طور پر نکالا گیا ہے مشام و دماغ کو معطر کرنیوالا ہے۔ اسکی خوشبو اس قدر دلفریب اور معطر ہے کہ لگانیوالے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی گلشن میں عین موسم بہار کے شباب میں گلگشت کر رہا ہوں۔ قیمت فی شیشی علاوہ محصول ڈاک عہ

## مندرجہ ذیل حضرات نے

ہماری ادویہ کو استعمال کرنے کے بعد ان کے مفید اور لاثانی ہونے کے متعلق نہایت اعلیٰ سرٹیفکیٹ عطا فرمائے ہیں:

(۱) عالیجناب معلی القاب مخدوم زادہ سید محمد رضا شاہ صاحب جیلانی ممبر آف دی لیجسلیٹو کونسل پنجاب اینڈ سینئر وائس چیئرمین ڈسٹرکٹ بورڈ و آنریری مجسٹریٹ ملتان دام اللہ فیوضہم و دام اقبالہٗ

(۲) عالیجناب معلی القاب شیخ حاجی رحمت الٰہی صاحب بہادر ریٹائرڈ سیشن جج ضلع لاہور دام اقبالہٗ

(۳) عالیجناب معلی القاب لفٹیننٹ فقیر سید مغیث الدین صاحب بخاری [illegible] ولنٹیئر فورس [illegible]

(۴) عالیجناب معلی القاب حضور میاں مبارک دین صاحب پنشنل کمشنر لاہور دام اقبالہٗ

## جملہ معطریات کا سرتاج

**شریف سینٹ فلاور رجسٹرڈ** یہ سینٹ اگر آپ ایک دفعہ منگا لیں۔ تو یقینی طور پر آپ ہمارے مستقل گاہک بن جاویں۔ دنیا کا کوئی عطر اس کی خوشبو کو نہیں پہنچ سکتا۔ قیمت فی شیشی علاوہ محصول ڈاک عہ

(نوٹ)

جملہ امراض انسانی کی مجرب ادویہ ہم سے طلب فرماویں

## ملنے کا پتہ

**صحت بڑا دواخانہ رجسٹرڈ عزیز روڈ مصری شاہ لاہور**

# گھر کا ڈاکٹر! یعنی خواص نمک

## ڈاکٹروں اور حکیموں کی بیجا نازبرداریوں اور بھاری بلوں سے ہمیشہ کیلئے نجات دلانیوالی اردو میں اپنی قسم کی پہلی کتاب

نمک وہ عام گھریلو چیز جس کے بغیر غریب کی دال بھات سے لیکر شاہی دسترخوان تک کی تمام نعمتیں بے ذائقہ اور پھیکی ہیں۔ نمک جو منٹوں کی تعداد میں دنیا کے ہر حصہ میں بآسانی دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس نمک کے ذریعے اتنی سے زیادہ انسانی بیماریوں کا کامیاب طلسمی علاج کرنے کا طریق اس کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ حجم یکصد صفحات اور قیمت صرف ۸؍ مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:- (۱) نمک داد کا علاج (۲) نمک چنبل کا ازالہ (۳) عورتوں کے ماہواری ایام کی بے قاعدگی میں نمک مسیحائی (۴) نمک سے پیشاب، داد اور بھارا کا علاج۔ (۵) نمک سے بھلبہری دور کرنے کی ترکیب (۶) نمک سے کھانسی کا علاج (۷) نمک بطور مسہل سخت سے سخت اور دائمی قبض کی شکایت رفع کرنے کا علاج (۸) بھڑ بچھو اور زہریلے مکوڑوں کے لئے بطور تریاق اعظم۔ (۹) دافع بدہضمی کے لئے نمک کا استعمال کیسے کیا جائے (۱۰) نمک سے ورم اور چوٹ کے درد کا ازالہ (۱۱) نمک سے مرض دمہ کا علاج (۱۲) نمک برائے دفعیہ زہر سانپ (۱۳) زہر خوردہ کیلئے نمک کا استعمال۔ (۱۴) نمک سے لاعلاج پھوڑوں کا دفعیہ (۱۵) نمک سے سڑے ہوئے زخم مندمل ہو سکتے ہیں (۱۶) نمک سے ہچکی کا علاج (۱۷) گرمی کے دانے یعنی پت کے دفعیہ میں نمک کی مسیحائی (۱۸) نمک سے مرض آتشک کا علاج (۱۹) نمک سے گہرے زخموں کے کیڑے کیسے مر سکتے ہیں اسکی ترکیب (۲۰) پیٹ کے جملہ امراض کو دور کرنے میں نمک کے معجزے (۲۱) نمک سے بواسیر کا حتمی علاج (۲۲) نمک سے ناسور کا دفعیہ (۲۳) نمک سے ایام زچگی کے امراض کا ازالہ (۲۴) نمک سے باؤگولہ اور درد گردہ کا علاج۔ (۲۵) نمک سے دائمی سردرد کی شکایت کیسے رفع ہو سکتی (۲۶) نمک سے مرگی جیسے سنگین مرض کا ازالہ (۲۷) نمک کے علاج سے نزلہ اور زکام کی شکایت رفع ہو سکتی ہے (۲۸) نمک کے علاج سے پاگل پن کا علاج (۲۹) مسوڑھوں، درد دانتوں کے امراض میں نمک کی مسیحائی۔ (۳۰) نمک سے آنکھوں کی دھند جالا پھولے ککرے اور سنگھوری کا علاج۔ (۳۱) نمک سے کان کے درد کان سے مواد بہنے اور بہرہ پن کا علاج (۳۲) نمک کے علاج سے موٹے پیٹ والے جسیم آدمی اپنی اصلی حالت میں آسکتے ہیں (۳۳) نمک سے سنگین اور مہلک بخاروں کا طلسمی علاج۔ (۳۴) نمک سے خنازیر یعنی کنٹھ مالا کا علاج (۳۵) نمک سے مرض نمونیہ، ہیضہ انفلوئنزا اور پلیگ کا علاج وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ اردو زبان میں بالکل نئی کتاب جس کا پہلا ایڈیشن شاید اسی ہفتہ میں ختم ہو جائیگا۔

## ایک جاہل آدمی ۶ ہفتہ میں انگریزی سیکھ گیا!

صرف ڈیڑھ ماہ میں گھر بیٹھے انگریزی بول چال سیکھ لو۔ یہ ہمارا دعویٰ ہے جسے آج تک کوئی شخص جھٹلا نہیں سکا۔ جس طرح انگریز مائیں اپنے بچوں کو بولنا سکھاتی ہیں۔ اور تین یا چار سال کا بچہ انگریزی میں فرفر بات چیت کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ اپنی مادری زبان کا ایک حرف بھی وہ نہیں سکھتا اسی طرح ہماری کتاب انگریزی بول چال کے مطالعہ سے مبتدی انگریزی حروف تہجی کی شناخت کے بغیر بے دھڑک فرفر انگریزی بولنے لگتا ہے۔ حقیقت میں کسی زبان کو جلد از جلد سیکھنے کا قدرتی طریقہ یہ ہے کہ مبتدیوں کو بلا حروف تہجی کی شناخت کرانے کے پہلے اس زبان میں گفتگو کرنا سکھلایا جائے۔ پھر حروف کی پہچان کر کے مشکل اور دقیق الفاظ کو سمجھنے اور یاد کرنے قابل وہ خود بخود ہو جائیں گے۔ اور صرف نحو یعنی گرامر کے قواعد طوطے کی طرح رٹنے کی ضرورت نہ رہیگی۔ اردو میں سینکڑوں انگریزی سکھانیوالی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ لیکن ان میں سے چونکہ کسی نے بھی قدرتی طریقہ تعلیم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اس لئے سب کی سب ناکارہ اور فضول ثابت ہوئی ہیں۔ مگر خوشی کا مقام ہے کہ کتاب انگریزی بول چال کے مصنف نے اس قدرتی طریقہ تعلیم کی پیروی کر کے عرصہ قلیل میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے ایسے لوگ چھ ہفتہ کے اندر صاف اور شستہ انگریزی میں بات چیت کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ جو رائج الوقت انگلش ٹیچروں سے برسوں میں کچھ حاصل نہ کر سکے تھے۔

قیمت مکمل کورس کی صرف ایکروپیہ ۲؍ معہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ

## یونیورسل ٹریڈنگ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ایک سو پچاس لاہور

# خوبصورتی سب سے بڑا جادو ہے

**انسان کے حسن و توانائی پر** ہمیشگی کی مہر ثبت ہو سکتی ہے۔ عورتیں زندگی بھر حسین گویا کوئی بہشتی حور آسمان سے اتر آئی ہے۔ اور مرد بڑھاپے تک چاک چوبند نظر آئیگا۔ آخری دم تک سر کے بال سیاہ چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا کتاب رموزِ حسن باتصویر میں وہ تمام باتیں ظاہر کر دی گئی ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان کا جسم سڈول خوبصورت اور طاقتور بن جاتا ہے آج ہی رموزِ حسن کی ایک کاپی منگوا لیجئے مبادا پھر یہ کسی قیمت پر بھی نہ مل سکے۔ کتاب کا حجم ۲۵۷ صفحات ۲ سو سے زائد سرخیاں اور فوٹو بلاکس کی کئی رنگین تصویریں ہیں۔ مہذب ممالک میں کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے۔ کہ آج تک دو کروڑ سے زائد انگریزی جلدیں فروخت ہو چکی ہیں مختصر فہرست مضامین ملاحظہ ہو:۔

(۱) کھوئی ہوئی خوبصورتی کو دوبارہ حاصل کرنے کا راز (۲) حسن اور خوبصورتی بڑھانے کے طریقے (۳) جیسے چاہیں حسین بن سکنے کی ترکیب۔ (۴) بدصورت چہرہ کو خوبصورت بنانے کا جدید سائنٹیفک طریقہ (۵) بدصورت عورتوں کو پری چہرہ بنانے کی جدید کسرتیں (۶) حسن و خوبصورتی کا سنگِ اساس کرجوانی غذاؤں کی فہرست (۷) صرف خوراک کی تبدیلی سے چہرہ کی خوبصورتی بڑھانے کا راز (۸) کالی اور بھونڈی عورت چند دنوں میں پری چہرہ کیسے بن سکتی ہے اس کی ترکیب (۹) بھدی ناک اور اس کا علاج (۱۰) چہرہ کے داغ چھائیاں اور مہاسے دور کرنے کے طریقے (۱۱) پھنسیاں اور چہرہ کے داغ کیسے رفع ہو سکتے ہیں (۱۲) بدبودار سانس اس کی وجوہات اور علاج (۱۳) بالوں کی خوبصورتی بڑھانے کا راز جس سے چہرہ کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے (۱۴) مکمل صحت اور خوبصورتی کی جانچ کرنے کا طریقہ جس کی بدولت ہر مرد و عورت اپنے حسن و جوانی کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں (۱۵) دراز قد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے (۱۶) موٹاپا دور کرنے کے طریقے (۱۷) چھاتی چوڑی کرنے کے طریقے۔ (۱۸) ہمیشہ جوان رہنے کے چند راز (۱۹) آواز میں سُریلاپن پیدا کرنے کی ترکیب (۲۰) زبان کی لکنت کیسے دور کی جا سکتی ہے (۲۱) ہم لمبی عمر کیسے حاصل کر سکتے ہیں (۲۲) وہ اسباب جن کی بدولت نادانستہ طور پر ہم اپنی عمر گھٹا رہے ہیں (۲۳) سو سال کی عمر تک پہنچنے کے لئے ہمیں کس قسم کی خوراک کھانا چاہیئے۔ (۲۴) چہرہ کی جھریاں بلا دوا دور کرنے کا ایک سائنٹیفک طریقہ (۲۵) حسن و خوبصورتی کی افزائش کے لئے کچھ گھریلو ورزشیں (۲۶) آنکھوں کی بینائی خوبصورتی اور دلآویزی بڑھانے کا کاجل (۲۷) آنکھیں بڑی بڑی کیسے ہو سکتی ہیں۔ (۲۸) بالوں میں گھونگھر ڈالنے کا طریقہ (۲۹) بالوں کو عمر بھر سیاہ رکھنے کا طریقہ (۳۰) بالوں کو ایڑیوں تک لمبا بنانے کی ترکیب (۳۱) ولایتی پوڈر اور فیس کریم کے مقابلہ میں چہرہ کی خوبصورتی بڑھانے کے لئے کچھ نامعلوم نسخے جو چند پیسوں کی لاگت پر ہر جگہ تیار ہو کر ہزاروں روپیوں کا کام دیتے ہیں (۳۲) چہرہ گردن اور ہاتھ پاؤں کو خوبصورت بلکہ دودھ کی مانند سفید بنانے کے تیس شاہی نسخے جو عہد مغلیہ میں خاص طور پر صرف نورجہاں بیگم کیلئے تیار ہوا کرتے تھے قیمت صرف عہ محصولڈاک ۵ ؍

**ملنے کا پتہ: میسرز فلینڈ رنکڈلو پوسٹ بکس نمبر ۱۵ لاہور**

# آنکھ کا جادو!

گورا چہرہ۔ بھرے بھرے رخسارے۔ ستواں ناک۔ ابھری ہوئی پیشانی موتی بھری اور مد بھری آنکھیں لبے اور پتلے ہونٹ۔ اور ان کے اندر موتیوں کے ایسے دانتوں کی دو لڑیاں۔ یہ سب حسن کے لوازمات قدرت نے جس عورت کو دیئے ہیں۔ وہی بے نیاز ہے۔ پلکوں کی جوانگی کے اشارے سے سارے عالم کو ایک ہی تال پر نچا سکتی ہے اور نگاہِ قہر سے دیکھ کر تہ و بالا بھی کر سکتی ہے۔ لیکن اگر لاکھ پری چہرہ اور رشک حور ہونے کے باوجود بھی عورت کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ تو یوں سمجھو کہ قدرت نے سحر و افسوں کا دروازہ اس پر بند کر دیا ہے اس میں کوئی دلکشی کوئی کشش اور کوئی خوشنمائی نہیں کوئی شخص اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرے گا۔ ہمارا آنکھ سنوار کا جل رجسٹرڈ نہ صرف آنکھ کے جملہ امراض ضعف بصر سدے ککرے سرخی یا جالا۔ ناخنہ۔ شبکوری۔ آشوب چشم۔ جالا دھندا اور پڑبال۔ وغیرہ کو جڑ سے اکھاڑ کر بینائی کو تیز اور عینک کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ بلکہ اس کے چالیس یوم متواتر استعمال کرنے سے چھوٹی سے چھوٹی آنکھ موٹی چمکدار خوبصورت اور رسیلی بن جاتی ہے سفیدی گلابی رنگ سے جو بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے۔ آنکھوں میں کچھ اس قسم کی دلکشی اور دلربائی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ بے اختیار دیکھے جاؤ۔ اور طبیعت سیر نہ ہو کیونکہ آنکھوں کو ہلکی گلابی رنگت دیکر موٹی موٹی گول کتھئی ابھری ہوئی خوبصورت اور دلکش بنا دیتا ہے۔ ہمارے **آنکھ سنوار کا جل** کا خاص وصف ہے ننھے ننھے بچے جن کی آنکھیں پیدائش کے وقت سے خراب چھوٹی چھوٹی اور عموماً دکھتی رہتی ہیں۔ ان کے لئے ہمارا آنکھ سنوار کا جل ایک **نعمت عظمیٰ** ثابت ہوگا۔ اور چند یوم کے استعمال سے آنکھ کی کوئی شکایت باقی نہ رہے گی۔ بلکہ آنکھیں ایسی خوبصورت معلوم ہونے لگیں گی۔ کہ گویا ہزار تندرست بچوں کی آنکھوں کی خوبصورتی انہیں دو آنکھوں میں آ کر جمع ہو گئی ہے۔ چیچک (جس کا ۹۰ فیصدی شکار یہی معصوم ہستیاں ہوتی ہیں) کا حملہ اکثر آنکھ پر ہو کر آنکھ کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔ اور تب وہ پیاری پیاری شکلیں نفرت اور حقارت کا ایک نمونہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ آنکھ سنوار کا جل کے دائمی استعمال سے آنکھیں برف کی طرح ٹھنڈی اور فولاد کی طرح محفوظ رہتی ہیں۔ اور چیچک یا کسی موروثی بیماری کا اثر آنکھ پر نہیں پڑتا۔ گویا آنکھ کا بیمہ ہو جاتا ہے۔ اور بچے بڑے بوڑھے ہو کر بھی آنکھ کی کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے غرضیکہ آنکھ سنوار کا جل رجسٹرڈ بیسویں صدی کی ایک حیرت انگیز ایجاد ہے اور اس کا استعمال ہر گھر میں ہونا چاہیئے۔ قیمت باوجود ان خوبیوں کے شیشی کلاں عہ شیشی خورد ۱۲ محصولڈاک ایک سے تین شیشی تک **صرف ۶ آنے۔**

## آنکھوں کی کسرتیں باتصویر

اس نام کی کتاب امریکہ کے ایک نامی گرامی ڈاکٹر نے لکھی ہے۔ جو اس جدید طریقہ علاج کا موجد ہے۔ اور نئی چیز ہونے کے باعث یہ کتاب وہاں لاکھوں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ بک چکی ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے آنکھوں کی بینائی اور درستی کے لئے آنکھوں کی مالش اور آنکھوں کے غسل کے طریق کے علاوہ کچھ کسرتیں حوالہ قلم کی ہیں۔ جن کو دس پندرہ منٹ روزانہ کرنے سے بارہ پندرہ سال کی بگڑی ہوئی آنکھیں بھی ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ اور پھر عینک لگانے کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی۔ امریکہ کے ہزاروں لاکھوں آنکھ کے مریضوں نے ان کسرتوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور عینکیں اتار اتار کر پھینک دی ہیں۔ بڑھاپا یا کسی بیماری کے باعث آنکھیں چاہے کیسی خراب ہو گئی ہوں آنکھوں سے پانی بہتا ہو۔ آنکھیں چندھیا جاتی ہوں۔ یا کسی وجہ سے آنکھوں سے کم دکھائی دیتا ہو۔ تو ان کسرتوں سے ایک ہفتہ میں غیر معمولی فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ کسرتیں نہایت ہی آسان ہیں۔ اور ان کو اندر یا باہر ہر جگہ ہر عمر کا آدمی کر سکتا ہے۔ کتاب کے اردو ترجمہ کی قیمت صرف تین روپے (سے)۔ لیکن آنکھ سنوار کا جل کے خریدار کو مفت دی جائے گی۔

**پتہ:۔ ڈاکٹر برھتی سنگھ اینڈ سنز۔ ڈاکٹر برھتی سنگھ بلڈنگز۔ اسٹریٹ۔ لاہور**

دنیا بھر میں تہلکہ مچا دینے والی نئی ایجاد

کالا تیل

برف جیسے سفید بالوں کو شب دیجور کی مانند سیاہ کر دیتا ہے۔ آج تک ہزاروں انسانوں نے بالوں کو سیاہ کرنے والا تیل بنانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے ہم نے کئی برسوں کے تجربہ کے بعد بالوں کو سیاہ کرنے والا تیل بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے ایک دفعہ صرف آزمائش کیجئے ہمیشہ کے لئے وسمہ و مہندی اور خضاب لگانا بھول جائیں گے یہ بے نظیر چیز ہے اس کے صرف ایک ہفتہ کے استعمال سے بال جڑ سے سیاہ پیدا ہوں گے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ ہے بالوں کو ملائم چمکدار اور سیاہ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے باوجود اس قدر خوبیاں ہونے کے قیمت نہایت کم رکھی گئی ہے قیمت فی شیشی صرف دو روپے علاوہ محصول

ایجنٹ برائے لاہور ڈسٹرکٹ
راما برادرس جنرل مرچنٹ انارکلی لاہور

کے ایل کپور اینڈ کمپنی اندرون شاہ عالمی گیٹ
لاہور

مشہور مجلہ سہ ماہی

لالۂ صحرا

کا شمارہ اولین شائع ہو گیا جس میں ملک کے مشاہیر شعر و ادب کے رشحات افکار زینت اشاعت ہیں لالۂ صحرا کے مدیر اعلیٰ ادیب جلیل حضرت [illegible] صدیقی ہیں
اس شمارہ کی سب سے بڑی عظمت یہ ہے کہ اس میں
خلد آشیانی دارا شکوہ مولانا سید محمد ادیب پشاوری
حضرت علامہ شاہ عبدالغنی حافظ پھلواری
کا غیر مطبوعہ کلام پیش کیا گیا ہے

بدل اشتراک۔ سالانہ تین روپیہ چار آنے ششماہی دو روپیہ۔ فی کاپی ۱۲ر

دار الاشاعت:۔ لالۂ صحرا۔ سنجر پور (بہاول پور سٹیٹ)
شرقی تقسیم کنندہ دار الادب جوالاپور ضلع سہارنپور
خریداری کے لئے فوراً فرمائشات بھیجئے ورنہ شمارہ اولین جیسی [illegible]

حضرت خواجہ حسن نظامی کا روزانہ اخبار

عادل

ایک کارڈ لکھ کر مفت جاری کرا لیجئے

"عادل" ہندوستان کے روزانہ اخبارات میں سب سے دلچسپ سب سے [illegible] ارزاں اخبار تسلیم کیا جاتا ہے اور ہندوستان کے ہر گوشہ میں تمام اخبارات سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے اور پڑھا جاتا ہے اگر آپ بھی اس اخبار کی خریداری کے مشتاق ہوں تو صرف ایک کارڈ لکھ بھیجئے۔ اور پرچہ مفت جاری کرا لیجئے ایک ہفتہ کیلئے پرچہ بطور نمونہ مفت جاری کر دیا جائیگا۔ صرف وہ حضرات پرچہ جاری کرائیں جو خریدار بننا چاہتے ہیں

منیجر روزانہ "عادل" دہلی

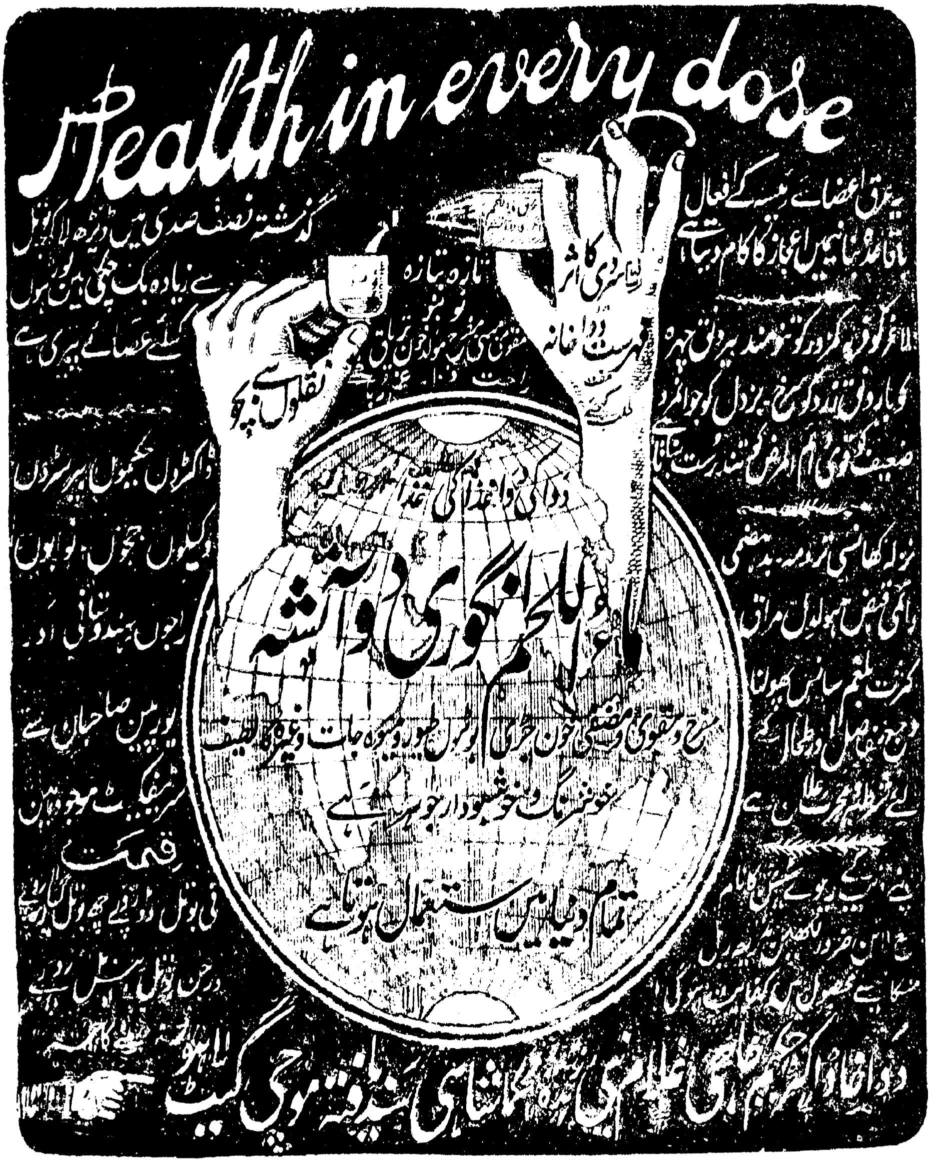

Health in every dose

گذشتہ نصف صدی میں ڈیڑھ لاکھ بوتل سے زیادہ بک چکی ہیں بوڑھوں کیلئے عصائے پیری ہے

تازہ بتازہ نو بنو

نقالوں سے بچو

پہلی خوراک کا اثر

فہرست دواخانہ مفت طلب کیجئے

یہ عرق اعضائے رئیسہ کے افعال ناقابلہ بنانے میں اعجاز کا کام دیتا ہے

لاغر کو قوی کمزور کو تنومند بے رونق چہرہ کو بارونق زرد کو سرخ بزدل کو جوانمرد ضعیف کو قوی ام المرض کو تندرست بنا دیتا ہے

ڈاکٹروں حکیموں بیرسٹروں وکیلوں ججوں نوابوں رئیسوں ہندوستانی اور یورپین صاحبان کے سرٹیفکیٹ موجود ہیں

دوا کی دوا غذا کی غذا

ماء اللحم انگوری دو آتشہ

سرخ و مقوی مصفی خون جگر ... اور میوہ جات وغیرہ کا لطیف خوش رنگ و خوشبودار جوہر ہے

تمام دنیا میں استعمال ہوتا ہے

نزلہ کھانسی تر دمہ بدہضمی دائمی قبض بھولنے مراق کثرت بلغم سانس پھولنا وجع مفاصل و طحال کے لئے شرطیہ مجرب علاج ہے

قیمت

فی بوتل دو روپے چھ بوتل گیارہ روپے

درجن بوتل بیس روپے

[illegible] ضرور لکھئے [illegible]

منگانے سے محصول میں کفایت ہوگی

دواخانہ ڈاکٹر حکیم حاجی غلام نبی زبدۃ الحکما شاہی سند یافتہ موچی گیٹ لاہور

بچوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوائی

ڈونگرے کا بال امرت

یہ ڈونگرے کا بال امرت میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے بہت خوشی سے پیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کی کھانسی۔ بخار۔ بدہضمی پیچش وغیرہ امراض جو اکثر ناطاقتی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے بچوں کا بدن تھوڑے ہی عرصہ میں گوشت سے بھر کر جسم میں طاقت بڑھتی ہے

لاہور ایجنٹ

لالہ بھگت رام پوری اینڈ سنز

سوتر منڈی لاہور

دواسازی

علم الادویہ

علم العلاج

کوئی علمی کتب خانہ اسکے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا

# خزائن الادویہ

کی مشہور کتاب

یہ کتاب آپکی معلومات کو وسیع اور مطالعہ کو پر لطف کر دے گی

اس کتاب کی آٹھ جلدوں کا حجم چار ہزار ۴۰۰۰ بڑے صفحات ہیں!

## اس کتاب کی چند خصوصیات حسب ذیل ہیں

یہ کتاب یونانی ہندی ویدک اور انگریزی دواسازوں اور عطاروں کی جان ہے۔ اس میں فارماکولوجی یعنی تاثرات الادویہ کا مفصل بیان ہے اس میں پانچ ہزار مفردادویات کی تمام کمال شناخت فوائد خوراک و بدل وغیرہ نہایت صراحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ کوئی شخص ایک آنکھ دیکھنے کے بعد خریدے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کتاب میں ہر ایک دوا کے شروع میں اس کا اردو۔ فارسی۔ عربی۔ ہندی۔ ڈاکٹری۔ ویدک نام مع تلفظ دیئے گئے ہیں۔ پھر اس کی وجہ تسمیہ اور اس دوائی کے ذاتی اوصاف اور خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ پیدائش طبعی اور کیمیاوی تاریخ اور اس کے ضمن میں کئی محققانہ نوٹ جو اطباء کے اشتباہات کو رفع کرتے ہیں۔ پھر ادویات کے افعال مقدار خوراک۔ اور طریق استعمال کو ترتیب وار بیان دے کر ان کے افعال و خواص پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو خواں عطاروں۔ حکیموں۔ ویدوں اور طب ڈاکٹری سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں اور ڈاکٹروں کے لئے سونے سے تول کر خریدنے کے لائق ہے۔ کوئی طبیب اس وقت تک نامور نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کے پاس یہ کتاب نہ ہو۔ یہ کتاب لاریب مفردادویات کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

**نصف قیمت صرف جنوری کے لئے**

اس کتاب کو مکمل اور مفید بنانے کیلئے جسقدر محنت اور صرف زر برداشت کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ صرف کتاب کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ عربی فارسی۔ ہندی۔ ویدک و انگریزی وغیرہ کی پانصد مشہور طبی کتابوں سے مفاد حاصل کر کے اس کتاب کو مولوی نجم الغنی خاں صاحب مرحوم رامپوری نے پچاس سال کی متواتر محنت سے تیار کیا تھا۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ کتابیں نابود بھی ہو جائیں۔ تو یہ انکا نعم البدل ہو سکتی ہے۔ اس کتاب میں ہزاروں دواؤں کی نہایت مفصل تاریخ بھی لکھی گئی ہے اگر آپ حکیم وید۔ ڈاکٹر، کمپونڈر یا کوئی اور ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگا کر پڑھیں۔ صرف سرسری نظر سے ہی اتفاقیہ پڑھنے والوں کو بھی فاضل مؤلف کی محنت کا پتہ چل سکتا ہے۔ درحقیقت یہ جامع کتاب اس قابل ہے۔ کہ ہر ایک دواخانہ میں اس کو رکھا جائے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اس کے تمام مضامین اور معلومات صحیح ہیں۔ اور بالکل مکمل ہیں۔ جس کی وجہ سے آل انڈیا طبی کانفرنس نے اسکے مصنف کو سنہری تمغہ بطور قدردانی دیا تھا۔ اس سے بہتر اور جامع ضخیم کتاب اس فن پر آپکو اور کوئی نہیں مل سکتی۔ اس سے پہلے اس مضمون پر تحفۃ المومنین مخزن الادویہ۔ جامع الجوامع اور محیط اعظم وغیرہ جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب ان سب پر سبقت لیگئی ہے۔ اس کتاب میں صدہا ایسی ادویات کا بھی ذکر ہے جو نہ عطاروں کے یہاں سے ملتی ہیں۔ اور نہ جنگل میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ ہمارے گھروں میں استعمال ہوتی ہیں۔ آپ آج اس کتاب کو طلب کریں۔ اگر بیکمشت تمام جلدیں نہ خرید سکیں تو ایک ایک جلد کر کے منگا لیں۔ ایسی کتابیں بار بار نہیں چھپتیں۔ قیمت فی جلد پانچ روپے (دعہ) مکمل سٹ آٹھ جلدیں چار ہزار صفحے چالیس روپے (للعہ) مکمل سٹ کے خریدار کو خاص رعایت دی جائے گی۔

**المشتہر مینیجر پیسہ اخبار لاہور**

# نئی کتابیں

**رباعیات یگانہ**: ہندوستان کے مشہور رباعی گو شاعر مرزا یاس یگانہ چنگیزی لکھنوی کی رباعیات کا مجموعہ عمر خیام کے انگریزی ایڈیشنوں سے بھی بہتر صورت میں شائع ہو گیا ہے۔ دو صد صفحات کاغذ کتابت اور طباعت بہترین مجلد سنہری۔ مرزا صاحب کی تصویر سے مزین۔ قیمت عہ

**ڈرامے چند**: ناٹک ساگر کے مصنفین محمد عمر نور الہی کے سات ایک ایکٹ مزاحیہ ڈرامے۔ ان ڈراموں کی اشاعت نے فن ڈراما سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کو محو حیرت بنا دیا ہے۔ اتنے دلچسپ اتنے نوفزدہ اتنے معنی خیز ڈرامے آجتک نہیں لکھے گئے۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت صرف آٹھ آنے ۸ر

**چہیتا بھائی**: مرزا فہیم بیگ چغتائی کی زبان میں سلاست اور شگفتگی کوٹ کوٹ بھری ہوئی ہے آپ کا طرز بیان از حد دلکش اور موثر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں آپ نے ایک دردناک۔ دلچسپ اور اخلاق آموز قصہ بیان کیا ہے۔ جو سراسر حقیقی اور سچے واقعات پر مبنی ہے۔ دیکھئے ہماری زندگی میں روزانہ کئی افسانے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں انکی خبر بھی نہیں ہوتی۔ حجم ۱۵ صفحات۔ قیمت ۸ر

**تجدید عمل**: ماڈرن انڈیا کا منتظمہ پروگرام۔ ماڈرن ٹائمس نے ہندوستانی لیڈر۔ مالوی اور اقبال۔ علامہ اقبال سے ایک سوال پوچھا تھا گاندھی سے ایک سوال۔ مذہب قومیت کا بلند ۔ قومیت اور جنگ۔ تمدن اور گناہ۔ مذہب مساوات۔ کیا خدا کو ماننا ضروری ہے۔ کیا مذہب کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ گناہ یا ثواب کی حقیقت۔ لیڈروں کی خصوصیات مفسرہ ششم مصنفین مولوی اور پنڈت سٹر حجازی کی شاندار تصنیف تجدید عمل کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت حصہ اول ۸ر دوم ۸ر

**سیلاب تبسم**: شوکت تھانوی مصنف سودیشی ریل کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ پڑھیے۔ اور سراپا قہقہہ بن جائیے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت عـہ

**غنچۂ تبسم**: سید کاظمی کے مشہور مضامین کا مجموعہ شروع میں نیاز فتحپوری۔ احسن مارہروی اور ملا رموزی کے مضامین بھی درج ہیں۔ ۱۹۰ صفحات قیمت عمر

**روح ظرافت**:- مرزا عظیم بیگ چغتائی مصنف شریر بیوی کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف جس میں انگوٹھی کی مصیبت والا مشہور افسانہ درج ہے۔ قیمت۔ ۱ار .. .. .. .. .. .. .. ۳عہ/

**روح لطافت**:- روح لطافت کا دوسرا حصہ قیمت .. .. .. .. .. .. ۳عہ/

**مرزا جنگی**:- لکھنؤ کی تہذیب کا عبرت انگیز واقعہ پڑھیے اور ہنسیے۔ سوچیے اور رو دیجیے قیمت .. .. .. ۱۲ار

**مرزا جی**:- ایم اسلم کا شاہکار۔ مضامین کی قدرت کے متعلق عرض ہے کہ ایم اسلم کا شاہکار ہے۔ کتابت طباعت کاغذ اور سرورق کے متعلق دعوے ہے۔ کہ ہندوستان میں کوئی اور کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ۳۱۲ صفحات۔ قیمت .. .. .. .. .. .. .. .. ۲عہ/

**کولتار**:- کولتار صاحب کے حالات لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کے متعلق دلچسپ قصہ قیمت .. .. .. عہ

**شادی**:- ملا رموزی کی شہرہ آفاق شادی کے دلچسپ حالات۔ ان کی اپنی زبانی قیمت .. .. .. عہ/

**صبح لطافت**:- ملا رموزی کی مشہور تصنیف جس میں ازحد دلچسپ ہنسانے والے مضامین ہیں۔ قیمت .. عہ

**شفاخانہ**:- ملا رموزی کی تازہ تصنیف۔ قیمت .. .. .. .. .. .. .. .. .. .. عہ

**عورت ذات**:- دنیا جہاں کی عورتوں کے حالات مثلاً ایکٹر کی بیوی۔ رنڈی بیوی۔ جلاہے کی بیوی۔ کنجڑے کی بیوی۔ ایڈیٹر کی بیوی۔ لیڈر کی بیوی وغیرہ قیمت .. .. .. .. .. ۳عہ/

**لاٹھی اور بھینس**:- ملا رموزی کی بھینس کے حالات قیمت .. .. .. .. .. .. ۲عہ/

**نکات رموزی**:- وہ کتاب جس نے حالات ملا رموزی کو موجودہ ملا رموزی بنا دیا۔ قیمت اول عہ، دوم ... ۲عہ/

ان کے علاوہ آپ کو کسی مصنف کی کسی کتاب کی ضرورت ہو۔ بجائے مختلف مقامات سے مختلف کتب منگوانے کے صرف اردو بک سٹال کی ہر مصنف کی ہر تصنیف کے لئے لکھ دیا کیجئے۔ کرایہ ریل محصول ڈاک وغیرہ میں بہت زیادہ رعایت ہو جائے گی۔

ملنے کا پتہ

**اردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور**

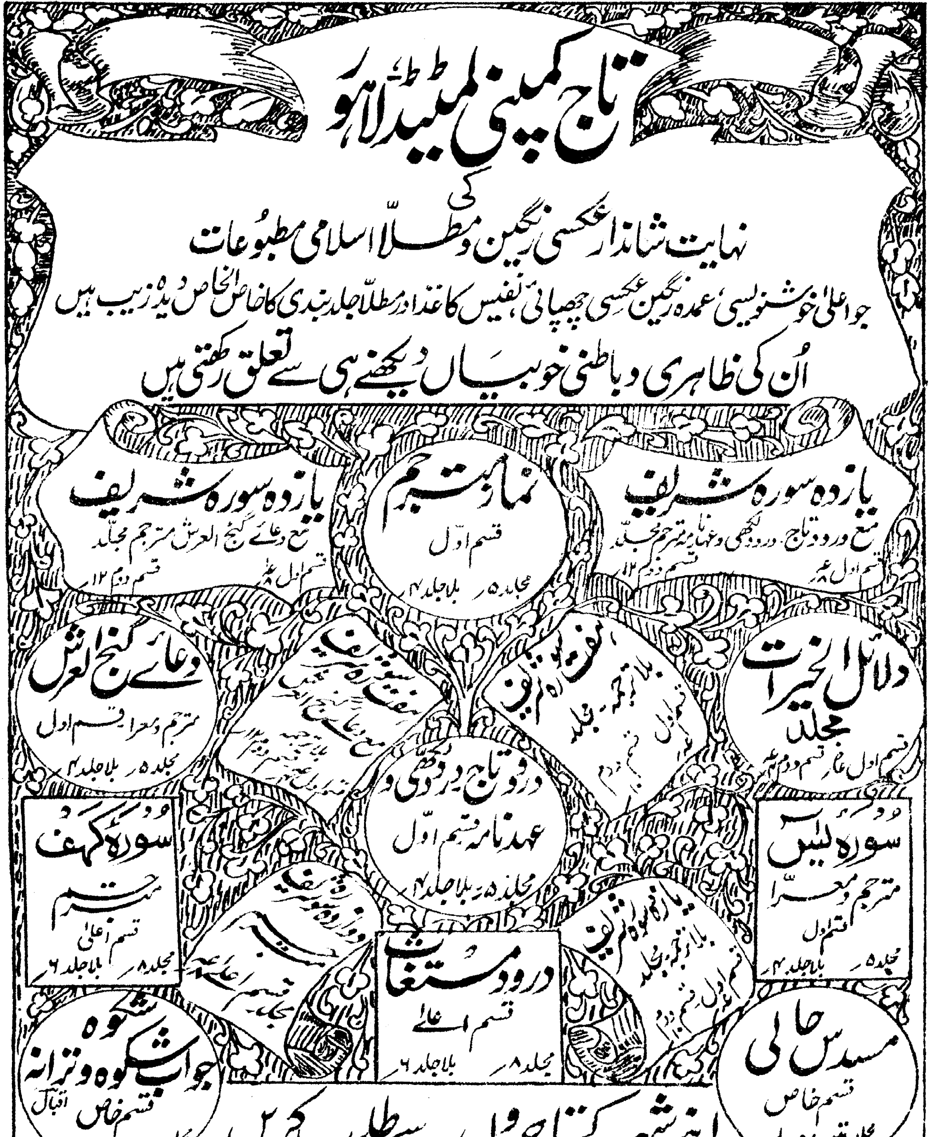

تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور
کی
نہایت شاندار عکسی رنگین و مطلّا اسلامی مطبوعات
جو اعلیٰ خوشنویسی، عمدہ رنگین عکسی چھپائی، نفیس کاغذ اور مطلّا جلد بندی کا خاص الخاص دیدہ زیب ہیں
اُن کی ظاہری و باطنی خوبیاں دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں

پارہ سورہ شریف
مع درود تاج، درود لکھی و عہدنامہ مترجم مجلّد
قسم اول عہ قسم دوم ۱۲ر

نماز مترجم
قسم اوّل
مجلد ۵ر بلا جلد ۴ر

پارہ سورہ شریف
مع دعائے گنج العرش مترجم مجلّد
قسم اول عہ قسم دوم ۱۲ر

دلائل الخیرات
مجلد
قسم اول عاؔر قسم دوم عہ

دعائے گنج العرش
مترجم و معرا قسم اول
مجلد ۵ر بلا جلد ۴ر

درود تاج درود لکھی و عہدنامہ قسم اوّل
مجلد ۵ر بلا جلد ۴ر

سورۂ یٰسٓ
مترجم و معرّا
قسم اول
مجلد ۵ر بلا جلد ۴ر

سورۂ کہف
مترجم
قسم اعلیٰ
مجلد ۸ر بلا جلد ۶ر

درود مستغاث
قسم اعلیٰ
مجلد ۸ر بلا جلد ۶ر

مسدس حالی
قسم خاص
مجلد تین روپے

جواب شکوہ و شکوہ و ترانہ
اقبال
قسم خاص
مجلد ۶ر بلا جلد ۵ر

اپنے شہر کے تاجروں سے طلب کریں

# دو حیرت انگیز ایجادیں

## بڑھاپا کیوں

یورپ کے سائنسدانوں نے جب بندر کی گلٹیوں کے ذریعہ بڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کرنے کا اعلان کیا تو دنیا ششدر رہ گئی مگر یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بہت کم لوگوں نے اسکا فائدہ اٹھایا جسکی کئی وجوہات ہیں جنمیں سے دو قابل ذکر ہیں۔ (اول) اپریشن کی ناقابل برداشت تکلیف (دوئم) اپریشن کرانیکا ہزاروں پونڈ کے اخراجات ہندستان کے باشندے یہ سن کر خوش ہونگے کہ خالص ہندوستانی دماغ نے کوہ ہمالیہ کی جڑی بوٹیوں کے ذریعہ ایک ایسی دوائی ایجاد کی ہے جسکے استعمال سے بڑھاپا نزدیک تک نہ آنے پائے اسکا استعمال کمزوروں اور بوڑھوں کیلئے تو نعمت خدائی ہے ہی مگر جوانی میں اسکا استعمال بڑھاپے کی آمد کو روکنے کیلئے اکسیر ثابت ہوا ہے یہ دوائی **NEVEROLD** کے نام سے لاہور کے مشہور کیمسٹ میسرز بیلی رام اینڈ برادرس انارکلی سے ملسکتی ہے۔ اسکا پورا کورس ۱۸۲ ٹکیوں کا ہے اور اگر آزمانا ہو تو ۵۴ ٹکیوں والا نمونہ کا بکس منگوا کر بیشک آزمایش کریں اسکے متعلق مکمل حالات کی کتاب (انگریزی میں) معہ آزمائے ہوؤں کے سرٹیفکیٹ دیکھنے ہوں۔ تو پوسٹ بکس نمبر ۵۹ لاہور سے ایک کارڈ لکھکر طلب کریں

## خوبصورتی کا خزانہ

دنیا میں خوبصورتی بڑھانے و قائم رکھنے کی بے شمار ایجادات آئے دن ظہور میں آتی رہتی ہیں مگر سینما سٹار بیوٹی لوشن جو چہرے کے داغ دھبے جھریاں جڑ سے دور کرنے کا بینظیر لوشن ثابت ہوا ہے۔ دنیائے خوبصورتی میں ہلچل پیدا کر دی ہے ہر ایک دکان دار سے بقیمت ایک عہ روپیہ فی شیشی مل سکتا ہے آپ بھی آج ہی اس کو خرید کر آزمائش کریں آپ کو اس کے برتتے ہوئے کسی پاوڈر یا کریم کی ضرورت ہرگز نہیں رہے گی

## ایجنسی کیلئے پوسٹ بکس نمبر ۱۶۹ لاہور کو لکھیں

بیمہ

لاتعداد جانوں اور گھروں کو تباہی سے بچا کر پیغام امن دیتا ہے

# بھارت

ہندوستان کی سب سے بڑی اور مشہور و معروف کمپنی ہے۔ جس کی برانچیں ہندوستان کے تقریباً تمام مشہور مقامات پر ہیں۔ یہ سہل شرائط پیش کر کے ہر طبقے کے افراد کو بیمہ کرانے کا موقع پیش کرتی ہے۔

بھارت میں بیمہ کرائیں اور حسب خواہ فائدہ اٹھائیں

| | |
|---|---|
| کیونکہ اس کے کل فنڈ | 18224012-13-6 روپیہ ہیں |
| ادا شدہ کلیم | 99 لاکھ سے زائد ہیں۔ |
| کل آمدنی | 3,47,00,000 روپیہ سے زائد |
| لائف فنڈ | 15124344-14-3 روپیہ ہیں |

دیگر امور کے لیے مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں۔

**بھارت انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور**

ٹیلیفون نمبر ۴۹۴

تار کا پتہ: بھارت، لاہور

# بیاض سحر

مصنفہ وہب سدید بیگم شیخ تراب علی صاحب) یہ کتاب حال ہی میں شائع ہو رہی ہے نسوانی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے والا نہایت دلچسپ افسانہ ہے۔ اصلاح نسواں حقیقت میں مستورات ہی کا کام ہے اور اس لحاظ سے یہ افسانہ اپنی طرز میں پہلا اور سب سے افضل کام سمجھا جائیگا۔ اس کتاب کے چار حصص ہیں۔ پہلے حصہ میں تربیت اولاد کا نمونہ ہے۔ دوسرے میں منگنی، بیاہ کے ذکر اذکار عمدہ طریقے ہیں تیسرے اور چوتھے حصص میں تعلیم نسواں کے اعلیٰ مدارج پر زمانہ حال کے ضروریات کے مطابق روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ناول یا افسانہ کی روح رواں روح افزا بیگم (قصہ) ایک زبردست شخصیت ہے۔ چاروں حصص کی ضخامت چھ سو صفحے اور تقطیع ۲۲×۱۸/۸ ہے۔ قیمت بغیر جلد تین روپے۔ مجلد و مطلا عہ/۱۲۔

# راگ سکھشا

مصنفہ جناب خادم محی الدین صاحب ایم اے۔ ڈی ریڈرز پروفیسر گورنمنٹ کالج لائل پور مع پیشکش از رائے بہادر لالہ من موہن صاحب ایم اے۔ انسپکٹر مدارس لاہور ڈویژن۔ اس کتاب کے مصنف علم موسیقی اور اس فن کے سکھانے کی باریکیوں سے پورے پورے واقف ہیں اور یہ کتاب خاص طور پر تعلیمی حلقوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ راگ سکھشا استاد کے بغیر ہارمونیم اور راگ سیکھنے کے لئے بہترین کتاب ہے۔ جا بجا تصاویر دی گئی ہیں۔ ضخامت ۲۳۰ صفحے (بڑا سائز) ۳۰×۲۰/۸ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

# زندگی

مصنفہ چودھری افضل حق صاحب ایم۔ ایل۔ سی۔ حقوق العباد کی نگہداشت اور خدمت خلق مذہب کی موٹی تعلیم کا نہایت اہم جزو ہے لیکن جس قدر اہم ہے عام لوگ اس سے اتنے ہی غافل ہیں۔ قابل مصنف نے اس پہلو کو نہایت ہی دلچسپ اور دلفریب پیرایہ میں واضح کیا ہے تمام کتاب داستان کے پیرائے میں لکھی گئی ہے جس کے متعلق چودھری شہاب الدین پریذیڈنٹ پنجاب لیجسلیٹو کونسل لکھتے ہیں کہ اردو زبان میں آج تک ایسی دلچسپ اور مفید کتاب کبھی بھی لکھی نہیں گئی"

پنجاب گورنمنٹ کے افسران محکمہ تعلیم نے اس قدر پسند فرمایا کہ گورنمنٹ نے اس کی سات سو کاپیاں خرید کر پنجاب بھر میں مفت تقسیم کیں قیمت مجلد و مطلا ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

المشتہر

**محمد نصیر ہمایوں جنرل مینیجر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ۔ لاہور**

مشہور و مستند قدیمی دواخانہ یونانی دہلوی رجسٹرڈ بازار مچھی ہٹہ لاہور دار السلطنت پنجاب

میں یہ دواخانہ سنہ ۱۹۰۱ء سے نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کام کر رہا ہے بوجہ اپنی تازہ مفرد ادویہ اور پورے نسخوں کی باقاعدہ بنی ہوئی مرکب و مجرب دواؤں کے تمام ہندوستان میں مشہور ہے سات سو سے زائد اکسیری مرکبات ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ فہرست دواخانہ مع جنتری مفت منگوا کر ملاحظہ فرماویں۔ بیرونجات کے پارسلوں کی تعمیل فوراً کی جاتی ہے حکیم اور دکانداران صاحبان کے لئے خاص رعایت۔

تار کا پتہ:- یونانی مچھی ہٹہ لاہور۔

## رفیق حیات رجسٹرڈ

قائم شدہ سنہ ۱۹۰۱ء

بلا لحاظ موسم اور عمر ہر ایک مذہب کے لئے عورت مرد اور بچوں کے واسطے یکساں مفید امراض سینہ کے واسطے یہ شربت کیمیاوی طریقہ پر دیسی ادویات سے تیار کیا گیا ہے۔ کھانسی۔ تپ کہنہ۔ نزلہ۔ ذات الجنب۔ ذات الصدر۔ سل اور دق کے مریض اس سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ بدن میں تازہ خون پیدا کرتا ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ مقوی اعصاب ہے۔ کمزور مریضوں کو از حد طاقت دیتا ہے۔ طالب علم اور دماغی کام کرنیوالے اصحاب اس سے فائدہ اٹھائیں۔ قیمت فی شیشی ۸ اونس۔ ۸ خوراک ایک روپیہ ؍عہ، علاوہ محصول وغیرہ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوتا ہے۔

## قدیمی دواخانہ یونانی دہلوی رجسٹرڈ بازار مچھی ہٹہ لاہور

---

# سرکار ہند

## ڈاکخانہ کے کیش سرٹیفکیٹ

۷/۸ روپے کے عوض پانچ سال میں دس روپیہ

تقریباً چار فی صدی سود در سود اس پر انکم ٹیکس معاف

جب چاہو اپنا روپیہ واپس لے لو۔ ایک سال کے بعد لینے پر سود بھی ملے گا۔ ایک نام پر دس ہزار روپے تک جمع کئے جا سکتے ہیں کیش سرٹیفکیٹ خریدنا ہر حیثیت سے روپیہ بچانے کا بہترین طریقہ ہے پہلے جاری کئے ہوئے سارٹیفکیٹ جن کی میعاد یکم جون سنہ ۱۹۲۳ء یا اسکے بعد ختم ہوتی ہے مزید پانچ سال کیلئے جاری کرائے جا سکتے ہیں۔ دس روپیہ کے کیش سرٹیفکیٹ پر اس مزید پانچ سال کے عرصہ کے ختم ہونے پر بارہ روپے چار آنے واجب الادا ہونگے مزید تفصیلات کسی ڈاکخانہ سے دریافت کریں

ہندوستانی بچوں اور بچیوں کیلئے ہفتہ وار باتصویر

# اخبار پریم لاہور

جس کا سرورق سہ رنگہ ۔ ہر نمبر میں آرٹ بلاک کی ایک تصویر اور چوبیس صفحات ہوتے ہیں

**پروفیسر تاجور اور چرنجی لال ماتھر ایم اے دہلوی کی ایڈیٹری میں شائع ہو رہا ہے**

دہلی کی ٹکسالی زبان میں بچوں کے لئے علمی، اخلاقی، تاریخی، سائنٹفک باتصویر کہانیاں اور مضامین پریم کے ہر نمبر میں شائع کئے جاتے ہیں۔

## اخبار پریم کے ذریعہ

ہندوستانی بچوں کو ہر مذہبی پیشوا کی عزت کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

### اخبار پریم کو

ہندوستان کے محکمہائے تعلیم سرکاری طور پر خریدتے ہیں۔ تمام محکمہائے تعلیم میں منظور شدہ ہے

## پریم کے متعلق چند رائیں

**اخبار ٹریبیون۔** امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کے فرقہ وارانہ مضامین سے پاک بچوں میں اخوت و ہمدردی کے پاکیزہ ترین جذبات پیدا کرتا ہے

**ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔** ہندو مسلم بچوں کے دل میں ابتدائے عمر ہی سے اتحاد و الفت کا بیج بوتا ہے۔

**خواجہ حسن نظامی دہلوی۔** بچے اور عورتیں اسے نہایت شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کے آنے کی راہ دیکھا کرتے ہیں۔

**خان بہادر میر ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام دہلی۔** اس کے مضامین کی خوبی لاجواب ہے بچے تو بچے اس کے مضامین پڑھکر بوڑھے اور جوان بھی خوش ہوتے ہیں

**خان بہادر شیخ نور الٰہی ایم اے اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم:۔** رسالہ پریم ہندوستانی بچوں کے لئے بہت مفید، دلچسپ اور کارآمد ہے۔

**سالانہ چندہ چھ روپے ششماہی ساڑھے تین روپے محصولڈاک ۴ر نمونہ مفت**

## دفتر اخبار "پریم" لاہور

**ہمالیہ کے کنارے پیدا ہونیوالی دریائی میں اُگنے والی** دوسری جگہوں پر ملنے والی عمدہ عمدہ جڑی بوٹیوں کو محنت مشقت سے اکٹھا کر کے زندگی افزا ادویہ تیار کرنیوالے مشہور عالم آتنک نگرہ دواخانہ کی ادویہ آتنک نگرہ گولیاں تمام دنیا جانتی ہے خون وغیرہ کی جملہ خرابیوں ورکمی کو دور کر کے حیرت [illegible] پہنچے والی دوا ہے **قیمت** فی ڈبیہ ۲۲ گولیاں ایک روپیہ

**بال منز گولیاں** بچوں کی جملہ بیماریوں اور کمزوریوں کو دور کر کے طاقتور بناتی ہیں۔ اور ماں سے بھی زیادہ پرورش کرتی ہے

**آیوش اور ارو گیہ ہک تیل** یہ خوشبودار تیل بالوں کو ملائم کرتا اور بڑھاتا ہے۔ دماغ کو قوت دیتا جسم کو مضبوط بناتا ہے دماغی کام کرنے والوں کو ضرور ایک شیشی اپنے پاس رکھنی چاہیئے۔ **قیمت** ۱۲/

**ہیضہ کی گولیاں**: چند گھنٹوں میں جان لینے والے ہیضہ جیسی موذی مرض کو تھوڑی دیر میں دور کر کے مکمل شفا بخشتی ہے **قیمت** ۱۲ گولیاں ۱۲/

**کرن تیل**: کان کے سخت درد پیپ نکلنا کم سنائی دینا بہرہ پن وغیرہ چند ہی دنوں میں دور کرتا ہے۔ **قیمت** فی شیشی ۲ تولہ (۱۲/

**ورن مردن مرہم**: ہر قسم کے زخم خارش گہرے سے گہرے زخم زہر باد وغیرہ کو چند روز میں دور کرتا ہے **قیمت** فی ڈبیہ ۲ تولہ (۱۲/

**نیتر انند بدار سو گئی**: آنکھ کا پھولا سرخی جالا پانی نکلنا تمام شکائتیں دور ہو جاتی ہیں **قیمت** فی عدد ایک روپیہ

**آتنک نگرہ فارمیسی جام نگر کاٹھیاواڑ**

**فالٹیلک گائڈ**

اگر آپ ڈاک خانہ کے استعمال شدہ ٹکٹوں کی تجارت کے راز سیکھنا چاہتے ہیں۔ یا اپنے جمع شدہ ٹکٹوں کو معقول معاوضہ میں فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ یا اپنے وقت فرصت میں اس ہوبی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

**تو**

آج ہی کتاب فالٹیلک گائڈ کیلئے آرڈر لکھ دیں۔ بیکار آدمی کے لئے ایک روزگار ہے۔ امیر آدمی کیلئے دلچسپی کا سامان ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنہ ۸/ رجسٹری بذریعہ منی آرڈر محصول ڈاک معاف

**جی۔ ایم۔ ملک اینڈ کو۔ جالندھر شہر**
(H. L.)

**حُسنِ خیال**

حضرت خانبہادر رضا علی وحشت کے ممتاز شاگرد، اور پنجاب کے مشہور شاعر و ادیب حضرت ظفر ہاشمی کی لبریز روحانی نغمات کا مجموعہ جو تصوف سے لبریز اور جسکی پاکیزہ خیالی تمام دنیائے ادب میں مشہور ہے۔ کتابی صورت میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے، ذوق سلیم رکھنے والوں کیلئے ایک نادر تحفہ ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ بہترین، دو سو صفحات شروع میں مصنف کی تصویر زیب کتاب ہے۔ **ملنے کا پتہ**

قیمت مجلد ۱۲/ **مفتی سمیع اللہ تاجر کتب کوئٹہ** غیر مجلد ۸/
خود مصنف اسسٹنٹ رائل اسکاٹ کوئٹہ ۱۲/

مفت

بڑھیا عطر کی ایک شیشی ہر گھڑی کے ساتھ مفت

تحفہ تحفہ

# عید مبارک

عید مبارک کی خوشی میں ہم نے مندرجہ ذیل گھڑیوں کی قیمتوں میں خاص رعایت کردی ہے۔ اس لئے آپ بھی اس خاص رعایت سے فائدہ اٹھائیں۔

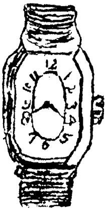

## تحفہ عید

یہ سنہری رسٹ واچ نہایت نئی طرز کی چمکدار دلفریب ڈائیل دیکھنے میں سو روپے کی گھڑی کو مات کرنے والی۔ ٹائم بالکل صحیح پرزے مضبوط۔

گارنٹی ۵ سال قیمت معہ سنہری چین صرف پانچ روپے۔ 5/-/-

## پیٹنٹ لیور رسٹ واچ

یہ کم خرچ بالانشین گھڑی جو کہ پرزوں کی مضبوط اور ٹائم گارنٹی ۵ سال قیمت تین روپے آٹھ آنہ (3/8) معہ چین۔

## پاکٹ واچ

چال کی لیور کبھی نہ ٹوٹنے والا شیشہ اور کبھی نہ خراب ہونے والی مضبوط مشین بالکل ٹھیک ٹائم گارنٹی ۵ سال قیمت عہ؍ ہمراہ چین مفت۔

دیگر ہر قسم کی گھڑیوں کے لئے مفصل فہرست طلب فرمائیں۔

پتہ

**دہلی واچ کمپنی پوسٹ بکس ۵۵ دہلی**

طب اور حفظان صحت کا بہترین ماہوار مصور رسالہ

# مشیر الاطباء

جو طبیب اور غیر طبیب کیلئے یکساں مفید ہے

رئیس الاطباء زبدۃ الحکما جناب حکیم محمد حسن صاحب قرشی
پرنسپل طبیہ کالج لاہور کی ادارت میں

عرصہ بارہ سال سے نہایت پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس میں تاریخ طب، اطباء، تشریح و منافع الاعضاء، تشخیص اور علاج الامراض، حفظان صحت اور حفظ ماتقدم، نیز ادویہ اور عقاقیر وغیرہ کے متعلق محققانہ اور بیش قیمت مضامین درج ہوتے ہیں۔ درازیٔ عمر، اعادۂ شباب، برتھ کنٹرول وغیرہ پر بھی بہترین اور مفید علمی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ مجربات کے ماتحت نامی گرامی اطباء کے بہترین مجربات شائع ہوتے ہیں۔ جدید ڈاکٹری تحقیقات اور طبی انکشافات بھی درج کئے جاتے ہیں۔ دلچسپ عکسی تصویروں سے بھی رسالے کو مزین کیا جاتا ہے۔ لکھائی چھپائی بہترین۔ کاغذ عمدہ سائز ۲۰×۳۰/۸ سرورق رنگین آرٹ پیپر کا باتصویر۔ حجم ۵۰ صفحات۔ چندہ سالانہ صرف ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ؍) نمونہ مفت طلب کریں۔

---

طب قدیم کے مجربات کا معتمد مجموعہ

# طبی فارماکوپیا

اس کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ تیسرا قریب الختم ہے۔ یہ مجربات کا بے بہا خزانہ ہے جس میں قلیل المقدار نہایت زود اثر دوائیں درج ہیں۔ نیز ہندوستان، یورپ اور امریکہ کے وہ نادر اکسیری نسخے درج ہیں جن سے ہزاروں روپے کمائے گئے مثلاً امرت دھارا، زمبک، طلاء بے نظیر، روح جیون بوٹی، مارالذہب، زود جام عشق وغیرہ قیمت مجلد سنہری ہر دو جلد عہ؍ فی جلد سے؍

**ناظم دفتر مشیر الاطباء چشمۂ زندگی فلیمنگ روڈ۔ لاہور**

# علم و عمل کا سالگرہ نمبر!

## ۲۲ دسمبر کو شائع ہوجائیگا

جو اپنی شان کا واحد اور لاثانی نمبر ہوگا۔ جاذب نظر تصاویر زندگی بخش مضامین دلآویز افسانوں اور بلند پایہ نظموں کا دلچسپ و دلفریب مرقع ہوگا۔ ہندوستان بھر کے معاشرتی، طبی، اصلاحی اہل قلم کے ارشادات گرامی کا آئینہ ہوگا۔ کوشش کیجا رہی ہے۔ کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ ضخیم اور نفیس مجموعہ ایسا ہوگا۔ کہ تمام عمر اپنے پاس اسے سنبھال رکھنے اور اس کے جان بخش ارشادات سے فیضیاب ہوتے رہنے کے آپ متمنی رہیں گے **قیمت**۔ کل بارہ آنے (۱۲) جو ضخامت اور خوبی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اگر آپ سے بالکل مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایک سال کیلئے "علم و عمل" کی خریداری قبول فرمالیجئے سال بھر کا چندہ کل ۶ روپے (عہ) ہے۔

**مینیجر علم و عمل لاہور**

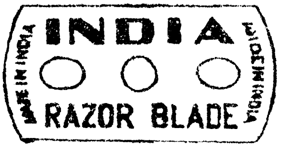

# ہمیشہ استعمال کریں

ہندوستان کا تیار کردہ "**انڈیا**" سیفٹی ریزر بلیڈ

# انڈین سٹیل انڈسٹریز۔ کرشنا نگر۔ لاہور

ایجنسی کے لئے خط و کتابت کریں

# مفتاح العلوم شرح مثنوی مولانا رومؒ

کی

## دس خاص خوبیاں

مثنوی مولانا رومؒ کی آج تک سینکڑوں شرحیں شائع ہو چکی ہیں لیکن اردو زبان میں مندرجہ بالا نام کی شرح **قریشی بک ڈپو** لاہور نے شائع کی ہے۔ اس کے متعلق قوم کے ممتاز اور مشہور لیڈروں، نامور عالموں، جلیل القدر صوفیوں، تمام مشہور اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے اہل علم اصحاب نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ شرح فی الحقیقت قدیم و جدید کی تمام شرحوں سے بہتر اور آسان اور مفصل ہے۔ اس کے متعلق زیادہ تفصیل سے خوبیاں لکھنے کی گنجائش نہیں صرف چند خاص خوبیاں درج کی جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے آپ کو اس شرح کے متعلق معلوم ہو جائیگا کہ یہ شرح کس پایہ کی ہے۔ اور کس محنت اور عرقریزی سے لکھی گئی ہے۔

(۱) مثنوی کا اصل شعر جلی قلم سے بعض بعض اعراب دیکر لکھا گیا ہے۔

(۲) شعر کے بعد مشکل الفاظ کی لغات جس میں اس لفظ کا ترجمہ اور ماخذ بیان کیا گیا ہے۔

(۳) شعر کی صرفی نحوی ترکیب جو طلبا کے لئے نہایت مفید ہے درج ہے

(۴) ترجمہ سلیس اردو ایسی طرز سے کیا گیا ہے کہ جو تحت اللفظی بھی ہے

(۵) ترجمہ کے بعد شعر کا مفصل مطلب نہایت تحقیق سے درج ہے

(۶) مطالب کو زیادہ تفصیل بیان کرنے کے لئے قرآن حدیث و اقوال اکابر کے حوالہ دیئے گئے ہیں

(۷) مثنوی کے شعر سے ملتے جلتے دیگر شعرائے قدیم و جدید کے پھڑکتے ہوئے اشعار بھی ساتھ ساتھ درج ہیں۔

(۸) شروع میں ایک ایسی مفصل فہرست دی گئی ہے کہ جس کے مطالعہ سے ہر مضمون کا شعر بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

(۹) مثنوی شریف کے بعض اشعار پر جو کم فہم اعتراض کیا کرتے ہیں ان کا جواب اور شعر کا اصل مفہوم بھی درج کیا گیا ہے۔

(۱۰) لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ اعلیٰ اور بے نظیر ہے۔

قیمت حصہ اول بلا جلد عہ ۸ر حصہ دوم بلا جلد عہ ۸ر حصہ سوم بلا جلد عہ ۸ر حصہ چہارم بلا جلد عہ ۸ر حصہ پنجم بلا جلد عہ ۸ر حصہ ششم بلا جلد عہ ۸ر حصہ ہفتم بلا جلد عہ ۸ر۔

**مجلد** جس پر سنہری حروف میں کتاب کا نام درج ہے فی حصہ سوا تین روپے۔ نیز دو دو حصے یکجا مجلد فی جلد چھ روپے علاوہ محصولڈاک۔

**نوٹ**:۔ ساتوں حصے اکٹھے خریدنے پر ۲ر فی روپیہ کمیشن دیا جائے گا۔ بشرطیکہ رسالہ ہذا کا حوالہ دیا جائے۔

وعدہ پسند نہ آنے کی صورت میں قیمت بلا عذر واپس کر دی جائے گی۔ دیگر ہر قسم کی کتابوں کے لئے فہرست مع جنتری سنہ ۱۹۳۴ء مفت ملتی ہے۔

پتہ ملنے کا } **مینجر قریشی بک ڈپو کشمیری بازار (۵) لاہور**

# تاجدارِ دکن خلد اللہ ملکہ

جس کو شرفِ قبول ہمایونی بخشیں

اور

## علامہ سر محمد اقبال مدظلہ العالی

جس کا تعارف نامہ لکھنا منظور فرمائیں

## وہ یقیناً بے نظیر اور قابلِ دید کتاب ہوگی

اس کا پہلا اڈیشن ایک سو دس روپے فی جلد تین ماہ کی قلیل مدت میں فروخت ہوگیا دوسرا اڈیشن سترہ روپے فی جلد ہاتھوں ہاتھ نکل گیا اب تیسرے اڈیشن کی قیمت بارہ روپے فی جلد مقرر کی گئی ہے؛

ہندوستان اس سے پیشتر کوئی ایسی شاندار کتاب شائع نہیں کر سکا

پرکیف شاعری وجد آور مصوری دیدہ زیب کتابت باصرہ نواز سنہری جلد

اردو زبان کی پہلی اور آخری کتاب ہے جس پر نصف لاکھ سے زاید روپیہ پانی کی طرح بہا کر ماہرین فن طباعت کے زیر اہتمام شائع کی گئی ہے۔ الفاظ اسکی خوبیوں کے اظہار سے قاصر ہیں یہ چیز صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے

# مرقعِ چغتائی،

یا

## دیوانِ غالب مصور

کا خریدنا حسنِ مذاق کی دلیل اور اس کا پاس رکھنا صحیح ادبی ذوق کا اظہار ہے

حجم تین سو صفحات سے زاید بڑی تقطیع چھتیس رنگین تصاویر جنکے بلاک یورپ کے بہترین کارخانوں میں بنے ہیں آج ہی فرمایش بھیجیے

قیمت فی جلد بارہ روپے ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

دنیائے اسلام میں ایک قابل قدر تالیف کا اضافہ
جس پر تمام متقدر اسلامی اخبارات نے شاندار ریویو کئے
یعنی
تاریخ اسلام مکمل
پانچ جلدوں میں
(مؤلفہ عبد الرحمن صاحب شوق امرتسری)

جس میں دیگر مطبوعہ تواریخ اسلام کے بالمقابل چند خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

(۱) یہ تاریخ اسلام سلیس اور عام فہم فصیح اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔

(۲) یہ تاریخ اسلام سنہ ہجری سے ایک صدی قبل یعنی سنہ ۴۶۹ء سے ۱۹۲۶ء تک چودہ سو ستاون سال کی مکمل اسلامی تاریخ ہے۔

(۳) یہ تاریخ اسلام جنگ نامہ نہیں ہے بلکہ سلف کے مسلمانوں کی مذہبی تمدنی معاشرتی مستند تاریخ ہے

(۴) یہ تاریخ اسلام مذہب اسلام کی مقدس تعلیم اور دینی اور دنیاوی دستور العمل پر مبنی ہے۔

(۵) یہ تاریخ اسلام مستند تاریخی حالات کی لکھی گئی ہے شنیدہ یا غلط العام واقعات اس میں نہیں ہیں۔

(۶) یہ تاریخ اسلام سنین ماضیہ کے بالترتیب واقعات کے مطابق ترتیب دی گئی ہے یعنی اس میں تمام واقعات خواہ بلاد عرب میں ظہور پذیر ہوئے ہوں یا بلاد ہند میں بہ ترتیب سنین کے ماتحت لکھے گئے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آج تک ان خصوصیات کے مطابق کوئی ایسی ترتیب تاریخ اسلام طبع نہیں ہوئی باوجود اس تکمیل کے ۵ جلدوں کی قیمت صرف تین روپے رکھی گئی ہے تاکہ ہر خاص و عام مسلمان اس سے مستفید ہو سکیں۔

قیمت پانچ جلدیں مجلد سنہری صرف تین روپے۔ اس پتہ سے طلب کریں۔

ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

دنیائے اسلام کے دو نامور مشاہیر علماء کرام
کی
دو معرکۃ الآرا کتابیں
یعنی
حضرت شاہ عبد القادر صاحب رضا محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
کی مؤلفہ
تفسیر موضح القرآن

دنیائے اسلام میں حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی محتاج تعارف نہیں۔ یہ آپ کی وہ بے بہا عالمانہ تالیف ہے جس کی مدد کے بغیر نہ کوئی تفسیر القرآن تیار ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے لہذا بحیثیت مسلمان ہونے کے اگر آپ کلام الٰہی کے معانی اور آیات ربانی کا شان نزول و دیگر احکام الٰہی کی تشریح و توضیح سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو یہ تفسیر موضح القرآن منگا کر مطالعہ فرمائیں جو نہایت معتبر اردو مدلل ترجمۃ القرآن کی عام فہم اور مستند مقبول عام تفسیر ہے اور نہایت اعلیٰ ولایتی چکنے کاغذ پر نہایت اعلیٰ خوشخط صحیح اور صاف طبع ہوئی ہے قیمت تین روپے آٹھ آنے (۳؍۸)

حجۃ الاسلام علامہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ
کی مصنفہ
کیمیائے سعادت اردو

اگر آپ فلسفہ اسلام کو اپنے عقلی دلائل اور موجودہ سائنس کے نکتہ ادراک کے مطابق سمجھنا چاہتے ہیں، اگر آپ حسیات نفس، روح، فلسفہ عذاب، قبر، حشر و نشر، جزا و سزا، بہشت و دوزخ وغیرہ کے مسائل سے یقین حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو علامہ موصوف کی یہ عالمانہ تصنیف مطالعہ فرمائیں جو کہ عربی، انگریزی، فارسی میں طبع ہو چکی ہے۔ مگر اب ہم نے اردو ترجمہ کرا کے اسے شائع کیا ہے۔ قیمت صرف دو روپے بارہ آنے (۲؍۱۲)

پتہ ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

# پنڈت ٹھاکر دت شرما بید "موجد امرت دھارا" کی چند دیگر ادویات جو کہ ہزارہا انسانوں کو نفع پہنچا چکی ہیں

ادویات کی سریع التاثیری کے بھروسہ پر ہر دوائی کا نمونہ بھی بنا کر رکھا ہے

**بال سکھا** بچوں کی امراض بدہضمی دست کھانسی بخار وغیرہ کے واسطے بےنظیر دوائی ہے قیمت ایک روپیہ (عصہ) نمونہ ۱ر

**سارسا رشٹ مرکب** یہ دوائی خون صاف کرکے جسم کو کندن کی طرح کر دیتی ہے قیمت عـہ دو روپیہ

**دوائی بواسیر** خونی بادی ہر قسم کی بواسیر کیواسطے بےنظیر ہے سالوں کی بیماری دنوں میں دور قیمت دو روپے نمونہ ۴ر

**دوائی تلی نمبر ۲** تاپ تلی کے واسطے بے نظیر دوائی ہے ہاضمہ کو تیز کرتی ہے قیمت دو روپے (عہ) نمونہ ۴ر

**کرکول** ہاضمہ کی بےنظیر دوائی ہے بھوک بڑھاتی ہے اور معدے کی تمام تکلیف دور کرتی ہے قیمت ۶۰ گولی دو روپے ۳۰ گولی عہ نمونہ ۴ر

**وت ویرچن** جلاب کے واسطے بے نظیر ہے جیسے جلاب لینے سے دست اچھی طرح ہو جاتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ نمونہ ۳ر

**آرام جان** جن کو قبض دائمی رہتی ہے۔ وہ اسکو کھایا کریں آہستہ آہستہ بیماری دور ہو جائیگی قیمت ۳۲ گولی ایک روپیہ ۱۶ گولی ۸ر

**کرن تیل** کان کی امراض مثل درد پیپ زخم کانوں میں شائیں شائیں وغیرہ آوازیں آنا یا کم دینا کو بھی نافع ہے قیمت ۲ ڈرام ایک روپیہ (عصہ) نمونہ چار آنے (۴ر)

**اکسیر بدن** گلے اور چھاتی کی کل امراض کھانسی دمہ ہر قسم گلے پڑنا وغیرہ کو مفید ہے تپدق وسل کی کھانسی میں اور خون جلنے میں چند دنوں میں پورا اثر دکھاتی ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ نصف ۱۲ر

**کوکلا سر (مددگار آواز)** جن کو بولنے یا گانے کا کام رہتا ہے انکو یہ ہمیشہ پاس رکھنی چاہیئے۔ اس سے گلا نہیں بیٹھتا۔ بیٹھا ہوا کھل جاتا ہے اور چند دن لگاتار کھانے سے آواز سریلی ہو جاتی ہے۔ قیمت ۳۲ گولی دو روپے نمونہ ۸ گولی ۸ر

**گندھا رس** (رجسٹرڈ) سخت سے سخت اور پرانے سے پرانے اسہال پیچس سنگرہنی وغیرہ چند یوم میں کافور۔ اکثر ایک ہی سے درست پیچس وغیرہ کو آرام آتا ہے ہیضہ کے دست و قے کو بھی نافع ہے قیمت فی تولہ ایک روپیہ نمونہ ۲ر

**عرق بخار** (رجسٹرڈ) موسمی بخار ملیریا ہر قسم روزانہ تیسرے چوتھے وغیرہ سب اس کی ایک شیشی کے تین دن کھانے سے قطعی دور ہو جاتے خوراک تین یوم صرف ۸ر

**درد شکن** (رجسٹرڈ) اس دوائی کی ایک ہی پڑیا کھانے سے پانچ منٹ کے اندر چاہے کسی قسم کا درد ہو آنکھ دانت ناک کان کمر جوڑ وغیرہ کسی جگہ درد ہو جاتا رہتا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ نمونہ ۴ر

**بلا دور** ان گولیوں سے افیون کی عادت چھوٹ جاتی ہے سینکڑوں چھوڑ چکے ہیں قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ

**اکھ روشن** آنکھوں کی تمام امراض دھند جالا پانی خارش وغیرہ کو اکسیر ہے قیمت فی تولہ ۱۲ر نمونہ ۱ر

**اُبٹن رچت موہنی** (رجسٹرڈ) چہرے کے بدنما داغ کیل چھائیاں وغیرہ کو دور کرتا ہے قیمت فی شیشی عہ نمونہ ۴ر

**دل سندری (رجسٹرڈ) حسن افزا** یہ تیل ہے جو چہرہ کو چمکاتا ہے اور داغ کیل وغیرہ کو دور کرتا ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عصہ) نمونہ چار آنے ۴ر

**بال اڑانے کی بے نظیر دوائی** اس دوائی کو پانی میں گھول کر لگانے سے ایک منٹ کے اندر سخت سے سخت اور نرم سے نرم جگہ کے بال بصفائی کمال جڑ سے دور ہوتے ہیں قیمت فی ڈبیہ ۲ر

**منجن ہرا** دانتوں کی امراض مثل خون جانا پانی نکلنا درد دنداں بدبو کو نافع ہے قیمت صرف ۴ر نمونہ ۱ر

۱۸۱

## پتہ و خط و کتابت و تار کیلئے اتنا پتہ کافی ہے امرت دھارا لاہور۔ امرت دھارا بھون

امرت دھارا سڑک

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۲۳ - لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا +

# قواعد

۱- "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے +

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کیے جاتے ہیں +

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے +

۴- ناپسندیدہ مضمون ایک کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے +

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے +

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے +

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا +

۸- جواب طلب امور کے لیے ایک کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے +

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸ر +

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے +

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھیے +

**منیجر رسالہ ہمایوں**

۲۳- لارنس روڈ- لاہور

Title and Picture Printed at the Halftone Press, Lahore.